فقہائے ہند

جلد چہارم ۔ حصّہ اوّل

گیارھویں صدی ہجری

محمدّ اسحاق بھٹی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ، لاہور

فقہائے ہند

جلد چہارم - حصہ اول

گیارھویں صدی ہجری

محمد اسحاق بھٹی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲ - کلب روڈ، لاہور

بار اوّل ۱۹۷۷

تعداد ۱۱۰۰

مطبع .. .. معارف پریس

ناشر .. .. محمد اشرف ڈار (اعزازی سکریٹری)
ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

فہرست مضامین

ث

ج

ح

س

ش

ص

ض

ط

ع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مقدمہ

اللہ تعالیٰ کے فضلِ خاص اور اس کی نصرتِ کاملہ سے سلسلۂ فقہائے ہند کی چوتھی جلد کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اس جلد میں اپنے محدود علم کے مطابق برِصغیر پاک و ہند کے گیارھویں صدی ہجری کے علما و فقہا کے حالات و سوانح بیان کیے گئے ہیں۔ گیارھویں صدی کا زمانہ علمی اعتبار سے برِصغیر کا زرخیز زمانہ ہے۔ اس زمانے میں برِصغیر کے مختلف بلاد و امصار میں اہلِ علم کی بوقلموں خدماتِ علمی کا دائرہ دور دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے، جس کو ایک جلد میں سمیٹنا مشکل تھا۔ لہٰذا اس جلد کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ حصہ اول اور حصۂ دوم۔!

حصہ اوّل جو معزز قارئین کے پیشِ نگاہ ہے، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات تک ہے۔ اور ایک سو چھبیس (۱۲۶) علما و فقہا کے علمی، فقہی، تدریسی، تصنیفی کارناموں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ حصہ دوم کا آغاز انشاءاللہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے حالات سے ہو گا۔

دسویں صدی ہجری کا نصف آخر اور گیارھویں صدی کا دور ہندوستان میں مغل حکومت کے عروج کا دَور ہے۔ اس دَور میں یکے بعد دیگرے دودمانِ مغلیہ کے تین نامور حکمران تختِ ہند پر متمکن ہوئے۔ جلال الدین محمد اکبر، نورالدین سلیم جہانگیر اور شہاب الدین خرم شاہ جہان!

جلال الدین اکبر کے دورِ کے بہت سے علما و فقہا کا تذکرہ "فقہائے ہند" کی جلد سوم میں بھی مرقوم ہے اور جلد چہارم میں بھی۔! لیکن خود اکبر کی وفات چونکہ گیارھویں صدی کے اوائل (۱۰۱۴ھ) میں ہوئی، لہٰذا اس کے وہ حالات، جو

ہمارے موضوع سے متعلق ہیں، زیرِ مطالعہ کتاب کے حصۂ اوّل میں تحریر کیے جا رہے ہیں۔ جہاں گیر اور شاہ جہان کے بارے میں، ہمارے دائرۂ موضوع سے مناسبت رکھنے والے واقعات حصۂ سوم میں ضبطِ تحریر میں لائے جائیں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔

جلال الدین اکبر

فقہائے ہند کی جلد سوم کے مقدمے میں ہندوستان کی مغل حکومت کے معمارِ اوّل ظہیر الدین بابر اور اس کے بیٹے نصیر الدین ہمایوں کے علمی و دینی پہلو قارئین کے مطالعہ میں آچکے ہیں اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ علمائے وقت کے ساتھ ان کے تعلقات کی کیا نوعیت تھی اور فقہائے عصر سے وہ کس درجہ مودّت و موانست کا برتاؤ کرتے تھے ۔۔۔ اب فقہائے ہند کی جلد چہارم کے حصۂ اوّل کے مقدمے میں اختصار کے ساتھ اس امر کی وضاحت کرنا مقصود ہے کہ بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر کے عہدِ حکومت کے لیل و نہار کس قسم کے تھے اور اس میں اہلِ علم کو کیا حیثیت حاصل تھی۔ نیز دینی و مذہبی اعتبار سے دورِ اکبری کن کیفیات کا عکاس اور کن رجحانات کا آئینہ دار تھا۔

ولادت

اکبر کی ولادت اتوار کے روز ۵ ربیع الاوّل ۹۴۹ھ کو علاقہ سندھ میں عمرکوٹ کے مقام پر حمیدہ بانو کے بطن سے ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس کا باپ ہمایوں، شیر شاہ سوری کے حملے اور بھائیوں کی بے وفائی کی وجہ سے سخت پریشان کن حالات میں گھرا ہوا تھا اور اپنے چند وفادار ساتھیوں کی معیّت میں ہندوستان کو خیرباد کہہ کر سندھ کے راستے قندھار جا رہا تھا۔ جب وہ عمرکوٹ سے کوچ کر کے جول کے مقام پر پہنچا تو نومولود بیٹے کو اپنے پاس بلوایا اور اسے دیکھ کر خوش ہوا۔

ہمایوں کے لیے یہ انتہائی مصیبت کے دن تھے۔ تا حدِّ نگاہ لق و دق صحرا، دور تک نہ کہیں درخت نہ سایہ، پانی کی قلت، کھانے کی تکلیف، سندھ کے راجوں اور حکمرانوں سے ہر آن حملے کا خطرہ، سواری کے لیے اونٹ اور گھوڑوں کی کمی، یہ سفر نہایت

صبر آزما تھا اور ہمایوں کے مختصر لشکر میں سخت انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ لوگ لشکر سے کنارہ کشی اختیار کرتے جا رہے تھے، منعم خاں بھی، جو ہمایوں کا معتمد علیہ سردار تھا، ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ البتہ بیرم خاں جو اُن دنوں گجرات میں مقیم تھا، لشکرِ ہمایوں میں آکر شامل ہوا۔ اس زمانے میں مرزا شاہ حسین سندھ کا بادشاہ تھا، اُسے ہمایوں سے خطرہ تھا اور ہمایوں اس سے خوف زدہ تھا۔ ہمایوں نے اس سے سفر کے لیے کچھ کشتیاں اور اونٹ مانگے، اس نے وہاں سے ہمایوں کے چلا جانے کو غنیمت جانا اور فوراً تیس کشتیوں اور تین سو اونٹوں کا انتظام کر دیا۔ اب ہمایوں دریائے سندھ عبور کر کے حدودِ ہند سے باہر نکل گیا۔

نوع بنوع مصائب برابر ہمایوں کے تعاقب میں لگے ہوئے تھے اور سامنے مہیب مشکلات مُنہ پھاڑے کھڑی تھیں۔ اب اس کا کاروانِ حیات ایک اور خطرناک موڑ میں داخل ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ اس زمانے میں ہمایوں کے بھائی مرزا کامران نے قندھار کا علاقہ مرزا ہندال سے چھین کر مرزا عسکری کے حوالے کر دیا تھا اور مرزا ہندال کو غزنی کی حکومت دے دی تھی۔ ہمایوں نے قندھار کا قصد کیا تو مرزا کامران نے شاہ حسین کی انگیخت پر مرزا عسکری کو خط لکھا کہ ہمایوں نے قندھار کا رُخ اختیار کر لیا ہے، جس طرح ممکن ہو، اسے گرفتار کر لیا جائے۔ چنانچہ جب ہمایوں اپنے رفقا کے ہمراہ شال شانگ کے مقام پر پہنچا تو مرزا عسکری نے اس کا راستہ روکنے کے لیے فوج کو حرکت دی اور چولی بہادر نامی ایک اوزبک کو ہمایوں کے لشکر کی مخبری پر مامور کیا۔ چولی بہادر بجائے ہمایوں کی مخبری کرنے اور مرزا عسکری کو اس کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے، نصف شب کو ہمایوں کے لشکر میں آیا، بیرم خاں سے ملا اور اس کو تمام حالات سے مطلع کیا۔ بیرم خاں نے اسی وقت شاہی سراپردہ کے پیچھے پہنچ کر سب باتیں ہمایوں کے گوش گزار کر دیں۔ ہمایوں نے اپنے آگے بھائیوں کی سازش کا وسیع جال بچھا ہوا دیکھا تو قدم روک لیے، کابل اور قندھار جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور صرف بائیس آدمیوں کو ساتھ لے کر، جن میں بیرم خاں اور خواجہ معظم بھی شامل تھے، عراق کا عزم کیا۔

بیرم خاں اور خواجہ معظم کو ہمایوں نے اپنی بیوی حمیدہ بانو جسے بادشاہ بیگم بھی کہا جاتا ہے اور بیٹے شاہزادہ اکبر کو لانے کی ہدایت کی۔ اس وقت ہمایوں کے پاس مناسب سواری کا انتظام بھی نہ تھا، مجبور ہو کر ایک مصاحب تردی بیگ کے آگے ہاتھ پھیلائے اور چند گھوڑے طلب کیے، مگر تردی بیگ نے اس نازک موقع پر سخت اذیت ناک رویہ اختیار کیا، گھوڑے دینے سے بھی انکار کر دیا اور ہمایوں کا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔

اکبر کی گرفتاری

شاہزادہ اکبر کی عمر اس وقت صرف ایک سال تھی۔ ان دنوں شدید گرمی پڑ رہی تھی اور راستے میں پانی میسر نہ آنے کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لیے ہمایوں نے شاہزادے کو اپنے ایک امیر کے سپرد کر کے لشکر گاہ میں چھوڑ دیا اور بیوی کو ہمراہ لے کر رخصت ہو گیا۔ ہمایوں کے عازم عراق ہوتے ہی مرزا عسکری نے حملہ کر کے اس کے لشکر کو لوٹ لیا اور بعض امرا کو گرفتار کر لیا۔ شاہزادہ اکبر کو بھی اپنے ساتھ قندھار لے گیا اور اسے اپنی بیوی سلطان بیگم کے سپرد کر دیا —— یہ واقعات جن کی بہت سی تفصیلات چھوڑ دی گئی ہیں، ۹۵۰ھ کو پیش آئے۔

اب ہمایوں نے سب طرف سے مایوس ہو کر شاہ طہماسپ کے دروازے پر دستک دی اور اس سے طالب امداد ہوا۔ طہماسپ کی مدد سے ہمایوں نے قندھار بھی فتح کر لیا اور ۱۰ر رمضان ۹۵۲ھ کو کابل پر بھی فتح حاصل کر لی۔ کابل کی فتح کے بعد اس نے اکبر کو بھائی کی گرفت سے آزاد کرایا اور اُسے دیکھ کر انتہائی مسرت کا اظہار کیا۔ اس اثنا میں ہمایوں کے بھائی اس سے معافی بھی مانگتے رہے اور ساتھ ہی بے وفائی بھی کرتے رہے، لیکن ہمایوں جو نرم خو اور حلیم الطبع حکمران تھا، بار بار فراخ دلی سے ان کی معذرت سنتا اور انھیں ہر مرتبہ معاف کرتا رہا۔

فتح کابل کے بعد ہمایوں نے تسخیر بدخشاں کے ارادے سے اپنے لشکر کو حرکت دی۔ وہاں سل[illegible]ان مرزا سے مقابلہ ہوا۔ سلیمان مرزا کچھ عرصہ تک لڑتا رہا، آخر شکست کھا کر [illegible]ا ہو گیا۔ لیکن اس اثنا میں ہمایوں پر ایک آفت یہ ٹوٹی کہ مرزا کامران نے کابل کو

خالی پاکر، اس پر فوج کشی کردی اور شہر پر قابض ہوگیا۔ ساتھ ہی ہمایوں کی خواتین اور شاہزادہ اکبر کو قید کرلیا۔

ہمایوں نے یہ خبر سنی تو نہایت پریشان ہوا۔ بدخشاں کی فتح کے بعد ہمایوں نے اس کی حکومت پہلے مرزا ہندال کو دے دی تھی، بعد میں اس سے لے کر دوبارہ مرزا سلیمان کے حوالے کر دی اور خود نہایت تیزی سے کابل کی طرف لوٹ گیا۔ مرزا کامران کو اس کی فوجی نقل وحرکت کا پتا چلا تو اس نے شہر سے باہر مورچہ قائم کرلیا۔ لڑائی کا بازار گرم ہوا اور کامران کو میدانِ جنگ میں بُری طرح ہزیمت اٹھانا پڑی، لیکن وہ بھاگنے کی بجائے پسپا ہو کر قلعۂ کابل میں محصور ہو گیا۔ باہر ہمایوں لشکر لیے بیٹھا تھا۔ سخت محاصرے کی وجہ سے مرزا کامران کے حالات انتہائی ابتر ہوگئے۔ اس دوران میں مرزا کامران نے بدرجہ غایت سنگ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کئی مرتبہ دو سال کے شاہزادہ اکبر کو قلعے کے اس کنگرے پر بٹھایا، جو توپوں، بندوقوں اور تیروں کی عین زد میں تھا۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ بیٹے کی جان کے خوف سے ہمایوں جنگ سے دست بردار ہو جائے۔ یہ منظر ہمایوں اور اس کی فوج کے لیے سخت تکلیف اور ذہنی اذیت کا باعث تھا۔ لیکن اکبر کی جان ہر بار سلامت رہی۔ بالآخر مقابلے کی تاب نہ لاکر کامران قلعے سے فرار ہو گیا اور شاہزادہ اکبر صحیح سلامت باپ کو دوبارہ مل گیا۔

سلسلہ واقعات کی متعدد کڑیاں حذف کر کے یہ تفصیل اس لیے بیان کی گئی ہے کہ اکبر کی زندگی کے ابتدائی حالات قارئین کے سامنے آسکیں اور وہ یہ معلوم کرسکیں کہ اقتدار کی ہوس اور حکومت کی حرص بسا اوقات انسانیت کا خاتمہ کر دیتی ہے اور اپنے پرائے میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہنے دیتی۔ نہ اسے خون کے رشتے کا کوئی پاس ہوتا ہے اور نہ چھوٹے پر رحم و شفقت کا کوئی احساس اس میں باقی رہتا ہے۔ ہمایوں کے ساتھ اس کے بھائیوں اور اکبر کے ساتھ اس کے چچاؤں نے جو کچھ کیا، وہ اس کی واضح مثال ہے۔

اکبر کی تخت نشینی

جلال الدین محمد اکبر باختلافِ روایات ۲ یا ۷ ربیع الثانی ۹۶۳ھ کو چودہ برس کی

عمر میں اپنے باپ نصیر الدین ہمایوں کی وفات کے بعد تخت ہند کا وارث بنا۔ ہمایوں ۷ ربیع الاوّل ۹۶۳ھ کو بالاخانے کی سیڑھیوں سے گرا تھا۔ ایک ہفتہ تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد ۱۵ ربیع الاوّل کو فوت ہوا۔ منتخب التواریخ میں ملّا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کی تاریخ تخت نشینی ۲ ربیع الاوّل تحریر کی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ نظام الدین ہروی نے طبقاتِ اکبری میں ایک جگہ ۲ ربیع الاوّل اور دوسری جگہ ۲ ربیع الثانی لکھی ہے۔ مآثر رحیمی میں ملّا عبدالباقی نہاوندی نے ۷ ربیع الثانی رقم کی ہے۔ ظاہر ہے، ۲ ربیع الاوّل تو کسی طرح قرینِ صحت نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ ہمایوں ۷ ربیع الاوّل کو سیڑھیوں سے گرا اور ۱۵ ربیع الاوّل کو فوت ہوا۔ اس صورت میں اس کے جانشین کی تاریخِ تخت نشینی ۲ ربیع الاوّل کیوں کر صحیح قرار پا سکتی ہے؟ یا تو یہ کتابت کی غلطی ہے یا مصنف سے سہو ہو گیا ہے۔

ہمایوں کی وفات کے وقت اکبر مشرقی پنجاب کے قصبہ کلانور میں مقیم تھا، وہیں خان خاناں بیرم خاں کے مشورے اور تائید سے اس نے ہندوستان کا تاجِ شاہی سر پر رکھا۔

اکبر کی زندگی کا آغاز ہی جدوجہد اور ہنگاموں کے ہجوم میں ہوا تھا۔ تخت نشینی کے بعد اس کو یہی صورتِ حال پیش آئی۔ مقابلے، محاربے اور جنگ و جدال اس کی زندگی کا ایک لازمی جزبن گئے تھے۔

پانی پت کی دوسری لڑائی

اکبر کی پہلی بڑی جنگ ہیموں بقال کے ساتھ پانی پت کے میدان میں ہوئی۔ ہیموں بقال یا ہیموں بنیا، عادل شاہ سوری کا وزیر اور سپہ سالار تھا، ریواڑی کا باشندہ تھا اور غرور و نخوت کی آخری حدوں تک پہنچ گیا تھا۔ وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ دہلی کی طرف یلغار کرتا ہوا بڑھا اور اس پر قابض ہو گیا۔ دہلی پر قبضے کے بعد اس نے بہت طاقت پیدا کر لی تھی اور اپنا خطاب بکرماجیت رکھ کر خود مختار حاکم بن بیٹھا تھا۔ اسلامی قوانین منسوخ کر دیے تھے اور انتہائی سرکش ہو گیا تھا۔ اکبر کو اس کی اطلاع پہنچی تو

اس نے فوج اور ضروری اسلحہ کے ساتھ دہلی کی طرف کوچ کیا۔ مقابلے کے لیے ہیموں بقال بھی دہلی سے روانہ ہوا اور پندرہ سو جنگی ہاتھیوں، توپ خانے، بہت بڑی فوج اور کثیر حربی ساز و سامان کے ساتھ پانی پت کے قریب آکر پڑاؤ کیا۔ تزک جہاں گیری کی روایت کے مطابق ۲ محرم ۹۶۴ھ کو اور منتخب التواریخ کی رُو سے ۱۰ محرم ۹۶۴ھ کو جمعہ کے روز دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر اُتریں۔ خود اکبر شاہی لشکر کے ساتھ تھا اور میدانِ جنگ سے تین کوس کے فاصلے پر مقیم تھا، وہاں سے وہ جنگ کی نگرانی کر رہا تھا اور فوج کو برابر کمک بھیج رہا تھا۔ تزکِ جہاں گیری کی روایت کے مطابق اس لڑائی میں ہیموں کے سواروں کی تعداد تیس ہزار اور اکبر کے لشکر کی تعداد چار یا پانچ ہزار تھی۔ جنگ میں ہیموں کی فوج کو شکست ہوئی، اس کے ہزاروں فوجی مارے گئے، خود ہیموں کو زخمی حالت میں جب کہ اس پر بے ہوشی طاری تھی، اکبر کے پاس لایا گیا۔ بعض امرا نے اکبر سے عرض کیا کہ یہ حضور کا پہلا جہاد ہے۔ اس کافر پر اپنی تلوار کی دھاک آزمائیں۔ اکبر نے جو بڑے دل گردے کا مالک اور بہت متحمل مزاج بادشاہ تھا، جواب دیا:

این را کہ حالا حکم مردہ دارد چہ بزنم، اگر در حس و حرکتے می بود تیغ آزمائی می کردم۔[۱]

اس پر موت کی کیفیت طاری ہے، اسے کیا قتل کروں، اگر اس میں کچھ جان ہوتی تو تیغ آزمائی کرتا۔

اس سے قبل اکبر کی تخت نشینی کے وقت بھی، جب دربار شاہی کے ایک امیر ابوالمعالی نے، تاج پوشی کی تقریب میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا، ایک شخص نے اس کو پکڑ کر جان سے مارنے کی کوشش کی تھی، مگر اکبر نے یہ کہہ کر اس کی جان بچائی کہ:

در اوّل جلوس حیف باشد خون بے گناہے ریختن[۲]

تخت حکومت پر بیٹھنے کے پہلے ہی روز کسی بے گناہ کو قتل کر دینا افسوسناک بات ہے

---

[۱] منتخب التواریخ، ج ۲ - ص ۱۶ - (مطبوعہ کلکتہ - ۱۸۶۸ء)

[۲] ایضاً، ص ۱۰

بہرحال پانی پت کی اس دوسری لڑائی میں اکبری فوج کو پندرہ سو ہاتھی، بے شمار خزانہ اور بہت سامال و اسباب غنیمت میں ملا۔ ہیموں کی بیوی بہت بڑا خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر پہلے ہی بھاگ گئی تھی۔ اس کا تعاقب کرنے والے اکبر کے فوجی دستوں نے اس کو الور سے آگے جا کر گھیر لیا اور وہ خزانہ چھوڑ کر جنگلوں اور کوہستان بجوارہ اور کوا میں چلی گئی۔ اس کا کچھ خزانہ تو جاٹوں نے لوٹ لیا اور کچھ مغل فوج کے ہاتھ آیا، مگر اس کے باوجود وہ اتنا زیادہ تھا کہ اکبر کے سپاہیوں نے ڈھالوں میں بھر بھر کر اس کو آپس میں تقسیم کیا۔ جس راستے سے ہیموں کی بیوی بھاگی تھی، اس میں اشرفیاں اور سونے کی اتنی اینٹیں گری تھیں کہ اس واقعے کے بہت عرصہ بعد تک وہ راہ گیروں کو ملتی رہیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

وخزینہ کہ شیر شاہ و سلیم شاہ و عدلی، سالہا جمع کردہ بودند، بایں گونہ تلف شد۔[۵۳]

یہ وہ خزانہ تھا جو شیر شاہ سوری، سلیم شاہ سوری اور عادل شاہ اپنے زمانے میں جمع کرتے رہے تھے، وقت کے ہاتھوں وہ اس طرح تباہ و تاراج ہوا۔

فتح کے دوسرے دن اکبر پانی پت پہنچا، وہاں سے کوچ کر کے جاہ و حشم کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا اور منبر پر از سر نو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔

اس سے ٹھیک تبیس[۳۲] سال قبل ۸ رجب ۹۳۲ھ کو بروز جمعہ اکبر کے دادا ظہیر الدین بابر نے اسی میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دی تھی۔ تاریخ میں اس جنگ کو پانی پت کی پہلی جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جنگ میں ابراہیم لودھی کی افواج قاہرہ ایک لاکھ سوار اور ایک ہزار ہاتھی پر مشتمل تھیں، جبکہ بابر کے پاس صرف پندرہ ہزار سوار اور پیادے تھے۔

جلوس شاہی کے تیسرے سال ۷ ارمحرم ۹۶۵ھ کو اکبر کی شاہانہ سواری آگرہ میں داخل ہوئی۔

---

۵۳ منتخب التواریخ ج ۲، ص ۱۷۔ (مطبوعہ کلکتہ – ۱۸۶۸ء)

دورِ اکبری کی فتوحات

اکبر سے پہلے اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کئی علاقائی سلطنتیں قائم تھیں اور مرکزی حکومت بھی مسلمانوں ہی کی تھی، تاہم ان کی سیاسی حیثیت زیادہ مستحکم نہ تھی ملک متعدد علاقائی سلطنتوں میں بٹا ہوا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں سیاسی کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ شمالی ہند میں ہندو راجے اور غیر مسلم حکمران بڑی طاقت کے مالک تھے، جن میں رانا کنبھ، رانا سانگا، مالوہ کا میدنی رائے، پنجاب کا جسرت کھوکھر اور ہیموں بقال خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ رانا سانگا کی طاقت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب بابر ہندوستان میں آیا تو دار السلطنت آگرہ کے تخت پر ابراہیم لودھی متمکن تھا، مگر پورے شمالی ہند میں سب سے زیادہ اقتدار رانا سانگا کو حاصل تھا۔ اس زمانے میں مالوہ، گجرات اور خاندیش وغیرہ کے مسلمان حکمرانوں میں اگرچہ بعض حکمران آگرہ اور دہلی کے مرکز سے زیادہ مضبوط اور رعب و دبدبے کے مالک تھے، لیکن رانا سانگا کی طاقت سے سب لرزتے اور خوف کھاتے تھے۔ ابراہیم لودھی سمیت یہ حکمران کئی مرتبہ رانا سانگا سے شکست کھا چکے تھے۔ اس کا زور بابر نے توڑا۔ میدانِ جنگ میں اس کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ اسی صدمے میں ۹۳۴ھ کو میواڑ کے پہاڑوں میں وفات پا گیا، مگر افسوس ہے، بابر کو زیادہ عرصہ ہندوستان میں حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ دہلی کی فتح پر ابھی چار سال بھی نہ گزرے تھے کہ اس کو موت کا پیغام آگیا۔ اس کے بعد ہیموں بقال کو، جو ایک زبردست اور متمرد ہندو جرنیل تھا، اکبر نے ختم کیا۔

اجمیر، ناگور اور ردولی وغیرہ میں بھی مسلمانوں کی حالت ابتر تھی اور ان کی مساجد کا تقدس ہندوؤں کے ہاتھوں پامال ہو چکا تھا۔ اسی طرح ہندوؤں کی بھگتی تحریک، گورو نانک کے صلح کل رویے اور بعض دیگر عوامل نے مسلمانوں پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ پھر جنوبی ہند میں وجے نگر کی ہندو سلطنت نے جو ایک خود مختار اور وسیع سلطنت تھی، اس نواح میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت

کے راستے میں سخت رکاوٹیں پیدا کیں۔ بلاشبہ بعض مسلمان حکمرانوں نے صورتِ حال کی اصلاح کے لیے بھرپور کوششیں کیں اور اس میں بہت حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے، مگر ان کا دورِ اقتدار و اصلاح بہت کم تھا۔ موت نے ان کو زیادہ تگ و تاز کی مہلت نہ دی۔ ان حکمرانوں میں بابر اور شیر شاہ سوری کے نام لائق تذکرہ ہیں۔

اکبر نے زمامِ اقتدار ہاتھ میں لینے کے بعد اس طرف پوری توجہ مبذول کی اور استحکامِ سلطنت کو سب امور سے مقدم گردانا۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ہندوستان کے جو صوبے خود مختاری کا دعویٰ کرنے لگے تھے اور طویل عرصے سے مرکز کی گرفت سے باہر تھے، انھیں پھر سے سلطنتِ دہلی کے زیرِ نگین کیا اور وہ ان کے مرکز گریز رجحانات کو ختم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اکبر کے عہد میں مغلیہ سلطنت کے دائرے میں بڑی وسعت ہوئی، پورے ہندوستان میں اس کا علمِ اقتدار لہرانے لگا۔ مالوہ فتح ہوا، گونڈوانہ مغلیہ سلطنت میں شامل ہوا، جے پور کے راجا بہاری مل سے صلح ہوئی، جس کے نتیجے میں راجا مذکور نے اکبر کی اطاعت قبول کی اور اپنے خاندان کی ایک لڑکی اس کے عقد میں دے دی۔ ساتھ ہی راجا کے بیٹے بھگوان داس اور پوتے مان سنگھ کو اعلیٰ منصب عطا ہوئے، میواڑ کے راجا نے اس صلح کی مخالفت کی تو اکبر کے ہاتھوں چتوڑ کا قلعہ فتح ہوا، کالنجر اور رنتھنبور کے مشہور قلعے اکبر کے قبضے میں آئے، جیسلمیر اور بیکانیر کے راجوں کو اپنا اطاعت گزار بنایا۔ گجرات پر فتح حاصل کی اور بنگال پر قبضہ کیا۔

اس کے بعد فتوحات کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس میں اکبر نے کشمیر اپنے تابع فرمان کیا، اس سے قبل کشمیر کو مستقل سلطنت کی حیثیت حاصل تھی اور وہ کبھی شاہانِ ہند کے زیرِ فرمان نہ آیا تھا۔ سندھ پر اپنے اقتدار کا پرچم لہرایا، اڑیسہ پر تسلط جمایا، بلوچستان فتح کیا اور قندھار اکبری مقبوضات میں شامل ہوا۔

پھر دکن کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی۔ احمد نگر کا مضبوط قلعہ اپنی مملکت میں شامل کیا اور خاندیش کا مستحکم قلعہ اسیر گڑھ مسخر کیا۔ جس کے نتیجے میں احمد نگر اور خاندیش کے تمام وسیع علاقے مقبوضاتِ مغلیہ میں شامل ہو گئے:

اس طرح اکبر نے ہندوستان کی علاقائی سلطنتیں تقریباً ختم کر دیں اور مختلف راجاؤں اور حکمرانوں کا زور توڑ دیا اور پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اکبر کی ان مسلسل فتوحات کو تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

اکبر کا نظامِ مملکت

نظامِ سلطنت کے سلسلے میں اکبر بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ وہ صاحبِ تدبیر، منتظم، فاتح، جنگ جُو اور قابل حکمران تھا۔ اس میں ملک گیری، حکمرانی اور ملک رانی کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس نے اس وسیع ملک میں جس انداز سے حکومت کی اور نظم و نسق کے دائروں کو جس نہج سے وسعت دی، وہ اسی کا حصہ تھا۔ پھر اس نے ایک خاص ملکی نظام مرتب کیا، جو آگے چل کر معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں برقرار رہا اور کئی امور میں برطانوی نظامِ حکومت کی بنیاد بنا، جس پر بھارت اور پاکستان اب بھی عمل پیرا ہیں۔[۵۴]

اکبر کو مغلیہ نظامِ حکومت کے مؤسسِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے قواعدِ سلطنت اور قوانینِ حکومت نہایت مضبوط اور مثالی تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کا درباری مورخ منشی محمد کاظم اس ضمن میں اکبر کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتا ہے اور اُسے مغلیہ سلطنت کے آئین کا موجد قرار دیتا ہے:

حضرت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ طاب ثراہ کہ مجددِ آئینِ جہاں بانی و مشیّدِ قوانینِ ایں سلطنتِ جاودانی اند۔[۵۵]

یعنی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ، سلطنتِ مغلیہ کے آئینِ جہاں بانی کا موجدِ اول اور اس کے مضبوط و مستحکم قوانین کا بانیِ اوّلین تھا۔

اکبر زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا لیکن مردم شناس اور جوہر قابل کا قدر دان تھا۔ اس نے

---

[۵۴] رودِ کوثر، ص ۸۱

[۵۵] عالم گیر نامہ، ص ۳۸۷

فرض شناس اور لائق افراد اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے۔ اس کے امرا و ارکانِ سلطنت اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو سمجھنے اور پورا کرنے کی کامل صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کی بے پناہ فتوحات کا سلسلہ اسی لیے آگے بڑھا اور مختلف مہمات میں اس کی فتح و کامرانی کا دائرہ اسی بنا پر وسیع ہوا کہ اس کے ارکانِ سلطنت وفادار اور امرائے مملکت اصحابِ عقل و دانش تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

حضرت عرش آشیانی کہ نوکرانِ خوب داشتند، از ہمیں جہت فتوحاتِ متواترہ و مہماتِ متکاثرہ می فرمودند۔

یعنی ہمارے جدِ امجد جلال الدین اکبر نے اسی لیے مسلسل فتوحات اور بہت سی مہمات سر کیں کہ اس کے ارکانِ حکومت نہایت عمدہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔

اکبر کا نظامِ حکومت بڑا مضبوط اور کامیاب تھا۔ برصغیر کا وسیع و عریض خطۂ ارض دور دراز صوبوں میں بٹا ہوا تھا، لیکن اس پر مرکز کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ کہیں بغاوت یا نافرمانی کا خطرہ نہ تھا۔ حکومت کے بلند مناصب پر بہترین صلاحیتوں کے مالک افراد متعین تھے اور ایک ایسا منصب داری نظام قائم تھا، جس کے عہدیداروں کے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں تبادلے ہوتے رہتے تھے تاکہ ان کی قابلیت سے ہر علاقے کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ بہتر کارکردگی پر ان کو ترقی دی جاتی تھی۔ انگریزی دور کا نظامِ حکومت، اکبر کے نظامِ مملکت سے بہت حد تک ہم آہنگ تھا۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم پرسیول سپیر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

یہ (اکبر کا) مرکزی نظامِ منصب داری اس امپیریل سروس سے اصولی طور پر مختلف نہ تھا، جس کے بل پر انگریزوں نے حکومت کی۔[۵۶]

اکبر کا ایک قابلِ تعریف کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ملک میں بندوبستِ اراضی کا اہتمام کیا، جس پر تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اب تک عمل کیا جاتا ہے۔ ہندوستان اور

---

[۵۶] رودِ کوثر، ص ۸۲

پاکستان درحقیقت زرعی ملک ہیں۔ اس سرزمین میں یہ کام بنیادی اہمیت کا حامل تھا اور اکبر نے اس کو شائستۂ التفات ٹھہرایا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے اس نے اپنے دو ماہر اور تجربہ کار اہل کاروں، راجا ٹوڈرمل اور امیر فتح اللہ شیرازی کو مامور کیا۔

اکبر کی مذہبی زندگی کا پہلا دور

اکبر کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مذہبی زندگی تین ادوار کو محیط ہے۔ پہلا دور ایک اچھے مسلمان کی زندگی کا بہترین نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ چودہ سال کی عمر میں اورنگ ہند پر متمکن ہوتا ہے اور اس سے تقریباً بائیس برس بعد تک ایک باعمل اور پابندِ شرع مسلمان کی سی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے کئی وجوہ ہو سکتے ہیں۔ ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ مذہبی اور دینی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اسی ماحول میں اس نے شعور کی آنکھیں کھولی تھیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے باپ کی گوناگوں تکلیفوں اور اس کی دشت نوردی کے تمام گوشوں سے خوب آگاہ تھا، جس کے باعث قدرتی طور پر اس کے دل میں نرمی پیدا ہو گئی تھی اور اس پر اللہ کا خوف طاری رہنے لگا تھا۔ جب وہ ماں باپ کے گزشتہ مصائب یاد کرتا اور اس کے مقابلے میں اپنی بادشاہت کا تصور اس کے ذہن میں آتا تو فوراً گردن اللہ کے حضور جھک جاتی اور قلب میں سوز و گداز کی ایک خاص کیفیت کروٹ لینے لگتی۔ تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے پیشرو یعنی سوری خاندان کے حکمران، شیر شاہ سوری اور سلیم شاہ سوری، مذہب اور دین سے قلبی وابستگی رکھتے تھے۔ اکبر بھی ازراہِ مصلحت یا کسی اور وجہ سے ممکن ہے اسی اسلوبِ حیات کو اختیار کیے رکھنا مناسب سمجھتا ہو۔

بہرکیف وجہ کچھ بھی ہو، اکبر کی زندگی کا یہ عہد تدین و تصوف کے قالب میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ اپنے عصر کے مشہور بزرگ شیخ سلیم چشتی کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا، جو فتح پور سیکری میں اقامت گزین تھے۔ اکبر کی ان سے عقیدت خاطر کا یہ عالم تھا کہ ان کی وجہ سے کئی سال فتح پور سیکری کو دارالخلافہ کی حیثیت دے رکھی تاکہ شیخ کا قرب حاصل رہے اور ان کی دعائیں اس کے شاملِ حال ہوں۔ اکبر کے کئی لڑکے کم سنی میں فوت ہو گئے تھے،

شیخ سے بچے کی پیدائش اور زندگی کے لیے دعا کرائی۔ پھر جہانگیر پیدا ہوا تو حصولِ برکت کے لیے انہی کے نام پر بیٹے کا نام سلیم رکھا۔ کئی مرتبہ شیخ معین الدین اجمیری کے مرقد پر جانے کے لیے اجمیر کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر اکبر نے بطور ایک نذر کی تکمیل کے فتح پور سیکری یا آگرہ سے پا پیادہ بھی کیا۔ شیخ سلیم کی وفات کے بعد آگرہ سے پا پیادہ ان کے مدفن پر فتح پور سیکری بھی گیا۔

اکبر کے ذوقِ عبادت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ایک عبادت خانہ تعمیر کرایا۔ جب اس کو بڑی بڑی فتوحات حاصل ہوئیں، حدودِ مملکت روز بروز وسیع ہونے لگیں، پورے ملک کا نظم و نسق حسبِ منشا قائم ہو گیا، مکمل امن و امان کی صورتِ حال پیدا ہوئی اور کوئی قابلِ ذکر دشمن اور طاقت ور حریف باقی نہ رہا تو اس کا رجحان پوری طرح عبادت و ریاضت کی طرف ہو گیا۔ ان دنوں اس کی صحبتیں درگاہِ اجمیر کے درویشوں اور مجاوروں کے ساتھ رہتیں اور وقت کا زیادہ تر حصہ، اللہ اور رسول کی عبادت و اطاعت میں گزرتا۔ علما کی محفلیں، فقہا کی مجلسیں، صوفیا کی صحبتیں اس کی دلچسپی کے مراکز تھیں، جہاں وہ تصوف کی باتیں کرتا، فقہی مسائل کو سمجھتا اور علمی مباحث سے محظوظ ہوتا۔ راتوں کو وہ اللہ کی عبادت میں مصروف رہتا۔ عبدالقادر بدایونی کے بیان کے مطابق کسی نے اس کو "یا ہو" اور "یا ہادی" کا وظیفہ بتا دیا تھا، وہ عموماً رات کی تاریکی میں یہ وظیفہ پڑھا کرتا تھا۔

مُلّا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اکبر کی مجالسِ تصوف کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وہ صوفیا اور علما کا بڑا ہی معتقد تھا۔ اس کے دل پر اللہ کی عظمت کا بے پناہ اثر تھا۔ اللہ کی عطا کردہ ان بے شمار نعمتوں پر اظہارِ تشکر کی غرض سے وہ بالعموم ایک قدیم حجرے میں چلا جاتا جو آبادی سے دور اور شاہی محلات سے قریب تھا، بادشاہ اس حجرے کے پتھر کے فرش پر بیٹھ جاتا اور ذکرِ الٰہی میں مصروف ہو جاتا۔ دیر تک وہاں حالتِ مراقبہ میں بیٹھا رہتا۔

اکبر بادشاہ ان دنوں حاکمِ بنگالہ سلیمان سے بھی بہت متاثر تھا۔ اس کے بارے میں اس نے سُن رکھا تھا کہ وہ شب کے آخری حصّے میں اُٹھ کر ڈیڑھ سو علما و مشائخ کے ساتھ تہجّد کی نماز با جماعت ادا کرتا ہے، بعد ازاں فجر کی نماز تک علما کی مجلس میں بیٹھتا اور تفسیر و تذکیر میں مصروف رہتا ہے۔ فجر کے بعد ملکی معاملات اور فوج کے بارے ضروری مشورے کرتا ہے۔ سلیمان کے ان معمولات میں کبھی فرق نہیں آیا۔ اکبر نے بھی ان دنوں اسی طرح اپنے اوقات تقسیم کر رکھے تھے۔ اتفاق سے حاکمِ بنگالہ سلیمان کے آمد کی خبر بھی مشہور تھی، یہ صوفی منش اور صاحبِ حال بادشاہ تھا، صاحبِ بیعت بھی تھا۔ لوگ اس سے استفاضہ کرتے اور اس کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوتے تھے۔ اکبر اس کی آمد کی خبر سن کر بہت خوش ہوا اور کچھ معزز مہمان کی تشریف آوری اور کچھ اپنے شوقِ عبادت کی وجہ سے شیخ عبداللہ نیازی کے حجرے پر ایک بڑی عبادت گاہ تعمیر کرائی۔

اکبر کا معمول تھا کہ ہر جمعہ کے بعد عبادت خانے میں ایک مجلس منعقد کرتا جس میں علما، مشائخ، امرا ہر طبقے کے لوگ شامل ہوتے۔ اس موقع پر بادشاہ کے قریب بیٹھنے کے لیے حاضرین میں اکثر تقدیم و تاخیر کا جھگڑا شروع ہو جاتا۔ اس کا علاج اکبر نے یہ کیا کہ سب طبقوں کے لیے الگ الگ نشستوں کا تعین کر دیا۔ فیصلہ کیا کہ امرا مشرقی جانب بیٹھیں اور سادات مغربی جانب۔ علما بجانب جنوب بیٹھا کریں اور مشائخ بجانب شمال۔! اس مجلس میں اکبر کا یہ معمول تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھتا، باری باری ہر طبقے کی نشست گاہ پر جاتا اور ان کی بحثوں میں حصّہ لیتا۔

بادشاہ کے دل میں علما و فقہا کی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ حسبِ مدارج ان کی مالی مدد کرتا اور مطالعہ کے لیے ان کو کتابیں بھی عطا کرتا تھا۔ گجرات کی فتح کے موقع پر اعتماد خاں گجراتی کی جمع کی ہوئی بہت سی نفیس اور قیمتی کتابیں بطورِ غنیمت اس کو ملیں تو وہ کتابیں خود بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے اس مجلس میں شریک ہونے والے علما میں تقسیم کیں۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں، اس موقع پر بادشاہ نے مجھے بھی کچھ کتابیں دی تھیں، ان میں سے ایک کتاب "انوار المشکوٰۃ" تھی، جس میں "مشکوٰۃ الانوار" کے عنوان سے ایک فصل کا

اضافہ بھی شامل تھا۔ جو کتابیں بچ گئیں، وہ امرا کو دیگر تحائف واشیا کے بدلے میں عطا کیں۔

عبدالقادر بدایونی نے عبادت خانے کی مختلف مجلسوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک رات اس مجلس میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور حاضرین مجلس بلند آواز سے بحث کرنے لگے۔ ان کو خاموش کرانے اور مجلس کا انتظام صحیح رکھنے کے لیے بادشاہ نے مجھے مقرر کیا اور کہا کہ لوگوں کو شور و شغف سے روکو، جو شخص ناشائستہ بات کرے اس کی اطلاع مجھے دو، میں اس کو مجلس سے اٹھادوں گا۔ میں نے آہستہ سے آصف خاں سے کہا، اس طرح تو تقریباً سب کو اٹھا دینا پڑے گا۔ بادشاہ نے پوچھا، کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے جو کچھ کہا تھا، بادشاہ کو بتایا، وہ بہت خوش ہوا، اور حاضرین مجلس کو بھی میری یہ بات بتائی"[۵]

اکبر کے اس ابتدائی دور میں علما کو انتہائی قدر و منزلت حاصل تھی، بلاشبہ اس سے قبل شیر شاہ سوری اور سلیم شاہ سوری کے عہدِ حکومت میں بھی علما کو عزت و تکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، لیکن اکبر اس ضمن میں ان سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ اس نے شیخ الاسلام کے اعزاز میں مزید اضافہ کیا، مخدوم الملک کو مشیر دربار اور رکن سلطنت بنایا اور صدر الصدور کو وہ اختیارات تفویض کیے جو اس سے پہلے کبھی کسی صدر کے حصے میں نہ آئے تھے۔ اکبر کے عہد میں شیخ عبدالنبی گنگوہی، صدر الصدور کے منصب بلند پر فائز تھے۔ بادشاہ ان کا بے حد عقیدت مند تھا اور بدرجہ غایت احترام سے پیش آتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی سماعت کے لیے کبھی کبھی ان کے گھر بھی جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے جوتے اٹھا کر بھی ان کے سامنے رکھے۔ اپنے بیٹے شہزادہ سلیم کو باقاعدہ ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل کیا اور اس نے شیخ سے مولانا جامی کی

---

۵ منتخب التواریخ، ج ۲، ص ۲۰۲

مرتب کردہ چالیس احادیث (چہل احادیث) کا سبقاً سبقاً درس لیا۔ اس زمانے میں اکبر شیخ عبد النبی کے تقویٰ اور تدیّن سے بہت متاثر تھا، وہ اس کو نیکی کی تلقین کرتے اور مذہب پر راسخ رہنے کی تعلیم دیتے تھے، جس کے باعث اکبر کی یہ کیفیت ہوئی کہ شیخ فرید بھکری کے بیان کے مطابق وہ نماز باجماعت کی پابندی کرنے لگا، خود اذان دیتا، بعض اوقات امامت بھی کراتا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا۔

ایک مرتبہ تو معاملہ یہاں تک پہنچا کہ اکبر کی جوانی کا زمانہ تھا، سال گرہ کی تقریب منعقد ہوئی، اکبر زعفرانی لباس زیب تن کرکے محل سرا سے باہر آیا۔ صدر الصدور شیخ عبد النبی گنگوہی بھی موجود تھے۔ ان کی غیرتِ دینی جوش میں آئی، سرِ دربار عصا اٹھا کر اس سختی سے اکبر کو ٹوکا کہ عصا کا سرا بادشاہ کے سر کو جا لگا۔ اکبر پاسِ ادب سے اس وقت تو خاموش رہا، لیکن محل میں جا کر ماں سے شیخ کے طرزِ عمل کی شکایت کی۔ نیک بخت ماں نے سعادت مند بیٹے سے کہا، بیٹا یہ خفگی اور شکایت کا مقام نہیں، تمھارے لیے ذریعۂ نجات ہے، کتابوں میں لکھا جائے گا کہ ایک بوڑھے عالم نے اتنے بڑے صاحبِ اقتدار بادشاہ کو عصا مارا اور بادشاہ فقط ادبِ شرعی کی بنا پر صبر کرکے برداشت کر گیا۔ ذخیرۃ الخوانین کے اصل الفاظ پڑھیے:

دریں اثنا سال گرہ حضرت خلیفہ بود، بر لباس خاصہ ایشاں زعفران پاشیدہ بودند۔ شیخ عبد النبی در غضب آمدہ در روی دیوان عصا بحضرت خلیفہ الٰہی انداخت و بدامن دولت ایشاں رسیدہ پارہ شد کہ چرا لباس اہلِ بدعت و نامشروع پوشیدہ و در آں وقت حضرت عرش آشیانی لباسِ مسنون می پوشیدند و در جریانِ امر بالمعروف ونہی عن المنکر نہایت جد و جہد داشتند، حتیٰ اذان خود فرمودہ امامت می کنانیدند، بلکہ جاروب مسجد را می دارند، و ایں شخص (عبد النبی) آنحضرت را بسیار تنگ گرفتہ بودند، بادشاہ چوں پیش والدہ خود حضرت مریم مکانی کہ از اولاد حضرت زندہ فیل احمد جام بود، رفتہ شکایت کردند کہ در روی دیوان عصا بمن زدہ، اگر مدعا امر معروف بود بایستے در خلوت نصیحت می کردند۔ بیگم گفتند کہ بو لم از وقوع ایں امر در خاطرت گراں نیاید، کہ

مقصود شیخ اظہارِ تحمل خود نہ بود بلکہ اجرائے احکامِ شرعی می کرد، حق تعالیٰ شما را از عقوبت اخروی کہ خلائق اوّلین و آخرین در روز جزا جمع می آیند نگاہ داشتہ، ایں حکایت تا دورِ قیامت باقی می ماند کہ ملائے مفلوک امر معروف یا بادشاہِ عصر چنیں نمود۔ حضرت خلیفہ الٰہی کہ کوہِ وقار بودند بہ شیخ عبدالنبی چیزے نگفتہ ؎۵۸

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جن بزرگانِ دین سے اکبر کو بے پناہ عقیدت تھی، ان میں حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ وہ ان کے مدفن پر دعا کے لیے حاضر بھی ہوا تھا۔ اکبر سے پہلے شیخ فرید الدین کے مسکن کا نام اجودھن تھا، اکبر نے از راہِ عقیدت اس کو پاک پتن کے نام سے موسوم کیا۔ اس زمانے میں اجودھن کو ایک گاؤں کی حیثیت حاصل تھی اور وہ دریائے ستلج کے کنارے واقع تھا۔

بادشاہ نے بہت سے لوگوں کو اپنے خرچ سے حج بیت اللہ کے لیے بھی بھیجا۔ رجب ۹۸۵ھ کو حجاج کا ایک قافلہ روانہ کیا، جس کا امیر شاہ ابو تراب کو مقرر کیا، جو شیراز کے مشہور بزرگ اور شاہانِ گجرات کے مرشد تھے۔ ان کے ساتھ اعتماد خاں گجراتی کو بھی بڑی رقم دے کر مکۂ معظمہ بھیجا اور عام منادی کرادی کہ جو شخص چاہے اس قافلے کے ساتھ حج کے لیے جاسکتا ہے۔ یہ قافلہ بادشاہ نے میرٹھ سے ترتیب دیا تھا۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ میں نے بھی صدر الصدور شیخ عبدالنبی سے درخواست کی کہ میرے لیے بھی بادشاہ سے حج پر جانے کی اجازت لے دی جائے۔ شیخ نے مجھ سے سوال کیا۔ "کیا تمھاری والدہ زندہ ہیں؟ میں نے کہا "ہاں" انھوں نے کہا "تمھارا کوئی بھائی یا ایسا عزیز ہے جو تمھارے بعد ان کی خدمت کرتا رہے؟" میں نے کہا "نہیں صرف میں ہی ان کا سہارا ہوں۔" شیخ نے فرمایا۔ "اگر تم والدہ سے اجازت حاصل کرلو، تو بہتر ہوگا۔" اس سے آگے بدایونی کہتے ہیں۔ "غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ

۵۸؎ ذخیرۃ الخوانین، ج ۱، ص ۶۹

ہوئی اور اب میں اس محرومی پر حسرت و افسوس کرتا رہتا ہوں"۔

بہرحال اکبر کا پہلا اور ابتدائی دور خالص مذہبی اور دینی دور تھا اور اس کا دربار علما کا مرکز بن گیا تھا۔ اس میں ملک اور بیرونِ ملک کے بہت سے اہلِ علم موجود تھے۔ بادشاہ حسبِ مراتب سب کا احترام کرتا اور ان کے اکرام و احترام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ تفصیل کا یہ محل نہیں۔ اس سلسلے کے متعدد واقعات، منتخب التواریخ، طبقاتِ اکبری، ذخیرۃ الخوانین، مآثرِ رحیمی، عالم گیر نامہ اور دیگر کتبِ تاریخ میں مرقوم ہیں۔

دوسرا دور

سنِ جلوس کے تئیسویں[۲۳] سال کے آواخر (۹۸۵ھ) اور چوبیسویں[۲۴] سال کے اوائل (۹۸۶ھ) کو، جب اکبر سینتیس[۳۷]، اڑتیس[۳۸] سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کی مذہبی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اب اس کے ذہنی افکار کے قافلے نے ایک نیا موڑ کاٹنا شروع کر دیا ہے اور اس کے قلبی رجحانات کا کارواں نئی منزل کی طرف چل نکلا ہے جو اس کے سفرِ حیات کی ابتدائی سمتوں سے بالکل مختلف ہے۔ یعنی اس نے اپنے آباد و اجداد کے صحیح مذہبی تصورات سے انحراف کی راہیں تلاش کرنے کی ٹھان لی ہے اور دینی و اسلامی روایات کو، جو مغل اسلاف سے اس کو ورثے میں ملی تھیں، ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اکبر کی زندگی کا یہ نیا پہلو، جسے دورِ ثانی سے تعبیر کرنا چاہیے، صحیح العقیدہ مسلمانوں کے لیے نہایت ذہنی کوفت کا باعث تھا۔ اس زمانے میں بادشاہ بے شمار لوگوں سے متاثر ہوا، اور بہت سے افراد نے اس کے فکر و عمل کے متعینہ خطوط کو بدلنے میں بھرپور حصہ لیا۔ ان میں ایک پرکھوتم برہمن تھا۔ اس کے بعد دیوی برہمن کا نام آتا ہے۔ ان برہمنوں نے بادشاہ کو ہندو مذہب کے اسرارِ بت پرستی سے آگاہ کرنا شروع کیا، آتش پرستی، آفتاب پرستی اور ستاروں کی تعظیم کے رموز بتائے۔ نیز مشرک بادشاہوں اور ہندوؤں کے خیالی دیوتاؤں کی عظمت و تکریم اس کے ذہن نشین کرائی — یہ سب باتیں انھوں نے اس انداز سے بادشاہ کے کانوں میں ڈالیں کہ وہ ہندوؤں کے عقیدہ تناسخ کا

قائل ہو گیا۔

انہی دنوں شیخ تاج الدین بن شیخ زکریا اجودھنی دہلوی، بادشاہ سے خلوت میں ملا۔ اس کو اکثر صوفیا "تاج العارفین" کہتے تھے اور وہ شیخ امان اللہ پانی پتی کا شاگرد تھا، جن کا اصل نام عبدالملک تھا۔ یہ شخص شرعی پابندیوں کو صحیح نہ سمجھتا تھا اور اس دور کے بعض گمراہ صوفیا کی طرح وحدت الوجود کا سختی سے قائل تھا۔ اکبر معمولی پڑھا لکھا اور خام فکر شخص تھا۔ تاج الدین نے اس کے سامنے دوزخ، جنت، ملائکہ، شیطان وغیرہ کی اس اسلوب سے تاویلیں کیں کہ بادشاہ اس سے متاثر ہو گیا۔ پھر اس نے ابن عربی کے عقیدۂ ترجیح رجا علی الخوف اور فرعون کے قبول ایمان وغیرہ کی اس ڈھنگ سے بادشاہ کے سامنے تشریح کی کہ وہ صوفیا کی ان شطحیات پر یقین کرنے لگا اور عقیدہ وحدت الوجود سے متاثر ہو گیا۔

شیخ تاج الدین نے "انسان کامل" کا تصور بھی بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور پھر اس "انسان کامل" کو خلیفۂ وقت سے تعبیر کر کے خود اکبر بادشاہ کو اس کا مصداق ٹھہرایا۔ انسان کامل کے بعد اس کو عین واجب یعنی ذاتِ خداوندی کا درجہ دیا۔ پھر اس کے حضور سجدہ ریز اور زمین بوس ہونے کو ضروری قرار دیا اور اس کے اعزاز واحترام کو یہاں تک بڑھایا کہ اسے "کعبۂ مرادات" اور "قبلۂ حاجات" بنا دیا گیا۔

ایک اور بزرگ مُلّا محمد یزدی بادشاہ کے سامنے اپنے عقیدے کی تبلیغ واشاعت کرنے لگے۔ انھوں نے خلفائے ثلاثہ — حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم — کے خلاف طنز وطعن کا سلسلہ شروع کیا۔ صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، صلحائے سلف اور علمائے خلف سب کی تکفیر کی مہم کا آغاز کیا اور بادشاہ کی نظر میں اہل سنت کے علما وعقیدہ کا درجہ ختم کرنے کی ٹھانی۔ انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ سب سے بہتر شیعہ مذہب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ شیعیت سے متاثر ہو گیا۔ یاد رہے یہ وہی مُلّا محمد یزدی ہیں جنھوں نے بعد میں بادشاہ کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا اور اس کے خلاف خروج وبغاوت کو جائز قرار دے دیا تھا۔

اس زمانے میں عیسائی بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ان کے پادریوں نے دربار میں آمدورفت شروع کی اور اکبر کو اپنے افکار وتصورات سے متاثر کرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ انھوں نے بادشاہ کو عقیدۂ تثلیث سے متعارف کرایا اور انجیل کے احکام کی صحت اس کے دل میں ڈالی۔ عبدالقادر بدایونی کے بقول بادشاہ کی نظر التفات نے جو بزعم خود حق پرستی کے لیے دنیا بھر کی گمراہیوں کا خریدار بنا ہوا تھا، عیسائی پادریوں کو بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔ ان کے عقیدۂ تثلیث کی تصدیق کی اور عیسائی مذہب کو پھیلانے کی ہمت افزائی کی۔ بادشاہ کے حکم سے شاہزادہ مراد نے ان دنوں عیسائی پادریوں سے انجیل کے چند سبق پڑھے اور ابوالفضل کو انجیل کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ آہستہ آہستہ ان عیسائی پادریوں کی جسارت یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے دجال ملعون کی عاداتِ قبیحہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ حمیدہ میں نعوذ باللہ مشابہت پیدا کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اکبر کے ارکان سلطنت میں بیربر ایک نہایت خطرناک شخص تھا۔ اس نے بادشاہ کے سامنے آفتاب کے اوصاف بیان کرنا شروع کیے اور بتایا کہ دنیا کی ہر شئی آفتاب کی رہین منت ہے اور اسی کے نتیجے میں سب کچھ ظہور میں آتا ہے۔ اس لیے آفتاب پرستی ضروری ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس عقیدے کو بھی پسند فرمایا۔ اور اس ”نیر اعظم“ کی جو ”عطیہ بخش ہمہ عالم“، اور ”مربی بادشاہاں“ ہے پرستش شروع کر دی۔

انھی دنوں گجرات کے ایک شہر نوساری سے آتش پرستوں کا ایک گروہ اپنے مذہب کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے دربار میں پہنچا۔ انھوں نے زردشت کے دین کو صحیح دین کی صورت میں اکبر کے سامنے پیش کیا اور آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت قرار دیا۔ چنانچہ اکبر نے حکم دیا کہ محل میں شب و روز آگ جلتی رہے، کیوں کہ آگ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے انوار کا ایک پرتو ہے۔ اس آتش کدے کا انتظام ابوالفضل کے سپرد کیا گیا۔

پچیسویں سالِ جلوس کے نوروز کے موقع پر اکبر نے سب کے سامنے آفتاب

اور آتش کو سجدہ کیا۔ قشقہ لگایا اور اسلام کی برسرِ عام مخالفت کی اور اسے خلافِ عقل و فہم ٹھہرایا۔

مُلا مبارک ناگوری جو خود بہت بڑا عالم تھا، علما کی سخت مخالفت کرنے لگا۔ اس کے دو لڑکے ابوالفضل اور فیضی بھی پوری قوت کے ساتھ میدان میں نکل آئے اور اسلام، دین حق اور علمائے شرعِ متین کی جس قدر مخالفت کر سکتے تھے، کرنا شروع کر دی۔ ان لوگوں کی مدد اور انگیخت سے اکبر نے ایک خاص کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اکبر خَلِیفَۃُ اللّٰہ ایجاد کیا، جزیہ منسوخ کر دیا اور احکامِ شرع کی علانیہ مذمت اور مخالفت ہونے لگی۔ ۹۹۰ھ میں اکبر کو امامت و نبوت کا اعزاز بھی دے دیا گیا اور اُسے ”صاحب دین حق“ بنا دیا گیا۔ جلوس کے اٹھائیسویں سال تو وہ اس سے بھی آگے بڑھ گیا، اب اُسے خدا کا اوتار سمجھا جانے لگا۔ اس عرصے میں جو بے شمار بدعات پھیلیں اور دینِ اسلام کی جو توہین ہوئی، اس کی تفصیلات عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں بیان کی ہیں۔ ان مختصر سطور میں ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ کتے اور خنزیر کو پاک قرار دے دیا گیا، غسلِ جنابت کو حرام ٹھہرا دیا گیا۔ مردوں کے لیے سونے کے زیور اور ریشم کا لباس جائز ثابت کر دیا گیا، عربی زبان کی مخالفت ہونے لگی، مسائل دینی کا تمسخر اڑایا جانے لگا، ذبیحہ گاؤ بند کر دیا گیا۔ داڑھی ترشوانے اور منڈھوانے کے جواز کا اعلان کر دیا گیا۔ علما کا ایک محضر طلب کیا گیا، ان میں سے بعض نے برضا و رغبت اور بعض نے بجبر و اکراہ اس پر دستخط ثبت کیے۔ اس کے بعد اسلامی احکام کی برسرِ عام توہین ہونے لگی اور غیر اسلامی رسوم و عوائد کی ترویج و اشاعت کے لیے، ہر قسم کی سہولتیں مہیا کر دی گئیں۔ اختصار کے ساتھ یوں سمجھیے کہ جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز کا درجہ دے دیا گیا، حرام کو حلال اور حلال کو حرام میں بدل دیا گیا۔ قرآنِ مجید کے کلامِ الٰہی ہونے پر اعتراضات کیے گئے اور اُسے مخلوق قرار دیا گیا، وحی کو امرِ محال ٹھہرایا گیا، نبوت و رسالت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کیے گئے، معجزات کا انکار کیا گیا اور بعد از موت بقائے

ارواح اور عذاب و ثواب کو صرف تناسخ پر منحصر کر دیا گیا اور ان غلط افکار و خیالات کی خوب تشہیر کی گئی۔

اس زمانے میں بہت سے امرائے مملکت، علمائے دین اور ارکانِ حکومت نے بادشاہ کے اس طرزِ عمل کی مخالفت کی اور نہایت سختی کے ساتھ کی، مگر ان میں سے بعض کو دور دراز علاقوں میں تبدیل کر دیا گیا، بعض کو قید میں ڈال دیا گیا، بعض کو قتل کرا دیا گیا، بعض کو حج کے بہانے حجاز بھیج دیا گیا، بعض کے وظیفے بند کر دیے گئے اور بعض کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی گئی۔ بہر حال اصحابِ دین اور اربابِ غیرت و حمیت کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش اور بدرجۂ غایت ابتلا کا وقت تھا۔ اس کا مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے:

بادشاہ نے قطب الدین محمد خاں، شہباز خاں کنبوہ اور اس مرتبے کے دیگر امرا کو اسلام کی اطاعت ترک کر دینے اور اپنے نئے ایجاد کردہ دین کو اختیار کرنے کی ترغیب دی تو ان امرا نے جرأت سے کام لے کر بادشاہ کے اس حکم کو رد کر دیا۔ قطب الدین محمد خاں نے کہا کہ شاہانِ ولایت خلیفہ روم وغیرہ یہ باتیں سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ وہ تو سب اسی اسلام پر ایمان رکھتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں، جس کی تعلیم اللہ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے اور ہمیں اسی کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔ اکبر نے اس بات پر نہایت خفگی کا اظہار کیا اور کہا، تم روم کے فرماں روا کی خاطر ہمارے ساتھ اس قدر درشتی سے بات کر رہے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ اور اسی کے پاس چلے جاؤ۔ وہاں تمھیں اعزاز و مرتبہ حاصل ہوگا۔

شہباز خاں کنبوہ نے بھی بادشاہ کے فرمان کی سختی سے مخالفت کی اور بیربر کو جو علی الاعلان اسلام پر طعنہ زنی کرتا تھا، سب کے سامنے سخت برا بھلا کہا۔ اور ان الفاظ سے مخاطب کیا:

"اے ملعون کافر، اب تیری بھی زبان نکل آئی کہ ایسی باتیں کرنے لگا ہم تجھے اس کا مزہ چکھائے بغیر نہیں رہیں گے۔"

ائمہ اور علما کے اعزاز یا تو گھٹا دیے گئے یا بالکل ختم کر دیے گئے۔ مسجدیں ویران ہوگئیں، دینی مدرسے اُجڑ گئے اور شرفا کو ذلیل کیا گیا۔ اس سلسلے میں حکیم الملک اور ابوالفضل کے درمیان شدید تلخ کلامی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ ابوالفضل کو "فضلہ" کے نام سے پکارنے لگے۔ بادشاہ چونکہ ابوالفضل کی بہت عزت کرتا تھا، اس لیے حکیم الملک پر بڑا تشدد کیا گیا اور بالآخر انھیں مکہ معظمہ کی طرف چلے جانے کا حکم دے دیا۔

مُلّا محمد یزدی کو جون پور کا قاضی القضاۃ مقرر کر کے بھیج دیا اور محمد معصوم خاں فرنخودی جو جون پور کی حکومت پر متعین تھا، دربار میں طلب ہوا اور دوبارہ اسی عہدے پر واپس بھیج دیا گیا۔ مُلّا محمد یزدی پہلے بادشاہ کے حامی تھے، اب سخت مخالفت پر اتر آئے تو انھیں جون پور بھیج دیا گیا، انھوں نے جون پور کا منصب قاضی القضاۃ سنبھالنے کے بعد بادشاہ کے خلاف خروج اور بغاوت کا فتویٰ جاری کیا۔ اس فتوے سے متاثر ہو کر محمد معصوم کابلی، محمد معصوم فرنخودی، میر معز الملک، نیابت خاں، عرب بہادر اور دوسرے امیروں نے تلواریں کھینچ لیں اور بادشاہ سے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ اکثر مقامات پر انھوں نے سخت لڑائیاں لڑیں۔ ائمہ مساجد اور بہت سے لوگوں نے ان کا پوری طرح ساتھ دیا۔ بنگال میں قاضی یعقوب نے بھی بادشاہ کی مخالفت کی۔ کچھ روز بعد بادشاہ نے ان میں سے اکثر کو کسی نہ کسی بہانے قتل کرادیا۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی کو گلا گھونٹ کر مار دیا گیا۔ اس طرح اور بہت سے علما و مشائخ کو شدید اذیتیں پہنچائی گئیں۔ متعدد علما و امرا کو مختلف علاقوں میں منتشر کر دیا گیا لاہور کے علما کو بھی مختلف مقامات پر بھیج دیا، مثلاً قاضی صدر الدین جالندھری لاہوری کو، جن کا مرتبۂ علمی مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری سے بھی زیادہ تھا، لاہور سے بدل کر بھڑوچ اور گجرات کے منصب قضا پر متعین کر دیا۔ مُلّا عبدالشکور گول دار کو جون پور روانہ کر دیا اور ملا محمد معصوم کو بہار کی قضارت پر مامور کر دیا۔ شیخ منور کو لاہور سے منتقل کر کے صوبہ مالوہ کی صدارت پر فائز کر دیا۔ لاہور میں صرف مولانا معین کے پوتے شیخ معین رہ گئے، جو مشہور واعظ تھے۔ بادشاہ نے کبر سنی کی بنا پر انھیں نظر انداز کر دیا۔

اس عالم دین نے ۹۹۵ھ کو وفات پائی۔

اکبر نے یہ طرزِ حیات کیوں اختیار کیا اور اس اسلوبِ زندگی کو کس بنا پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا؟ اس کے کئی وجوہ ہیں۔

ایک یہ کہ اکبر کو حصولِ علم کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ اپنے آباو اجداد کی طرح عالم نہ تھا۔ نہ اس کے باپ کو کہیں جم کر بیٹھنے کی سہولتیں میسّر آئیں اور نہ اکبر کو تعلیم کے مواقع حاصل ہوئے۔ وہ اَن پڑھ تھا لیکن مسائل سمجھنے کا شائق اور ذہن کو تلاش و جستجو میں مصروف رکھنے کا عادی تھا۔ مسلمان، ہندو، عیسائی، مجوسی، ہر مذہب کے لوگوں کو آپس میں بحث و تکرار میں الجھا دیتا تھا۔ خود علمی اور تحقیقی معلومات سے کورا تھا، مختلف لوگوں کی باتیں سن کر ذہنی انتشار کا شکار ہوگیا اور اس کی بے علمی سے علمائے سُو نے جن میں مُلّا مبارک، تاج الدین دہلوی، ابوالفضل اور فیضی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں خوب فائدہ اُٹھایا اور اس کو گمراہ کرنے میں درحقیقت یہی لوگ پیش پیش تھے۔

دوسرے یہ کہ دربار میں مختلف مسائل کو علما اس انداز سے موضوعِ بحث ٹھہراتے تھے اور عبادت خانے میں اس طرح سلسلۂ بحث جاری رہتا تھا کہ بادشاہ ان سے بدظن ہوگیا اور مُلّا مبارک وغیرہ نے اس کی ذہنیت کو سمجھ کر اسے مزید غلط راہوں پر ڈال دیا۔

تیسرے یہ کہ ہندوستان پر حکومت قائم اور مستحکم رکھنے کے لیے اس نے ضروری سمجھا کہ ہر مذہب کے لوگوں کو خوش رکھا جائے اور فکر و عمل کے لحاظ سے صلح کل رویہ اختیار کیا جائے۔

مُلّا عبدالقادر بدایونی نے جو اکبر کا امامِ نماز اور مشہور عالم تھا، اس سلسلے کی تمام تفصیلات بیان کی ہیں۔

برصغیر کی علمی و فکری تاریخ کے بعض ماہرین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مذہبی سلسلے سے متعلق جو باتیں عبدالقادر بدایونی نے اکبر کی طرف منسوب کی ہیں، وہ بڑی حد تک مبالغہ آمیز ہیں اور اس کے بیان کردہ بہت سے واقعات کے بارے میں باقی معاصر

کتبِ تاریخ خاموش ہیں۔ وہ حضرات دلائل کی روشنی میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکبر پر آزاد خیالی کا ایک دور ضرور آیا، لیکن اس کو اکبر کے ترکِ مذہب اسلام اور نئے دین کی ایجاد و اختراع سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مخالفت کے خطرے کے پیشِ نظر اکبر نے جن امرا و علما کو دور دراز علاقوں اور صوبوں میں بھیج دیا تھا، بدایونی اسے جلاوطنی سے تعبیر کرتا ہے، حالانکہ اس پر جلاوطنی کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ پھر اس کا انداز منفی ہے، مثبت نہیں ہے۔ وہ ایسے واقعات کہیں سے ڈھونڈ نکالتا ہے، جو مخالفت اور نفی پر دلالت کناں ہیں۔

اس باب میں ہم زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ صرف یہ عرض کریں گے کہ اکبر ہندوستان کا مطلق العنان بادشاہ تھا۔ بدایونی اس کا ایک ملازم تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے عصر کا بہت بڑا عالم، مؤرخ اور مترجم تھا۔ طنز و تعریض کا بادشاہ تھا، حاضر جواب اور صاف بیان تھا۔ اکبر اس کے علم و فضل اور تعبیر و ترجمہ کی خوبیوں سے بہت متاثر بھی تھا، لیکن یہ کہنا قرین فہم نہیں کہ وہ ایک زبردست اور مطلق العنان بادشاہ کے بارے میں اور خود اسی کے عہد اور ملک میں اس درجہ بے باک ہو گیا ہو، یا غلط بیانی پر اتر آیا ہو، یا اس قدر مبالغہ آرائی کو اس نے اپنا شیوہ بنا لیا ہو۔

دوسری بات جس کا تعلق امرا و علما کے تبادلے سے ہے اور بدایونی ان انتظامی مصلحتوں کو جلاوطنی قرار دیتا ہے تو اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ وہ علاقے ان کے اصل علاقوں سے طویل مسافت پر واقع تھے اور اس زمانے میں آمد و رفت کے ذرائع نہایت مشکل اور صبر آزما تھے۔ پھر وہاں کا ماحول ان کے لیے بالکل اجنبی تھا، اور یہ تبادلے بطور سزا کیے گئے تھے، لہٰذا بدایونی اس پس منظر میں اگر اس پر جلاوطنی کا لفظ استعمال کرتا ہے تو یہ کوئی قابلِ اعتراض یا اتنی غلط بات نہیں ہے ـــــ اس کے علاوہ یہ تو حقیقت ہے کہ اس دور میں جن علما اور امرا کو بادشاہ نے حج پر بھیجا تھا، اس کی تہہ میں ضرور جلاوطنی کا تصور موجود تھا۔

رہا بدایونی کا منفی اندازِ بیان، تو اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ وہ ہر مقام پر

یہ انداز اختیار نہیں کرتا، اسی مقام پر کرتا ہے، جہاں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔
بدایونی کے علاوہ عہدِ اکبری کے معاصر مؤرخین بخشی نظام الدین (مصنف طبقاتِ اکبری)، ابوالفضل (مصنف آئینِ اکبری و اکبر نامہ)، اسد بیگ (مصنف اکبر نامہ) ہیں۔ یہ بھلا اس قسم کے واقعات کیوں کر ضبطِ تحریر میں لاسکتے تھے۔ رہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (مصنف تاریخ حقی) اور ان کے بیٹے شیخ نورالحق (مصنف زبدۃ التواریخ)، انھوں نے اس دور کے حالات سے بحث تو کی ہے، مگر ان کی حیثیت کچھ اور قسم کی ہے۔ بدایونی نے منتخب التواریخ چھپ چھپا کر لکھی اور کسی کو بتائے بغیر واقعات قلم بند کرتے رہے۔ ظاہر ہے ان کا بنیادی مقصد ہر ممکن طریقے سے صحیح حالات کی عکاسی یا (کم از کم) ان کی نشاندہی کرنا تھا، اور وہ اس میں کامیاب ہیں۔
بہر حال بدایونی بلاشبہ طنز مصنف ہے اور سخت مذہبی رجحانات کا حامل ہے، لیکن چوں کہ وہ اکبر کا معاصر، اس کا امام نماز، ملازم اور واقعات کا چشم دید گواہ ہے، لہٰذا اس کی بات کی آسانی سے تغلیط یا تردید نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ ذہن تصدیق ہی کی طرف جاتا ہے۔
حیاتِ اکبر کے دوسرے دورِ حکمرانی کا اصل المیہ یہ ہے کہ بادشاہ کے زیادہ تر اور موثر ترین ارکانِ سلطنت یا تو غیر مسلم تھے یا وہ "مسلمان" جو اپنی خاص مصلحتوں کی بنا پر اُسے اسلام سے قطعی دُور رکھنا چاہتے تھے۔ واقعات کی رفتار کے تسلسل سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب رہے اور بادشاہ کو اسلام اور اس کے احکام و اوامر سے بہت دُور لے گئے۔ بلاشبہ اس دَور میں بھی اکبر کے دربار میں اور مختلف بلاد و امصار کے اہم مناصب پر اسلام کا صحیح درد رکھنے والے امرا و علما متعین تھے، لیکن ان کی آواز بہت حد تک بے اثر ہو کر رہ گئی تھی۔

تیسرا اور آخری دَور

اب اکبر کی مذہبی زندگی کا تیسرا دَور شروع ہوتا ہے، جسے آخری دَور کہنا چاہیے۔
اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ دربار پر پابندِ شرع ارکانِ سلطنت قابض ہیں اور خود بادشاہ کا

اسلوبِ فکر اور طرزِ حیات بھی بدلا ہوا ہے۔ یا ممکن ہے بادشاہ میں ابھی اتنی ذہنی تبدیلی نہ آئی ہو، لیکن ارکانِ حکومت یقیناً بدلے ہوئے ہیں۔ پہلے ارکانِ حکومت اور مشیرانِ بادشاہ یا تو موت سے ہم کنار ہو گئے ہیں یا اپنا اثر و رسوخ کھو چکے ہیں۔

اکبر کے اس آخری عہد میں اس کا رضاعی بھائی خانِ اعظم مرزا عزیز کوکہ وکیلِ مطلق اور امیر الامرا تھا۔ دربار کا یہ سب سے با اثر اور صاحبِ اقتدار امیر تھا۔ بادشاہ کی مہر اسی کی تحویل میں تھی۔ ایک اور رکنِ سلطنت بخشی الملک نواب مرتضیٰ خاں شیخ فرید تھا جو بڑا معاملہ فہم، دیانت دار اور بہادر تھا۔ اکبر اس پر بہت اعتماد کرتا تھا، دین و مذہب سے انتہائی وابستگی رکھتا تھا۔ لاہور کا گورنر قلیچ خاں بڑا ہی پابندِ شرع اور متدین امیر تھا۔ اس کی ایک بیٹی اکبر کے بیٹے دانیال کے عقد میں تھی۔ مرزا عبد الرحیم خان خاناں دکن میں تھا، یہ کسی قدر آزاد منش امیر تھا۔ لیکن خواجہ باقی باللہ کا مداح تھا اور ذہنی طور پر اُن امرائے اکبری سے تعلق رکھتا تھا، جو حالات کا صحیح طور سے جائزہ لینے کے عادی تھے اور معاملات کو اعتدال کے دائرے میں رکھنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں اور بھی بہت سے امرا و علما موجود تھے، جن سے اکبر متاثر ہوا۔ اور حالات کی رفتار میں تبدیلی پیدا ہوئی۔

اکبر کی ذہنی تبدیلی کا ثبوت اس واقعے سے بھی ملتا ہے کہ خواجہ خاوند محمود المعروف بہ حضرت ایشاں (المدفون لاہور) بادشاہ کے آخری عہد میں آگرہ گئے۔ ان کے صاحب زادے خواجہ معین الدین کشمیری اپنی تصنیف مرآۃ طیبہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت ایشاں آگرہ پہنچے تو خانِ اعظم سمیت کئی امرا ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئے۔ شاہی خاندان کی متعدد خواتین نے بھی ان کی بیعت کی۔ ان خواتین میں ایک سلیمہ سلطان بیگم تھیں جو اکبر کے حرم میں تھیں، دوسری گلرخ بیگم تھیں، جن کی بیٹی سے اکبر نے اپنے بیٹے سلیم کی شادی کر دی تھی۔ گلرخ بیگم نے فرطِ عقیدت سے حضرتِ ایشاں کے لیے ایک جامہ اس انداز سے سی کر دیا کہ ایک ایک ٹانکے پر کلمہ شریف پڑھا گیا۔ خواجہ معین الدین بیان کرتے ہیں کہ اکبر نے حضرت ایشاں خواجہ خاوند محمود سے اپنی فلاح کے لیے دعائے خیر

(فاتحہ) کی درخواست کی۔[۹]

فیضی وفات پا چکا تھا۔ طریقۂ اکبری کے مطابق ابوالفضل کو بادشاہ کے خلیفۂ اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور دربار میں اکبر کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ اعتماد شاید ابوالفضل ہی تھا۔ لیکن آخری عہد میں حالات بالکل بدل چکے تھے۔ اکبر اور ابوالفضل میں اس انداز سے باہمی بدگمانیوں نے جنم لیا کہ دونوں ایک دوسرے سے دُور ہو گئے اور ابوالفضل نے دربار جانا بند کر دیا۔ بلکہ اس دوران وہ خودکشی کرنے یا خانہ بدوش ہو جانے کے بارے میں بھی غور کرتا رہا۔ دربارِ اکبری کے جو ارکان ابوالفضل کے اثر و رسوخ اور طرزِ عمل سے پریشان تھے، انھوں نے جہاں گیر کو بھی واقعات کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا تھا۔ جہاں گیر نے ابوالفضل کے بارے میں بعض ایسی باتیں بادشاہ کے گوش گزار کیں کہ بادشاہ ان سے متاثر ہو گیا اور جہاں گیر کو حق بجانب ٹھہرایا۔ اب ابوالفضل نے دربار جانا بالکل بند کر دیا۔ لیکن بعد کو پھر آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ان دنوں ابوالفضل کے زیادہ مخالفوں میں خانِ اعظم اور شیخ فرید شامل ہیں، خود جہاں گیر بھی اس کا شدید مخالف تھا، اور اس کی مخالفت سب سے زیادہ مؤثر اور ابوالفضل کے لیے اذیت رساں تھی۔

اس سے دو تین سال بعد دربار کے متشرع ارکان کی مخالفتوں کی بنا پر ابوالفضل کو دکن بھیجا گیا۔ وہاں کچھ عرصہ بعد بادشاہ بھی گیا تو دونوں کی ملاقاتیں ہوئیں۔ محاصرۂ اسیر گڑھ کے موقع پر بھی ابوالفضل بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اسیر گڑھ کی فتح کے بعد اکبر وہاں سے رخصت ہونے لگا تو خان خاناں نے جو دکن کی مہم پر مامور تھا، بادشاہ سے درخواست کر کے ابوالفضل کو وہیں روک لیا۔ اکبر تو آگرہ آ گیا، بعد میں خان خاناں نے ابوالفضل کو نہایت پریشان کیا۔ اس پریشانی کا اظہار وہ صاف الفاظ میں اپنے مکتوبات (رقعاتِ ابوالفضل) میں کرتا ہے۔ قیامِ دکن کے دَور میں اپنی مختلف ذہنی پریشانیوں کا اظہار، اُن مکتوبات میں بھی کرتا ہے جو اس نے شاہ زادوں، شاہ زادیوں، بادشاہ

---

[۹] رودِ کوثر، ص ۱۴۰۔ بحوالہ مرآۃِ طبیہ۔

کی بیوی اور والدہ کے نام لکھے ۔ وہ ان سے درخواست کرتا ہے کہ بادشاہ سے کہو کہ وہ اُسے دکن سے واپس بلالے ۔ ایک خط میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ میں کئی درخواستیں بادشاہ کی خدمت میں لکھ چکا ہوں، لیکن خان خاناں کے وہ حامی جو دربار میں موجود ہیں میری درخواستیں بادشاہ تک نہیں پہنچنے دیتے ۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ میں بادشاہ کو بڑا تاکید سے لکھتا ہوں کہ سپہ سالار اور سرداروں کے تبادلے کیے جائیں، لیکن بخشی الملک شیخ فرید خاں اس کے خلاف مشورہ دیتا ہے اور اس کا مشورہ مان لیا جاتا ہے میرا مشورہ مسترد کر دیا جاتا ہے

اب ابوالفضل ایک سخت مصیبت سے دوچار ہوتا ہے جو اس کی زندگی کی آخری مصیبت ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے ۔ جہاں گیر کی اپنے باپ اکبر سے مخالفت ہو گئی، جو یہاں تک پہنچی کہ جہاں گیر نے الہ آباد میں بیٹھ کر اپنی بادشاہت کا سامان فراہم کر لیا ۔ دربار کے کئی بااثر امرا جو اکبر کے خیالات سے متفق نہ تھے اور جہاں گیر سے ذہنی طور پر ہم آہنگ تھے، ان کی ہمدردیاں ظاہر ہے، جہاں گیر کے ساتھ تھیں ۔ ان حالات میں اکبر کو ابوالفضل کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے ابوالفضل کو لکھا کہ اپنا کام اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے سپرد کر کے فوراً آگرے پہنچ جاؤ ۔ اکبر کے اس پیغام کی اطلاع کسی نے جہاں گیر کو بھی دے دی ۔ اسے خدشہ ہوا کہ اگر ابوالفضل دربار میں چلا گیا تو کئی مشکلات پیدا ہوں گی ۔ اس نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے بندھیلہ کے راجا نرسنگھ دیو کو لکھا کہ ابوالفضل دکن سے آگرہ جاتے ہوئے تمھارے علاقے سے گزرے گا، جس طرح ممکن ہو، اس کو ختم کر دو، اس کے بدلے میں تمھیں بڑی مراعات دی جائیں گی ۔ چنانچہ اس نے تین چار ہزار افراد پر مشتمل فوج لے کر ابوالفضل کا راستہ روک لیا ۔ ادھر ابوالفضل کے ساتھ بھی ایک مسلح جماعت تھی، مقابلہ ہوا ۔ ابوالفضل مارا گیا، اس کا سر جہاں گیر کے پاس بھیجا گیا اور جسد گوالیار میں دفن کر دیا گیا ۔ اس طرح ابوالفضل اپنے انجام کو پہنچا ۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اکبر کے آخری دور میں بھی اس کے

مذہبی افکار میں بتدریج تبدیلی پیدا ہوئی۔ پہلے اکبر کا ذہن تو شاید نہ بدلا ہو لیکن اس کے درباری امرا اور ارکانِ سلطنت ضرور بدل گئے تھے اور وہ، وہ نہ رہے تھے جو مذہب یا بالفاظ دیگر اسلام سے برگشتہ تھے۔ اس کا اندازہ مسٹر سی۔ ایچ پین کی تصنیف "اکبر اینڈ دی جیسوٹس"، کے اس اقتباس سے ہوتا ہے جو ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے درج کیا ہے۔ مسٹر پین کا بیان ہے، گو اسے اکبر کے دربار میں تین مرتبہ پادری بھیجے گئے۔ دوسری مرتبہ جو مشن یہاں آیا وہ ناکام رہا، اس ناکامی کا ذکر اس نے اپنی رپورٹ میں کیا ہے۔ مسٹر پین اس رپورٹ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس سے واضح ہوتا ہے کہ خواہ پادریوں کے متعلق اکبر کا اپنا طرزِ عمل کچھ بھی ہو، اس کے امرا یقیناً ان کے مخالف تھے۔ بہت ممکن ہے کہ پادریوں نے اس خوش اخلاقی اور تدبّر کا ثبوت نہ دیا ہو، جس کی صورتِ حال متقاضی تھی اور نتیجۃً امرا کی مخالفت اس حد تک بڑھ گئی کہ مشن کو جاری رکھنا بے سود ہو گیا۔[۱]

یہی مصنف ایک پرتگیز پادری زیویر کا واقعہ بھی بیان کرتا ہے کہ اس نے دربار میں تقریر کی تو دربار میں بیٹھے ہوئے مسلمانوں نے اس پر نہایت خفگی کا اظہار کیا، کیوں کہ اکبر کے مذہبی خیالات خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اس کے آخری عہد میں دربار اور معاملاتِ سلطنت پر باشرع مسلمان امرا حاوی تھے اور وہ اسلامی مفاد کے تحفظ کی پوری کوشش کرتے تھے۔ مسٹر پین کے الفاظ کا خلاصہ شیخ محمد اکرام نے ان الفاظ میں درج کیا ہے:

بہت سے درباری مسلمان جو اس وقت بادشاہ کے ساتھ تھے، پادری کی تقریر پر بہت بگڑے اور ان میں سے ایک نے جو پادری کا دوست تھا، اسے سمجھایا کہ جب وہ شریعتِ اسلامی کا ذکر کرے تو اُسے زیادہ سے زیادہ احتیاط اور ادب کا ثبوت بہم پہنچانا چاہیے۔ اس درباری مسلمان نے کہا، یہاں مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں، جب تم شریعتِ اسلامی کی مذمّت

---

[۱] رودِ کوثر، ص ۱۳۸۔ بحوالہ اکبر اینڈ دی جیسوٹس، ص ۱۳۱

کرتے ہو تو وہ تمہارے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ میں اگرچہ تمہارا دلی دوست ہوں، مگر جب تم ہمارے نبی کی بے ادبی کرتے ہو تو میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے جسم میں خنجر بھونک دوں۔[۱۱]

واقعات کی مختلف کڑیاں ملانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں ذاتی طور پر اکبر بھی بالکل بدل گیا تھا اور ذہنی اور قلبی طور پر اسلام سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ جہانگیر کی چھوٹی تزک[۱۲] میں مرقوم ہے کہ اکبر نے بوقتِ موت کلمہ شہادت پڑھا، سورۂ یٰسین پڑھا کر سنی اور ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے موت کی آغوش میں گیا۔ اس موقع پر شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ اس اندراج کی صحت مشتبہ ہے، لیکن سفیرِ انگلستان سر طامس واڈ اس واقعہ کے پندرہ بیس سال بعد ہندوستان آیا تھا، اس نے مقامی حالات کے متعلق ایک تفصیلی خط انگلستان کے لاٹ پادری کو لشکرِ شاہی سے لکھا تھا۔ اس خط میں وہ لکھتا ہے کہ اکبر کی وفات ایک مسلمان کی حیثیت سے ہوئی۔

اسی طرح پرتگیز پادری جو بوٹیلو کے نام سے موسوم تھا، بیجاپور کے عادل شاہی[۱۳] بادشاہ سے ملا، بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ اکبر کس مذہب پر مرا، تو پادری نے بڑے افسوس سے جواب دیا کہ میری خدا سے التجا تھی کہ ایسا نہ ہوتا۔ لیکن اکبر ہمیں غلط امیدیں دلاتا رہا اور بالآخر آپ کے دینِ محمدی پر ہی مرا۔

۱۱؎ رود کوثر، ص ۱۳۸۔ بحوالہ اکبر اینڈ دی جیسوٹس، ص ۸۴۔

۱۲؎ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں، اس نسخے کی تاریخی حیثیت مشتبہ ہے، لیکن چھوٹی تزک ہے بہت پرانی۔ اس کے عہدِ شاہجہانی کے متعدد قلمی نسخے ملتے ہیں۔ مآثر الامرا اور دربارِ اکبری کے مصنف نے اس پر بڑا بھروسا کیا ہے۔

۱۳؎ عادل شاہی سلطنت کا پایۂ تخت بیجاپور تھا۔ اس کے مؤسسِ اعلیٰ کو تاریخ میں یوسف عادل شاہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جس نے ۸۹۰ھ میں اس کی بنیاد رکھی۔ کم و بیش دو سو سال تک عادل شاہی سلاطین دکن کے بڑے حصے پر قابض رہے۔ ۱۰۴۵ھ میں شاہجہان نے اس کو دہلی کا باج گزار بنایا۔ ۱۰۹۸ھ میں اورنگ زیب عالمگیر نے اس کو سلطنتِ مغلیہ میں ضم کر لیا۔

اکبر کی وفات کے وقت پرتگیز پادری آگرہ میں موجود تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اکبر کو مرتے وقت ہی بپتسمہ دے لیں، اسی لیے وہ لمحہ لمحہ کی خبر منگاتے رہتے تھے۔ مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کسی کے الحاد و زندقہ پر زور دیں یا اسے جہنمی بنانے پر اصرار کریں۔ ہمارے نزدیک اکبر زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونے کی وجہ سے ذہنی انتشار اور فکری پراگندگی کا شکار ہو گیا تھا اور اس میں تغیّر احوال کے ساتھ ساتھ تغیّر افکار بھی ہوتا رہتا تھا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آخری دنوں میں وہ اسلام کی حقانیت پر ایمان لے آیا تھا اور مسلمان کی حیثیت سے اس دنیا سے رخصت ہوا تو ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ پھر اس کے اسلام کی شہادت، ایک ایسا گروہ دیتا ہے جو نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسلام سے بہرہ مند ہو۔ کسی کی سچائی پر مخالف کی گواہی اپنے اندر ایک خاص وزن رکھتی ہے، بہرکیف موت کے بعد اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو گیا۔ وہی نیتوں کو جاننے والا ہے۔

اکبر کے آخری دور کے امرائے سلطنت پکے مسلمان تھے اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت ان کا بنیادی مقصد تھا۔ وہ اکبر کا جانشین بھی اسی شخص کو بنانا چاہتے تھے جو ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا خواہاں ہو۔ چنانچہ یہی وعدہ لے کر انھوں نے جہانگیر کو تخت سلطنت پر متمکن کیا۔

اکبر اینڈ دی جیسوئٹس کا مصنف لکھتا ہے:

امرائے مملکت نے بالآخر فیصلہ کیا کہ حکومت اسی کو دینی چاہیے جو اس کا قانوناً حق دار ہے۔ چنانچہ ایک برگزیدہ امیر (یعنی شیخ فرید) جسے دوسرے امرا نے اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، شاہزادہ جہانگیر کے پاس آیا اور امرا کی طرف سے اسے کہا کہ ہم سب آپ کی بادشاہت کی حمایت کریں گے، بشرطیکہ آپ اس بات کی قسم اٹھائیں کہ آپ شرع محمدی کا تحفظ کریں گے اور اپنے بیٹے (خسرو) یا اس کے حامیوں

---

۶۲ کوثر، ص ۱۶۰۔ بحوالہ اکبر اینڈ دی جیسوئٹس۔

کو کوئی سزا نہ دیں گے۔ شاہ زادے نے ان شرائط کو پورا کرنے کی قسم کھائی اور بہت سے محافظوں کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کو گیا [۱۵]

علمی خدمات

اکبر کے مذہبی خیالات سے اختلاف کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا دورِ علم و فن کے اعتبار سے انتہائی زرخیز تھا۔ بے شمار علما و فضلا جو مروجہ علوم میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے، دربار میں موجود تھے اور ملک کے مختلف علاقوں اور صوبوں میں بھی اہلِ علم بہت بڑی تعداد میں علمی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان میں اکثر حضرات کو دربار کی بحثوں اور چپقلشوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں مدارسِ دینی قائم تھے، جن میں اناضلِ روزگار کا غلغلۂ تدریس زوروں پر تھا۔ مثلاً دہلی، آگرہ، احمد آباد، جون پور لاہور، ملتان، سیالکوٹ، سرہند وغیرہ بلاد و امصار اور قصبات میں مشہورِ زمانہ حضرات علما نے تشنگانِ علوم کی علمی تشنگی بجھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ علاوہ ازیں ملک میں روحانیت کا چشمۂ فیض بھی جاری تھا۔ اس دور کے اصحابِ علم، ایک طرف اگر مسندِ درس و تدریس پر فائز تھے تو دوسری جانب مسندِ رشد و ہدایت پر بھی متمکن تھے، یعنی بیک وقت وہ فکری نشو و نما کا سامان بھی فراہم کرتے تھے اور روحانی اصلاح کا اہتمام بھی فرماتے تھے۔ ان علما و صلحا میں حضرت مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، خواجہ باقی باللہ، شیخ نور الحق دہلوی، شیخ میر فتح اللہ شیرازی وغیرہ کے اسمائے گرامی خصوصیت سے لائقِ تذکرہ ہیں۔ ان کے علاوہ صدر الصدور شیخ عبدالنبی گنگوہی، مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری، مولانا حاتم سنبھلی اور دیگر بہت سے علما تھے، جن میں بعض شاہی خدمات پر بھی مامور تھے، اور ساتھ ہی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے مشاغل بھی جاری رکھتے تھے۔ عہدِ اکبری میں ایک عالمِ دین مولانا علاء الدین لاری تھے، جنھوں شرح عقائد نسفی پر حواشی تحریر کیے۔ پہلے یہ جون پور میں

---

[۱۵] ص ۲۰۴

خان زمان کے پاس مصروفِ تدریس تھے۔ بعدازاں آگرہ تشریف لے آئے تھے۔ درس و تدریس کا شوق ان پر اتنا حاوی تھا کہ آگرہ میں ایک چھپر ڈال کر مدرسہ قائم کر لیا تھا اور اسی میں تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد حج کے لیے تشریف لے گئے اور اسی سفر میں سفرِ آخرت کو روانہ ہو گئے۔ اس دور میں سرزمین کشمیر کو بھی اصحابِ علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور مختلف مقامات پر اہلِ فضل و کمال نے تصنیفی اور تدریسی مسندیں آراستہ کر رکھی تھیں۔ ان سب کا اقتصا ان سطور میں ممکن نہیں۔

عہدِ اکبری میں بادشاہ کے حکم سے یا خاص دربار سے تعلق رکھنے والے اہلِ علم کی طرف سے تصنیف و ترجمے کی جو خدمات انجام دی گئیں، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ **مہابھارت** : یہ ہندوؤں کی مشہور کتاب ہے۔ اس کا سنسکرت سے فارسی میں رزم نامہ کے نام سے ترجمہ کیا گیا۔ یہ کام ۹۹۰ھ سے ۹۹۵ھ تک نقیب خاں، مُلّا عبدالقادر بدایونی، مُلّا شیری اور حاجی سلطان تھانیسری نے مکمل کیا۔

۲۔ **رامائن** : یہ بھی ہندوؤں کی معروف کتاب ہے۔ اس کو ۹۹۵ھ سے ۹۹۹ھ تک مُلّا عبدالقادر بدایونی نے سنسکرت سے فارسی زبان میں منتقل کیا۔

۳۔ **سنگھاسن بتیسی** : "خرد افزا" کے نام سے عبدالقادر بدایونی نے اس کو ۹۸۲ھ میں فارسی کے قالب میں ڈالا۔

۴۔ **حیٰوۃ الحیوان** : یہ دمیری کی مشہور کتاب ہے اور عربی زبان میں ہے۔ مُلّا مبارک نے ۹۸۳ھ کو اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

۵۔ **اتھربن** : یہ ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتاب اور چوتھا وید ہے۔ اس کے بعض احکام اسلام کے مطابق ہیں۔ دکن کا ایک ہندو پنڈت بھاون، جو لکھا پڑھا اور عاقل و فہیم شخص تھا، مسلمان ہو کر دربار میں آیا تو اس نے بادشاہ کو اس کتاب کے مندرجات سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی فارسی میں ترجمہ کرنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے عبدالقادر بدایونی، فیضی اور حاجی ابراہیم سرہندی کو اس کام پر مامور کیا۔ یہ ترجمہ ۹۸۳ھ میں کیا گیا۔

۶- تزکِ بابری : یہ مغل حکمران ظہیر الدین بابر کی سرگزشت ہے۔ اصل کتاب ترکی زبان میں تھی۔ ۹۹۸ھ کو عبدالرحیم خان خاناں نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

۷- انجیل : ابوالفضل نے ۹۸۳ھ میں اس کو فارسی زبان میں منتقل کیا۔

۸- لیلاوتی : ہندوؤں کے فنِ ریاضی کی کتاب ہے۔ فیضی نے فارسی میں منتقل کی۔

۹- ہربنس : کرشن جی کے حالات پر مشتمل ہے۔ مولانا شیری نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۰- معجم البلدان : شہاب الدین عبداللہ یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) کی شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ ملّا احمد ٹھٹھوی، قاسم بیگ، شیخ منور اور عبدالقادر بدایونی نے ۹۹۹ھ میں اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۱- تاجک : علومِ نجوم کی ایک کتاب ہے۔ مکمل خاں گجراتی نے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۲- تاریخِ کشمیر : کشمیر کے حالات میں سنسکرت کی ایک مشہور کتاب راج ترنگنی کے نام سے سلطان زین العابدین کے عہد میں تصنیف کی گئی۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے اس کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ پھر ملّا عبدالقادر بدایونی نے ۹۹۹ھ میں سلیس فارسی میں منتقل کیا۔

۱۳- کلیلہ دمنہ : سنسکرت کا ایک قدیم قصہ ہے۔ ابوالفضل نے ۹۹۶ھ میں اس کا "عیارِ دانش" کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۱۴- نل دمن : ۱۰۰۳ھ میں فیضی نے ہندوستان کی یہ مشہور عشقیہ داستان جو چار ہزار دو سو اشعار پر مشتمل مثنوی ہے، خسرو کی لیلی مجنوں کی بحر میں تصنیف کی۔

۱۵- جامع رشیدی : عبدالقادر بدایونی نے ۹۹۳ھ کو اسے عربی سے فارسی میں منتقل کیا۔

۱۶- بحرالاسمار : یہ ہندی افسانے کی کتاب ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے ۱۰۰۴ھ

میں اس کو فارسی کے قالب میں ڈھالا۔

۱۷۔ تاریخ الحکما : یہ شہرزاری کی تصنیف ہے۔ مقصود علی تبریزی نے "نزہۃ الارواح" کے نام سے اس کو لباسِ فارسی پہنایا۔

۱۸۔ زیج مرزانی : سنسکرت سے فارسی میں اس کا ترجمہ میر فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل، کشن جوتشی، گنگادھر، مہیش مہانند نے کیا۔

۱۹۔ کتاب الاحادیث : یہ کتاب فن تیراندازی سے متعلق ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے ۹۷۶ھ میں لکھی تھی۔ ۹۸۶ھ کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

۲۰۔ تاریخ الفی : یہ نقیب خاں، شاہ فتح اللہ، حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی، نظام الدین احمد، عبدالقادر بدایونی، مُلّا احمد ٹھٹھوی، جعفر بیگ اور آصف خاں کی مشترکہ تصنیف ہے۔ ۹۹۰ھ میں اس کی تصنیف کا آغاز ہوا، ۱۰۰۰ھ میں عبدالقادر بدایونی نے نظرثانی کر کے اسے مکمل کیا۔

۲۱۔ اکبرنامہ : یہ ابوالفضل کی تصنیف ہے۔ اس کی تیسری جلد آئین اکبری کے نام سے معروف ہے۔

۲۲۔ نجات الرشید : ملا عبدالقادر بدایونی کی تصنیف ہے۔

۲۳۔ طبقاتِ اکبری : مرزا نظام الدین احمد کی تصنیف ہے۔

۲۴۔ سواطع الالہام : فیضی کی بے نقط تفسیر، جو ۱۰۰۲ھ کو لکھی گئی۔

۲۵۔ موارد الکلم : فیضی کی بے نقط تصنیف ہے۔

۲۶۔ مرکزِ ادوار : فیضی کا مجموعہ اشعار۔ مرتبہ ابوالفضل

۲۷۔ کشکول : ابوالفضل کی منتخب کردہ تحریریں۔

۲۸۔ جوتش : خان خاناں نے جوتش پر مثنوی لکھی تھی، جس کے ہر شعر میں ایک مصرع فارسی کا اور دوسرا سنسکرت کا تھا۔

۲۹۔ ثمرۃ الفلاسفہ : اصل کتاب یونانی زبان میں تھی۔ عبدالستار بن قاسم نے ۱۰۱۱ھ میں یونانی زبان سے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا۔ اس نے یہ کتاب ایک یونانی

پادری سے حاصل کی تھی۔ اس میں روما کی تاریخ اور مشاہیر اہلِ کمال کا ذکر ہے۔

۳۰۔ خیر البیان : یہ پٹھانوں کے ایک قبیلے کے پیر تاریک (یعنی روشن پیر) کی تاریخ ہے۔

۳۱۔ ہمایوں نامہ : اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم نے لکھا جو بڑی عالمہ و فاضلہ خاتون تھیں۔

ان کتابوں سے واضح ہوتا ہے کہ دورِ اکبری کے علما کو عربی، فارسی، کشمیری، سنسکرت، یونانی وغیرہ زبانوں پر اس درجہ عبور حاصل تھا کہ وہ نہایت آسانی سے ایک زبان کے مشکل مضامین، پیچیدہ مباحث اور دقیق مسائل کو دوسری زبان میں منتقل کرنے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔

اکبر کا معمول تھا کہ وہ عام طور پر رات کو مختلف مضامین پر مشتمل کتابیں اہلِ علم سے سنتا تھا۔ بعض دفعہ تو پوری پوری رات کتابیں سننے اور پڑھنے میں گزر جاتی تھی۔ پھر انھیں وہ اہتمام کے ساتھ شاہی کتب خانے میں جمع کرلیتا تھا۔ مذکورہ بالا کتابیں بھی اس نے مختلف اہلِ علم سے جن میں ملّا عبدالقادر بدایونی بھی شامل ہیں، باقاعدہ سُنی تھیں اور بعد میں ان کو فارسی میں منتقل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس سے اکبر کی وسعتِ معلومات کا پتا چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ عالم نہ ہونے کے باوصف علمی ذوق کا حامل تھا۔

عہدِ اکبری کی کتبِ تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ اکبر کو اپنی کم علمی کا بہت احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے معلومات میں اضافے کے لیے مختلف مضامین سے متعلق کتابوں کی سماعت کا باقاعدہ ایک سلسلہ شروع کررکھا تھا۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں ان کتابوں کی فہرست درج کی ہے، جنھیں اکبر اہلِ علم سے پڑھوا کر سنا کرتا تھا۔ ان کتابوں میں تصوّف، تاریخ، اخلاق، ادب، مسائلِ فقہ، حرب وضرب وغیرہ سے متعلق مشہور اہلِ علم کی ہندی، یونانی، عربی، فارسی، کشمیری اور دیگر زبانوں کی معروف تصنیفات شامل ہیں۔ مثلاً کیمیائے سعادت، اخلاقِ ناصری، گلستان، بوستان

شاہ نامہ، قاموس نامہ، مثنوی مولانا روم، مکتوبات شرف منیری، کلیات امیر خسرو، تالیفات ملا جامی، جام جم، دیوان انوری، خمسۂ شیخ نظامی اور حدیقہ وغیرہ اکبر کے سامنے پڑھی گئیں اور اس نے اس کے مندرجات سے استفادہ کیا:

وہر کتابے را از آغاز تا بانجام بشنوند، و ہر روز کہ بداں جا رسد بشمارۂ آں ہندسہ بقلم گوہر بار نقش کنند، و بعدد اوراق خوانندہ را نقد از زر سرخ و سفید بخشش شود۔ کم کتابے مشہور بود کہ مذکور محفل ہمایوں نہ گردد[16]

وہ (اکبر) ہر کتاب شروع سے آخر تک سنتا، اور روزانہ جس ورق تک سن لیتا ہو، پر اپنے قلم سے نشان لگا دیتا۔ اوراق کے حساب سے پڑھنے والے کو سونے چاندی کے (مروجہ) سکے عنایت کرتا۔ کوئی کم ہی مشہور کتاب ہو گی جس کا ذکر بادشاہ کی مجلس میں نہ ہوا ہو۔

دور اکبری میں ترجمہ و تصنیف سے متعلق جو خدمات انجام دی گئیں، سطور بالا میں ایک خاص تعداد کے ذریعے اختصار کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اس کے عہد میں اور بھی بہت سی کتابیں معرض تصنیف میں آئیں۔ جو اب بھی موجود ہیں اور اہل علم ان سے مستفید ہوتے ہیں۔

اس کے عہد میں، فتح گجرات کے بعد بے شمار علما ملک کے مختلف حصوں سے گجرات گئے اور وہاں اشاعت علم کی۔ گجرات اگرچہ پہلے سے علم و فضل کا مرکز تھا، مگر اکبر کی فتح کے بعد اس کی علمی رونق میں مزید اضافہ ہوا۔ اسی طرح بہت سے علما گجرات سے خطۂ ہند کے دیگر علاقوں میں گئے اور وہاں تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کی مسندیں بچھائیں۔

پھر ان علما و مصنفین اور مدرسین و مبلغین کی ایک کثیر تعداد ملک کے مختلف علاقوں میں موجود اور مصروف اشاعت دین تھی، جن کا دربار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان حضرات کا دائرہ اثر بہت وسیع تھا۔

---

[16] آئین اکبری، ج ۱، ص ۷۶۔

وفات

جلال الدین محمد اکبر، ۲ ربیع الاول ۹۴۹ھ کو پیدا ہوا۔ ۲ یا ۷ ربیع الثانی ۹۶۳ھ کو ہندوستان کا تاج شاہی سر پر رکھا۔ پچاس سال سے کچھ زائد عرصہ حکومت کر کے ۱۳ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۴ھ کو وفات پائی اور اپنے دارالسلطنت آگرہ میں سکندرہ کے مقام پر مدفون ہوا۔

اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی تو فقہائے ہند کی جلد چہارم کے حصہ دوم کے مقدمے میں، جہانگیر اور شاہ جہان کی زندگی کے علمی، دینی اور مذہبی پہلوؤں کی وضاحت کی جائے گی۔ ان شاء اللہ العزیز — وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔ — ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

بندۂ عاجز
محمد اسحاق بھٹی
جمعۃ المبارک
۲۲ جمادی الاخریٰ، ۱۳۹۷ھ
۱۰ جون ۱۹۷۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گیارھویں صدی ہجری

حصہ اوّل

الف

۱۔ مفتی آدم بن محمد گوپاموی

مفتی آدم بن محمد بن خواجہ بن شیخ بن آدم شہابی صدیقی گوپاموی، شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی اولاد سے تھے، جو اپنے دور کے مشہور عالم دین اور نامور بزرگ تھے۔ ۹۱۱ھ کو ہندوستان کے صوبہ یو پی کے مردم خیز شہر، گوپامئو میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں جون پور کو علم و علما کے عظیم مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور ایک عرصے سے وہاں درس و تدریس کی مسندیں آراستہ تھیں۔ مفتی موصوف نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو جون پور کا قصد کیا اور شیخ معروف بن عبدالواسع حسینی بخاری جون پوری کے حلقہ درس میں شمولیت اختیار کی۔ ان سے مروّجہ علوم درسیہ بھی حاصل کیے اور تصوّف و طریقت سے بھی بہرہ یاب ہوئے اور علوم میں اس درجہ مہارت پیدا کی کہ اپنے عصر کے مشاہیر فقہائے حنفیہ میں ان کا شمار ہونے لگا اور وقت کے بہت بڑے شیخ اور عالم کبیر گردانے گئے، یہاں تک کہ اپنے شہر گوپامئو کے منصب افتا پر فائز ہوئے اور پھر اسی شہر میں عرصے تک درس و تدریس کا ہنگامہ بپا کیے رکھا۔ اس اثنا میں بے شمار اہل علم ان سے مستفید ہوئے اور طلبا کی کثیر تعداد نے کسب فیض کیا۔ تخت ہند پر اس زمانے میں مغل حکمران ظہیر الدین بابر متمکن تھا۔ وہ مفتی آدم بن محمد کا بہت قدر دان تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ۹۳۰ھ میں ان کو معاشی تکفل کی غرض سے ایک قریہ عطا کیا۔ مفتی ممدوح نے نوّے[۹۰] سال عمر پا کر ۱۰۰۱ھ میں وفات پائی۔

---

[۱] نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲، ۳

۲- شیخ ابراہیم محدّث اکبر آبادی

شیخ ابراہیم بن داؤد قادری اکبر آبادی، ان کی کنیت ابوالمکارم تھی اور رضائی تخلّص کرتے تھے۔ مانک پور میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اساتذۂ عصر سے اخذِ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عازمِ بغداد ہوئے اور وہاں ڈھائی سال قیام پذیر رہے۔ اس اثنا میں علومِ تفسیر و حدیث کی تکمیل کی۔ بعد ازاں حرمین شریفین کے لیے رختِ سفر باندھا اور حج و زیارت کا شرف حاصل کیا۔ پھر مصر گئے اور قاہرہ میں اقامت گزین ہوئے۔ قاہرہ میں شیخ شمس الدین علقمی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے اخذِ حدیث کیا اور شیخ محمد بن ابوالحسن بکری شافعی سے سند و اجازہ حاصل کیا۔ وہاں سے مکہ مکرمہ کو مراجعت کی اور شیخ عبدالرحمٰن بن فہد مغربی، شیخ مسعود مغربی اور شیخ علی بن حسام الدین متقی کے حلقۂ تلمذ میں شریک ہوئے اور ان تمام علمائے عظام نے ان کو باقاعدہ سند و اجازہ عطا فرمایا۔ مکہ معظمہ سے دوسری مرتبہ پھر مصر گئے، اور وہاں خود درس و تدریس کا آغاز کیا۔ سرزمینِ مصر میں پورے چوبیس سال مسندِ تدریس پر فائز رہے۔ اس طویل مدت میں بے شمار علما و طلبا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے جنھوں نے ان کی صحبت میں رہ کر اپنی علمی تشنگی بجھانے کا سامان فراہم کیا۔ مصر کے دورانِ قیام میں ان کا یہ معمول رہا کہ ہر سال موسمِ حج میں مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے اور سعادتِ حج سے بہرہ اندوز ہوتے۔ چوبیس سال بعد دل میں جذبۂ حُبّ وطن نے کروٹ لی اور واپس ہندوستان تشریف لے آئے۔ یہاں آگرہ اکبر آباد (آگرہ) کو اپنا مسکن ٹھہرایا اور درس و افادہ اور وعظ و تذکیر کی مسند آراستہ کی۔ بے شمار لوگ ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر علم و ادراک کی دولتِ بے پایاں سے مالا مال ہوئے۔

شیخ ابراہیم کا زادبوم اگرچہ مانک پور تھا، لیکن دیارِ عرب سے واپسی کے بعد علمی و تدریسی اعتبار سے اپنی بھرپور زندگی کا آخری دور چوں کہ اکبر آباد (آگرہ) میں

گزار اتھا، اور برسوں اس شہر میں تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھی تھیں، اس لیے اکبر آبادی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ وہ اپنے دَور کے بہت بڑے عالم، عظیم محدث، نامور فقیہ اور ماہرِ علومِ عربیہ تھے۔ ارضِ ہند میں علومِ دینیہ بالخصوص علمِ حدیث کی تدریس میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ علاوہ ازیں بہت نیک، عابد و زاہد اور متقی تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بڑے نیز تھے۔ غنا و سماع کی مجلسیں منعقد کرنا اور ان میں شامل ہونا اس زمانے کے اہلِ علم اور اصحابِ تصوّف میں عام طور پر مروّج تھا، مگر یہ ان سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور دامنِ علم و اتقا کو اس قسم کے غیر شرعی مراسم و عواطف سے کبھی آلودہ نہ ہونے دیا۔

شیخ ابراہیم کے قیامِ آگرہ کے زمانے میں جلال الدین اکبر تختِ ہند پر متمکن تھا، اس کا دار الحکومت بھی آگرہ تھا اور وہ بڑے رعب و دبدبہ اور جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ اس کے درباری امرا میں علمائے دین بھی شامل تھے، جو باقاعدہ دربار میں حاضر ہوتے اور بادشاہ کے حضور کورنش بجالاتے تھے، لیکن شیخ ابراہیم اس سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے اور ہر آن خدمتِ علم میں مصروف رہتے تھے۔ وہ اونچے درجے کے حق گو عالمِ دین اور صحیح معنوں میں احکامِ شرع کے مبلّغ تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ نے ان کو عبادت خانے میں تشریف لانے کی دعوت دی، شیخ گئے، بادشاہ موجود تھا، مگر اس کو مروّجہ درباری سلام نہیں کیا۔ اس مجلس میں بادشاہ کے سامنے ایک خطبہ دیا، جس میں اس کو امورِ شرع پر کاربند ہونے کی ترغیب دی، غیر شرعی افعال کے ارتکاب سے روکا، اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔

برِصغیر پاک و ہند کے اس جلیل القدر محدّث و فقیہ نے چھیاسی[۸۶] سال عمر پائی اور ۱۹ ذی الحجہ ۱۰۰۱ھ کو فوت ہوئے۔ ان کا مدفن آگرہ ہے[۱]

---

[۱] اذکارِ ابرار ص ۲۲۳ — منتخب التواریخ ص ۴۶۱ — تذکرہ علمائے ہند ص ۲۔
نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۴، ۵ — بوستانِ اخبار ص ۳۶ تا ۳۸۔

۳۔ قاضی ابراہیم بن محمد کالپوی

قاضی ابراہیم بن محمد پنواروی کالپوی موضع پنواری کے باشندے تھے جو اعمالِ کالپی میں واقع تھا۔ انھوں نے اپنے والد (قاضی محمد پنواروی) سے اخذِ علم اور کسبِ طریقت کیا اور اس عہد کے مشہور مدرس شیخ عبدالملک بن ابراہیم کالپوی سے ہدایہ پڑھا۔ حصولِ علم کے بعد اپنے قصبہ پنواری کی مسندِ تدریس پہ فائز ہوئے اور پھر عمر بھر درس تدریس اور افادۂ طلبا میں مصروف رہے ــــ اپنے وقت اور علاقے کے شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ فقہ، اصولِ فقہ اور علوم عربیہ میں یگانۂ روزگار تھے۔ صالح عالم دین، خوش خط اور فصیح البیان تھے۔ اندازِ گفتگو نہایت شیریں اور پُر تاثیر تھا۔ کسی مجلس میں زبان کو حرکت دیتے تو حسنِ بیان اور تاثر انگیزی میں سب سے سبقت لے جاتے۔ اپنے گوناگوں اوصاف کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت و محبت مرتسم ہو چکی تھی اور ہر حلقے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ــــ نسب الانساب کے نام سے فارسی زبان میں ان کی ایک کتاب بھی ہے، جس میں تفصیل کے ساتھ ماں اور باپ کی طرف سے اپنے آبا و اجداد کے انساب بیان کیے ہیں۔

گیارھویں صدی کے اس ہندی عالم دین اور معروف فقیہ نے ماہِ رمضان ۱۰۰۴ھ میں پنواری میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔[۳۱]

۴۔ سید ابراہیم غیاث پوری

سید ابراہیم نوری غیاث پوری، غیاث پور میں پیدا ہوئے۔ شیخ وقت، عالم دین اور محدث تھے۔ حدیث، فقہ اور تصوف کے نامور علما میں سے تھے۔ فقہ کی تعلیم لاہور میں شیخ اسحاق بن کاکو لاہوری کے مدرسے میں حاصل کی۔ پھر

۳۱ے اذکارِ ابرار ص ۴۴۳ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۷

ملتان گئے، وہاں شیخ کبیرالدین حسینی بخاری سے بیعت ہوئے، جو ایک صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ ملتان سے دہلی کا قصد کیا اور شیخ محمد غوث شطاری گوالیاری کی صحبت و ملازمت اختیار کی اور ان کی تصنیف "الجواہر الخمسہ" شیخ مبارک گوالیاری سے پڑھی۔ پھر حج بیت اللہ کے ارادے سے دہلی سے نکلے، لاہور اور ملتان آئے۔ وہاں سے شیراز اور پھر بغداد گئے۔ بغداد میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے سجادہ نشین شیخ زین العابدین حسنی بغدادی سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا۔ وہاں سے بلادِ شام اور بیت المقدس ہوتے ہوئے مصر پہنچے۔ مصر میں شیخ محمد بکری شافعی سے علومِ تفسیر و حدیث حاصل کیے اور عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے۔ مصر سے عازمِ مدینہ منورہ ہوئے، وہاں سے مکہ مکرمہ گئے اور سعادتِ حج حاصل کی۔ وہاں شیخ علی متقی کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے اور ان سے بعض اہم کتابوں کا درس لیا۔ پورے بارہ سال جبلِ ثور پر قیام فرما رہے، اس لیے ثوری مشہور ہوئے۔ پھر واپس ہندوستان آئے اور ۹۷۸ھ کو اوجین شہر میں سکونت اختیار کی۔

شیخ ابراہیم غیاث پوری متدین، عابد و زاہد، قانع و متوکل اور صاحبِ بصیرت بزرگ تھے۔ ان کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چلا اور نہ یہ معلوم ہو سکا ہے کہ انھوں نے کہاں مسندِ تدریس بچھائی اور کن کن لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ بلاشبہ یہ اپنے عصر کے محدث و فقیہ اور عابد و صوفی عالم تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے، سیر و سیاحت کے زیادہ شائق تھے اور علمائے دین کی خدمت میں حاضر رہنے اور ان سے استفادہ کرنے کے متمنی رہتے تھے، لہٰذا نہ کوئی کتاب تصنیف کر سکے اور نہ کہیں بیٹھ کر درس و افادہ کے مواقع میسر آئے۔ ان کا سلسلۂ نسب سید شاہ اجملی سامانوی ترمذی تک پہنچتا ہے۔ بارہ سال کی عمر میں گھر سے باہر نکلے۔ اس کے بعد تین مرتبہ اپنے وطن غیاث پور گئے۔ ایک دفعہ والدین سے ملنے کے لیے، دوسری مرتبہ والدہ کی وفات کے بعد، اور تیسری دفعہ والد کے انتقال کے بعد۔

گلزارِ ابرار کے مصنف محمد غوثی مانڈوی نے ۱۰۱۶ھ میں ان کے گھر جا کر ان کے حالات

معلوم کیے تھے۔ نہایت خود دار اور متوکل علی اللہ تھے۔ نہ ارباب حکومت اور اصحاب دولت کے پاس جاتے اور نہ ان سے کوئی چیز قبول کرتے۔ معلوم ہوتا ہے، انھوں نے ۱۱۰۱ھ کے بعد وفات پائی۔[۴]

۵۔ قاضی ابراہیم بیجاپوری

قاضی ابراہیم زبیری بیجاپوری، شیخ وقت، فاضل عصر، معرفت و ادراک میں یگانۂ روزگار، فقیہ، زاہد و متورع، بلند کردار اور عمدہ سیرت بزرگ تھے۔ علم و فضل کی فراوانیوں کے ساتھ ساتھ تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا اور یہ علم انھوں نے شیخ جان اللہ سہروردی بیجاپوری سے حاصل کیا تھا۔ طویل عرصہ تک بیجاپور کی مسندِ قضا پر متمکن رہے، اور فرائضِ قضا نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے۔

برصغیر پاک و ہند کے گیارھویں صدی ہجری کے اس ہمہ اوصاف موصوف عالم و فقیہ نے ۱۲ رجب ۱۰۹۴ھ کو بیجاپور میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔[۵]

۶۔ قاضی ابراہیم سندھی

قاضی ابراہیم ٹھٹھوی سندھی، شیخ محمد وم فیروز کے پوتے تھے۔ بہت بڑے عالم، شیخ اور فقیہ تھے۔ مغل حکمران شاہ جہان کی طرف سے دہلی کی مسندِ قضا پر متعین تھے۔ طویل عرصہ تک اس منصبِ بلند پر فائز رہے۔ پھر ان کو قاضی عساکر مقرر کر دیا گیا تھا ــــ ہندوستان کے قاضی القضاۃ بھی رہے، لیکن ساتھ ہی درس و افادہ کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

قاضی ابراہیم ٹھٹھوی سندھی اپنے دور کی عجیب و غریب شخصیت تھے۔ منقول ہے کہ

---

[۴] اذکارِ ابرار، ص ۵۵۵ تا ۵۵۷ ــــ نزہتہ الخواطر، ج ۵ ص ۸۔

[۵] روضتہ الاولیا ــــ نزہتہ الخواطر، ج ۵ ص ۹

کچھ مدت کے لیے ان کو ٹھٹھہ کے امین بھی مقرر کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں ان کی حویلی کی تعمیر پہ ڈیڑھ لاکھ روپے خرچ کیے گئے تھے، لیکن جب وہ آتے اور حویلی پر نظر ڈالی تو انھیں پسند نہ آئی۔ ٹھٹھہ کا حاکم جو ہفت ہزاری منصب کا حامل امیر تھا، ہفتے میں ایک دن قاضی ابراہیم کے گھر پہ آکر دربارِ عام منعقد کرتا تھا۔ قاضی ممدوح بھی ہفتے میں ایک روز اس کے گھر جاتے اور دوپہر سے شام تک وہاں قیام کرتے۔

قاضی ابراہیم سندھی سے چند دلچسپ اور تعجب انگیز روایات بھی منقول ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ایک روز وہ شیخ میرک کے مکان پر حاضر ہوتے، جو بادشاہ دین پناہ شاہجہان کے آخری ایامِ حکومت میں صدارت مطلق کے منصب پر سرفراز تھے۔ اس وقت وہاں علما کی مجلس منعقد تھی۔ وہ کہتے ہیں، جب میں وہاں جاکر بیٹھا تو اچانک ایک شخص سادہ لباس پہنے اور پیچدار عمامہ باندھے ہوئے مجلس میں داخل ہوا۔ شیخ میرک نے اس کی آمد پر تمام علما سے زیادہ اس کی تعظیم کی۔ پھر جب وہ جانے لگا تب بھی شیخ اس کی انتہائی تعظیم بجالائے۔ حاضرین مجلس نے شیخ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو جواب دیا کہ یہ شخص علوم نادرہ سے آگاہ ہے اور دنیائے جنّات کا مرشد ہے۔ قاضی ابراہیم کہتے ہیں، میں شیخ کی یہ بات سن کر تیزی کے ساتھ مجلس سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور التجا کی کہ کسی وقت مجھے ملاقات کا شرف بخشا جائے۔ انھوں نے مجھے اپنے گھر کا پتا دیا اور چلے گئے۔ تین چار روز بعد میں ان کے گھر گیا۔ اطلاع ملنے پر وہ بالاخانے سے جو ان کی خلوت گاہ تھا، نیچے آئے اور حال معلوم کر کے کہا۔ "بندہ کو کچھ کام ہے، چند ساعت بالاخانے پر تشریف رکھیے، فارغ ہو کر حاضر خدمت ہونے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔"

میں ابھی دو چار زینے ہی اوپر چڑھا ہوں گا کہ ایک شاندار محفل آراستہ دکھائی دی۔ سب نے میرا استقبال کیا اور مجھے مجلس کے صدر مقام پر بٹھایا۔ ان میں سے تین چار اشخاص نے ہاتھ میں کتابیں پکڑ رکھی تھیں اور درمیان میں ایک شخص مُطوّل کھولے بیٹھا تھا۔ ان دنوں ایک طالب علم نے مُلا سعدالدین تفتازانی پر اعتراض کیا تھا۔۔۔

اس مجلس میں اس شخص نے مطوّل کھولی تو وہی مقام سامنے آیا جو زیر بحث تھا۔ اب پڑھنے پڑھانے اور سننے والوں نے اس مقام کو حل کرنے کے لیے آپس میں بحث شروع کر دی۔ میں نے بھی کچھ دخل دیا۔ ہر علم کی بحث اور دلیل پیش ہوئی۔ یہ مجلس بھر دن تک جاری رہی ـــــ اچانک صاحبِ خانہ نمودار ہوئے اور سب نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ مَیں شوقِ استفادہ کے جذبے میں سب سے پہلے ان کے سامنے جا پہنچا ـــــ مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "بڑی تکلیف ہوئی آپ کو۔ میرا بڑا انتظار کرنا پڑا۔" میں نے جواب میں عرض کیا: "ان عزیزوں کی صحبت سے میں نے بہت استفادہ کیا ہے" ـــــ فرمایا: "کن عزیزوں کی صحبت سے؟" مَیں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو کوئی بھی نظر نہ آیا۔ فی الفور میرے جسم میں رعشہ طاری ہو گیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ شیخ نے پانی دم کر کے میرے منہ پر چھینٹے مارے تو مجھے ہوش آیا۔

قاضی ابراہیم سے یہ بھی منقول ہے۔ کہتے ہیں جس زمانے میں مَیں اعلیٰ حضرت جنت مکانی (عالم گیر بادشاہ) کے پوتے کا معلم تھا، ایک روز شیخ ناصر جو اپنے وقت کی عجیب و غریب شخصیت تھے، کتب خانے میں آئے۔ سلطان بھی موجود تھا۔ میں نے سلطان کو ان سے کچھ طلب کرنے کا اشارہ کیا۔ سلطان نے نہایت عجز و انکساری کے ساتھ شیخ سے تبرک کی درخواست کی، اور انھوں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر فرش کے نیچے سے چند کنکریاں اٹھائیں اور ہاتھ میں تین بار گھمائیں۔ مَیں نے دیکھا کہ اب ان کنکریوں میں سے کچھ تو آب دار عقیق ہیں، کچھ بے بہا لعل ہیں، کچھ مرجان ہیں اور کچھ موتیوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ کہ پھر یہ سب انھوں نے داڑھی کے بال کی نوک سے ایک ایک پرو کر سلطان کو دیں۔

قاضی ابراہیم سندھی کے دو بیٹے تھے۔ شیخ امان اللہ جو لاولد فوت ہوئے، اور ایک شیخ عنایت اللہ۔ یہ دونو بڑے نامور بزرگ تھے، لیکن آبادی سے دُور اپنی جاگیر میں اقامت گزیں رہے۔ قاضی ممدوح کے بیٹوں کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ البتہ تین نواسے تھے۔ قاضی محمد یحییٰ، قاضی محمد امین اور محمد باقر ـــــ

قاضی ابراہیم کے بھائی محمد کریم تھے، یہ بھی اپنی جاگیر میں نیرون کوٹ رہے اور وہیں فوت ہو گئے۔ لیکن قاضی مرحوم کے بھتیجے قاضی محمد اکرم موضع بنسوڑہ کے منصبِ قضا پر متعین ہوئے۔ ان کے بھائیوں کی اولاد میں سے ایک اور بزرگ قاضی عبدالجلیل تھے، جو پٹنہ کی مسندِ قضا سے سرفراز کیے گئے۔ انھوں نے بہت ہی عزت کی زندگی بسر کی اور پٹنہ ہی میں وفات پائی۔[۵۶]

قاضی ابراہیم کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔ معلوم ہوتا ہے یہ کسی کتاب کے مصنف نہ تھے، البتہ گیارھویں صدی ہجری کے برصغیر کے نامور قاضی، عالمِ دین اور فقیہ تھے۔

۷۔ مفتی ابوالبقا جون پوری

مفتی ابوالبقا بن درویش محمد حسینی واسطی جون پوری، جون پور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد (شیخ درویش محمد) اور دیگر علما سے تحصیل کی۔ پھر درس و تدریس کی مسند سنبھالی۔ نہایت ذکی، قوی الحافظہ، سریع الادراک اور عذوبتِ لسان کے حامل تھے۔ مدتِ مدید تک اپنے شہر جون پور میں فرائضِ تدریس انجام دیتے رہے۔ مشاہیر فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور گیارھویں صدی ہجری کے اسلامی ہند کے بلند پایہ شیخ، عالمِ دین اور فقیہ تھے۔ بادشاہِ ہند شاہ جہان ان کے علم و فضل کی وجہ سے ان کا بہت قدر دان تھا۔ ایک مرتبہ دہلی گئے تو شاہ جہان انتہائی تکریم سے پیش آیا اور انھیں جون پور کے منصبِ قضا پر متعین کیا۔

ان کی قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو کتاب ایک مرتبہ مطالعہ میں آجاتی، اس کا ایک ایک لفظ ذہن میں نقش ہو جاتا اور حافظہ اس کے تمام گوشوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو بعض تذکروں میں مرقوم ہے کہ ایک مرتبہ قیصر روم

---

[۵۶] تحفۃ الکرام ص ۶۶۱ تا ۶۶۵ ــــ تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۶۱ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۹۔

نے ابو البقا عبداللہ بن حسین العکبری (متوفی ۶۱۶ھ) کی تصنیف "اعراب القرآن" (جو دس جلدوں پر مشتمل ہے) بادشاہِ ہند شاہ جہان کی خدمت میں بطور تحفہ ارسال کی۔ بُعدِ مسافت کی وجہ سے اس کتاب کے کچھ اوراق پھٹ گئے تھے۔ شاہ جہان نے یہ کتاب مفتی ابو البقا کے پاس بھیجی تاکہ وہ اسے درست کر دیں۔ چھ ماہ گزر گئے مگر کتاب واپس شاہی کتب خانے میں نہ پہنچی۔ اب بادشاہ نے مفتی صاحب سے واپسی کا مطالبہ کیا۔ مفتی صاحب ممدوح نے اپنے کتب خانے میں کتاب (اعراب القرآن) تلاش کی تو نہ ملی۔ لیکن جب ان کے پاس کتاب پہنچی تھی، وہ اسے پڑھ چکے تھے اور اس کے مندرجات ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ انھوں نے اللہ کا نام لے کر قلم پکڑا اور اپنی قوتِ حافظہ سے پوری کتاب لکھ کر بادشاہ کو بھجوا دی۔ دربار میں یہ کتاب گئی تو کوئی اس کے اصل اور نقل میں تمیز نہ کر سکا۔ اصل واقعہ بادشاہ کے علم میں آیا تو اس نے مفتی صاحب کو اس کے صلے میں جاگیر اور انعام عطا کیا۔

مفتی ابو البقا جون پوری مصنف و مؤلف بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے شرح جامی، شرح شمسیہ (رازی) اور منطق کی مشہور کتاب قطبی پر حواشی تحریر کیے۔

وہ ملا محمد ماہ دیوگامی کے شاگرد تھے، جن کا شمار اپنے دَور کے مشہور اساتذہ اور اجل علما میں ہوتا تھا۔ مفتی ابو البقا نے جمعہ کے روز ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۰۴۰ھ کو جون پور میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ ان کی قبر جون پور کے مفتی محلہ میں ہے۔[۵۷]

۸۔ شیخ ابوبکر شافعی سندھی

شیخ ابوبکر سندھی، شافعی المسلک تھے۔ اپنے عصر کے بہت بڑے فاضل اور

---

۵۷ تجلی نور، ج ۲ ص ۶۴ ——— نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۔

تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیائے جون پور ص ۲۲۷، ۲۲۸۔

علامہ تھے۔ دمشق میں جامع اموی کے مشرقی مینار کے نیچے یہ سندھی عالم دین دس سال خدمتِ علم انجام دیتے اور علماء طلبا کو مستفید فرماتے رہے۔ یوں تو تمام مروجہ علوم کے ماہر تھے لیکن معقولات میں بالخصوص درک رکھتے تھے۔ ساتھ ہی انتہائی نیک بھی تھے ان کے تدین کا یہ حال تھا کہ اکثر روزے رکھتے اور نماز باجماعت کا التزام کرتے۔ کم گو، منواضع اور عبادت گزار تھے۔ حکام کی مجلسوں اور ان سے ملاقات سے دامن کشاں رہتے۔ اگر کسی حکمران کو ان سے کوئی کام ہوتا تو خود حاضرِ خدمت ہوجاتا۔ دنیا اور اس کا مال و متاع انھیں پیش کیا جاتا، مگر وہ اس سے دور رہتے۔ نہایت تنگی اور قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ علما و طلبا کا ایک ہجوم ان کے گرد رہتا اور یہ ان کو معقولات اور دیگر علوم کی تعلیم دیتے۔ طویل عرصہ تک شائقینِ علوم ان کے فیضِ عالیہ سے مستفید ہوتے رہے۔ ان کی وفات طاعون کے مرض سے ہوئی۔ ہفتے کے روز ۳ ربیع الاول ۱۰۱۸ھ کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، اس دن وہ روزے سے تھے۔ شیخ نجم الدین غزی شافعی نے ان کی وفات پر یہ شعر کہے:

عجبت لطاعون اصابت نبالہ ——— و اربت علی الخطی و الصارم الهندی
سطا فی دمشق الشام عاما و اخرا ——— نبسط فی الھندی وما ترک السندی

انھیں باب الفرادیس میں تربتِ غربا میں دفن کیا گیا۔[۵۸]

اس شافعی المسلک سندھی عالم دین کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کہاں پیدا ہوئے، سندھ میں کتنا عرصہ قیام پذیر رہے اور ان کے تلامذہ کی فہرست میں کون کون خوش بخت حضرات شامل تھے۔

۹۔ قاضی ابوبکر الہ آبادی

قاضی ابوبکر الہ آبادی، گیارھویں صدی ہجری میں دیارِ ہند کے بہت بڑے عالم دین

---

۵۸ لطف السمر و قطف الثمر ——— نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۲

اور فقیہ تھے۔ انھوں نے فقہ امام ابو حنیفہ کی روشنی میں فقہ کی ایک کتاب تصنیف کی، جو احناف کے معمول بہا مسائل پر مشتمل تھی۔ یہ کتاب انھوں نے اورنگ زیب عالم گیر کے مصاحب و ندیم بختاور خاں کے نام معنون کی تھی[۹]

۱۰۔ شیخ ابو تراب بیجاپوری

شیخ ابو تراب بن ابو المعالی بن علم اللہ حنفی صالحی امیٹھوی ثم بیجاپوری کی جائے ولادت بیجاپور ہے۔ وہیں نشو و نما پائی اور وہیں شیخ علی محمد بن اسد اللہ علوی گجراتی سے تحصیل کی، طویل مدت تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے اور ان سے مختلف علوم اس درجہ محنت و کوشش کے ساتھ حاصل کیے کہ اپنے تمام اقران و معاصرین سے سبقت لے گئے اور بیجاپور کے اکابر علما میں شمار ہونے لگے۔ پھر خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی اور نصف عمر اس خدمت میں صرف کر دی۔ اپنے عہد کے فاضل بزرگ تھے اور فقہ و اصولِ فقہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ ارض ہند میں بیجاپور اس زمانے میں اہل علم کا مرکز تھا اور شیخ ابو تراب کو اس مرکزِ علم و فضل کے رئیس کی حیثیت حاصل تھی۔

گیارھویں صدی ہجری کے بے شمار چوٹی کے علما نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان میں سے بعض اپنی عظیم علمی و فقہی خدمات کی بنا پر شہرتِ دوام کے حامل ہوئے، ان بلند مرتبت حضرات میں مرتبین فتاویٰ ہندیہ (جو فتاوےٰ عالم گیری کے نام سے مشہور ہے) کے سربراہ شیخ نظام الدین برہان پوری بھی شامل ہیں۔ یہ شیخ ابو تراب کے نامور تلمیذ تھے ـــ شیخ ابو تراب نے ۲۰ صفر ۱۰۸۶ھ کو وفات پائی[۱۰]

---

[۹] مرآۃ العالم ـــ نزہۃ الخواطر ج ص ۱۳۔

[۱۰] روضۃ الاولیا ص ـــ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۳

۱۱- شیخ ابوتراب گجراتی

شیخ ابوتراب بن کمال الدین بن ہبۃ اللہ حسینی گجراتی۔ جانپانیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ ان کے دادا شیخ ہبۃ اللہ کا شمار خطۂ ہند کے کبار علما کبار میں ہوتا تھا، ان سے اور اپنے والدِ مکرم شیخ کمال الدین سے تعلیم پائی اور علم و فضل میں رسوخ حاصل کیا۔ جانپانیر سے گجرات (کاٹھیاوار) کے مشہور شہر احمد آباد منتقل ہوگئے، جو اس زمانے کے اسلامی ہند میں علم و علما کا مرکز، صوفیا و صلحا کا مسکن، تہذیب و تمدن کا گہوارہ اور سلاطینِ گجرات کا دارالسلطنت تھا۔ جب مغل حکمران جلال الدین اکبر نے گجرات پر حملہ کرکے اس کو فتح کیا تو شیخ ابوتراب گجراتی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ ان کے علم و فضل سے متاثر ہوا اور انھیں ۹۸۹ھ میں امیرِ حجاج مقرر کرکے مکہ مکرمہ بھیجا۔ حرمین شریفین کے مستحقین و مساکین میں تقسیم کرنے کے لیے بادشاہ نے ان کو چاندی کے پانچ لاکھ مروّجہ سکے دیے اور دس ہزار خلعاتِ فاخرہ عطا کیں۔

شیخ ممدوح سعادتِ حج سے بہرہ ور ہوکر ۹۹۱ھ کو ہندوستان واپس لوٹے منقول ہے کہ واپسی میں ارضِ حجاز سے ایک پتھر بھی لائے، جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک ثبت تھا۔ بادشاہ نے اپنے دارالخلافہ آگرہ سے چار میل باہر نکل کر ان کا استقبال کیا، اس پتھر کو ہاتھ میں پکڑا اور احترام سے آنکھوں پر لگایا اور سر پہ رکھا۔ شیخ کو جلوس کی شکل میں آگرہ لایا گیا اور ان کی نہایت تعظیم کی گئی۔

اس سے کچھ عرصہ بعد اکبر نے ان کو گجرات میں منصبِ جلیلہ پر متعین کیا اور ایک مدت تک وہ اس منصب پر فائز رہے۔ شیخ ابوتراب گجراتی صاحبِ تصنیف بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب تاریخِ گجرات ہے، جو فارسی زبان میں ہے۔ اس جلیل القدر عالمِ دین نے ۳ جمادی الاولیٰ ۱۰۰۳ھ کو وفات پائی۔[1]

---

[1] مآثر الامرا۔ منتخب التواریخ ص ۲۶۲ بضمن مرزا مظفر حسین کا گجرات پر حملہ (اردو ترجمہ) — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۳، ۱۴۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پتھر پر نقشِ قدم اور بالوں وغیرہ کے متعلق جو حکایتیں بعض تذکروں میں منقول ہیں یا لوگوں کی زبانی سننے میں آتی ہیں اصل اور حقیقت سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ آنحضرت فداہ ابی وامی کے بال مبارک اب تک اس دنیا میں موجود ہیں، نہ آپ کا نقشِ قدم کسی پتھر پر مرتسم ہے اور نہ آپ کی کوئی اور چیز کہیں پائی جاتی ہے۔ اس قسم کے توہمات سے دامن بچا کر رکھنا چاہیے۔ صرف آپ کی تعلیمات، آپ کے ارشادات آپ کی سنتِ مطہرہ، اسوۂ حسنہ اور اقوال و افعال کو سامنے رکھنا چاہیے۔ وہی ہمیشہ رہنے والے ہیں، انہی کو دوام حاصل ہے۔ انہی پر ہماری نجات کا دارومدار ہے اور وہی ذریعہ فلاح و کامرانی ہے۔

۱۲۔ سید ابوالحسن سورتی

سید ابوالحسن بن جمال الدین بن سید بادشاہ خوارزمی سورتی، مشائخ نقشبندیہ میں سے تھے۔ اپنے والد (شیخ جمال الدین) سے کتبِ فقہ کی تحصیل کی اور ان ہی سے اخذِ طریقت کیا۔ والد کی وفات کے بعد مسندِ مشیخت پر فائز ہوئے۔ بے شمار لوگ ان کی تبلیغی مساعی اور متصوفانہ اندازِ ہدایت سے راہِ حق پر گام زن ہوئے۔ سید ابوالحسن سورتی نے ۹ صفر ۱۰۵۴ھ سورت (ہندوستان) میں داعیِ اجل کو لبیک کہا اور وہیں سپردِ خاک کیے گئے۔[۱۵]

۱۳۔ شیخ ابوالحسن کشمیری

شیخ ابوالحسن حنفی کشمیری سندھی، فاضلِ کبیر اور معقولات و منقولات کے فحول علما سے تھے۔ مغل حکمران شاہ جہان کے عہد میں مسندِ درس و تدریس پر متمکن تھے اور

---

۱۵ حدیقہ احمدیہ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۔

علما و طلبا کو باقاعدہ درس دیتے تھے۔ شاہم بابا کے عرف سے معروف تھے۔ ملا یوسف گنائی ان کے علم و فضل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ تمام علوم مروجہ میں منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ جب ناظمانِ خطۂ کشمیر کے کہنے سے علما کے درمیان مباحثہ ہوا تھا تو یہ چوٹی کے علما کی مجلس میں تفسیر بیضاوی اور عصام الدین محشی کی عبارتوں کی عبارتیں اس درجہ تیزی سے پڑھتے تھے، جس طرح حافظِ قرآن، قرآن پڑھتا ہے۔ اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی اکثر عبارات و تشریحات کا رد کرتے تھے اور وضاحت کرتے تھے کہ ملا عبدالحکیم نے کہاں کہاں علمی لغزش کی ہے۔ انھیں اپنی تحقیق پر اس قدر بھروسہ تھا کہ مسلسل اپنی رو میں بولتے چلے جاتے تھے اور مجلس میں حاضر علما کی ... بالکل التفات نہ کرتے تھے[۱۳]

۱۴۔ سید ابو حنیفہ نصیر آبادی ثم بریلوی

سید ابو حنیفہ بن علم اللہ حسنی حسینی، نصیر آباد میں پیدا ہوئے۔ جب ان کے والدِ مکرم (سید علم اللہ) نصیر آباد کی سکونت ترک کر کے رائے بریلی منتقل ہوئے تو باپ بیٹا دونوں حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ اس وقت سید ابو حنیفہ کی عمر بارہ سال تھی۔ حج سے واپس آئے تو باپ کے زیرِ تربیت رہ کر ان سے علم فقہ کی تحصیل کی۔ طریقت و تصوف کے حصول کا رجحان اس دور کے علما میں عام طور پہ پایا جاتا

۱۳؎ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۴۴۔ حدائق الحنفیہ ص ۵۵۷۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۱۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۷۔ تذکرہ علمائے ہند کے صفحہ مذکور پہ ابوالحسن نام کے دو بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک مولوی ابوالحسن ساکن کاندھلہ کا اور ایک ملا ابوالحسن کشمیری کا۔ ملا ابوالحسن کشمیری کا تذکرہ ایک سطر میں کیا گیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: "ملا ابوالحسن کشمیری مشہور بشاہم بابا، معاصر شہاب الدین محمد شاہ جہان بادشاہ بود"۔ لیکن دوسرے بزرگ کے بارے میں صرف یہ الفاظ مرقوم ہیں: "مولوی ابوالحسن ساکن کاندھلہ" یعنی محض عنوان۔ تذکرہ علمائے ہند کے اردو مترجم جناب محمد ایوب قادری سے سہو ہو گیا ہے۔ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت ملا ابوالحسن کشمیری کا متن، مولوی ابوالحسن ساکن کاندھلہ کے عنوان تلے درج کر دیا گیا ہے۔ (دیکھیے تذکرہ علمائے ہند اردو ترجمہ ص ۵۵۹)

تھا۔ سید ابو حنیفہ کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے یہ فیض بھی اپنے والدِ محترم ہی سے حاصل کیا اور اپنی حیاتِ مستعار کے آخری سانس تک ان ہی سے منسلک رہے۔ سید علم اللہ صلاح و تقویٰ کے حامل اور متبع سنتِ محمدیہ تھے۔ سید ابو حنیفہ بھی اس معاملے میں باپ کے نقشِ قدم پر چلے اور فضل و صلاح کے اعتبار سے معروف بزرگوں میں سے گردانے گئے۔ انھوں نے اپنے والد کی زندگی ہی میں ماہ ربیع الاول ۱۰۸۸ھ میں بمقام رائے بریلی وفات پائی۔[۱۴]

۱۵۔ شیخ ابو الخیر بن مبارک ناگوری

شیخ ابو الخیر بن شیخ مبارک ناگوری ۲۲ جمادی الاولیٰ ۹۶۷ھ کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد (شیخ ناگوری) سے جو اس دور کے عالم و فاضل بزرگ تھے، علم حاصل کیا۔ شیخ ابو الخیر مختلف علوم و فنون میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ جلال الدین اکبر سے ان کا تعلق پیدا ہوا تو اس نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر اپنے بیٹوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب "الارشاد" کی بسیط و مفصل شرح سپردِ قلم کی۔ ابو الفضل اور فیضی کے بھائی تھے۔ اتوار کے روز ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۰۱۹ھ کو فوت ہوئے۔[۱۵]

۱۶۔ شیخ ابو الخیر ٹھٹھوی سندھی

شیخ ابو الخیر ٹھٹھوی سندھی حنفی المسلک تھے۔ بہت بڑے عالم و فقیہ تھے۔ شیخ فضل اللہ سندھی کی اولاد سے تھے جو علم و فضل کے زیور سے آراستہ اور تقویٰ و للہیت کی دولت سے مالا مال تھے۔ علم فقہ میں شیخ ابو الخیر کی مہارت و وسعت کا یہ عالم تھا کہ سلطان اورنگ زیب عالم گیر نے ان کو علما کی اس جماعت میں شامل کیا، جو فتاویٰ

---

۱۴ الیسرۃ العلمیہ ــــــ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۷

۱۵ آئینِ اکبری ج ۳ ص ۳۱۰ ــــ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۸

عالم گیری کی تدوین وترتیب کے فرائض انجام دینے پر مامور تھی[۱۶]

۱۷- شیخ ابوالخیر بھیروی

شیخ ابوالخیر بن ابوسعید بن معروف بن عثمان عمری بھیروی، ۱۰۰۸ھ کو سلطان پور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد (شیخ ابوسعید) سے علم حاصل کیا۔ پھر مزید تحصیل کی غرض سے دیگر بلاد و امصار کا رُخ کیا اور متعدد علمائے عصر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بعد ازاں عازمِ حجاز ہوئے اور حج بیت اللہ کیا۔ حج کے بعد واپس ہندوستان آئے اور اپنے گاؤں بھیرہ میں جو اعمالِ جون پور میں واقع تھا، سکونت اختیار کی۔ بہت نیک عالم دین تھے۔ انھوں نے ۱۱ شوال ۱۰۵۹ھ کو اپنے گاؤں میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے[۱۷]

۱۸- شیخ ابورضا دہلوی

شیخ ابورضا بن اسماعیل دہلوی، دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نواسے تھے، ان ہی سے اخذِ علم کیا، عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے اور اپنے عصر کے فحول علما میں سے گردانے گئے۔ بہت بڑے عالم دین اور محدث تھے۔ عمر بھر درس تدریس کی شمع جلائے رکھی اور بے شمار اہل علم نے ان سے استفادہ کیا، جن میں شیخ مبارک بن فخرالدین بلگرامی بھی شامل ہیں۔ آخر عمر میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور ۱۰۶۳ھ کو دہلی میں وفات پائی[۱۸]

---

[۱۶] تحفۃ الکرام ص ۶۶۱ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۱ — نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۱۸ — برصغیر پاک وہند میں علم فقہ ص ۲۷۹ تا ۲۸۱

[۱۷] نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۸

[۱۸] الاسرار ص — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹

۱۹- شیخ ابو سعید گنگوہی

شیخ ابو سعید بن نور الدین بن علی بن عبد القدوس حنفی گنگوہی، گنگوہ کے مردم خیز شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ شیخ صالح اور عالم و فقیہ تھے۔ وادیٔ تصوف و طریقت کی مختلف منزلوں سے آگاہی رکھتے تھے اور اس ضمن میں شیخ نظام الدین عمری تھانیسری کے فیض یافتہ تھے۔ گنگوہ کی مسندِ ارشاد پر فائز رہے اور ان سے خلقِ کثیر نے استفادہ و استفاضہ کیا، جن میں صاحبِ تسویہ شیخ محب اللہ الہ آبادی اور شیخ محمد صادق بھی شامل ہیں۔

شیخ ابو سعید گنگوہی کے مرید شیخ محب اللہ الہ آبادی نے ایک کتاب انفاس الخواص کے نام سے تصنیف کی ہے، جو ابنِ عربی کی فصوص الحکم کے انداز کی کتاب ہے۔ یہ کتاب اکیاسی [۸۱] حصوں میں منقسم ہے، جن کا نام مصنف نے "انفاس" رکھا ہے۔ ہر نفس کسی نبی یا ولی کے نام سے موسوم ہے اور اس نبی یا ولی کی تعلیمات کے باطنی پہلوؤں اور اس کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ یہ انفاس حضرت آدم سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مختلف انبیائے کرام کے اسمائے گرامی سے معنون کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد خلفائے اربعہ سے چار انفاس منسوب ہیں۔ پھر مختلف مقامات کے بعض مشہور اولیا و صوفیا کے انفاس بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلۂ انفاس کا آخری نفس مصنف کے مرشد شیخ ابو سعید بن نور الدین گنگوہی کے نام سے منسوب ہے۔

شیخ ابو سعید گنگوہی نے ۱۰۴۹ھ کو گنگوہ میں وفات پائی اور وہیں سپردِ خاک ہوئے۔[۲۰]

۲۰- قاضی ابو سعید گجراتی

قاضی ابو سعید گجراتی حنفی المسلک تھے اور اپنے زمانے کے شیخ، عالم اور فقیہ تھے۔

---

[۱۹] خزینۃ الاصفیا، ص

[۲۰] نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۹

قاضی عبدالوہاب پٹنی گجراتی کے داماد تھے۔ ۱۰۸۶ھ میں اپنے خسر قاضی عبدالوہاب پٹنی گجراتی کی جگہ دہلی کے قاضی مقرر کیے گئے۔ بعدازاں ذی القعدہ ۱۰۹۴ھ کو قاضی لشکر کے عہدہ پر فائز ہوتے۔ کچھ مدت بعد جمادی الاولیٰ ۱۰۹۵ھ کو اس منصب سے معزول کر دیے گئے اور ۱۰۹۹ھ کو، اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں اس دنیائے فانی سے انتقال کر گئے۔[۲۰]

۲۱۔ مولانا ابوسعید امیٹھوی

مولانا ابوسعید بن عبیداللہ بن عبدالرزاق صالحی امیٹھوی، ۴ ربیع الاول، ۱۰۰۷ھ کو، امیٹھی میں پیدا ہوتے، اور اپنے زمانے کے مشہور اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد، تمام عمر درس و افادہ کا ہنگامہ بپا کیے رکھا۔ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ، نہایت متقی، صالح، متورع، عابد و زاہد، کریم النفس، اور سخی تھے۔ ۸ محرم ۱۰۶۱ھ کو اپنے وطن امیٹھی میں فوت ہوتے اور وہیں دفن کیے گئے۔[۲۱]

۲۲۔ شیخ ابوالعلا جون پوری

شیخ ابوالعلا بن غلام حسین حنفی صوفی جون پوری، صدر جہان جون پوری کی اولاد سے تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد، مشہور درسی کتاب رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی سے اخذ طریقت کیا اور ایک مدت تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے۔ خرقۂ تصوّف ان کے صاحب زادہ گرامی شیخ محمد ارشد عثمانی جون پوری سے پہنا اور شیخ

---

[۲۰] مآثر عالم گیری ص ۲۳۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۹، ۲۰

[۲۱] صبح بہار، ص — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۲۰

یٰسین بن احمد صوفی بنارسی سے شرف اجازہ حاصل کیا۔

شیخ ابوالعلا جون پوری بہت بڑے عالم و فقیہ، زاہد و متقی اور صاحبِ استقامت بزرگ تھے۔ ۷ شوال ۱۰۹۸ھ کو وفات پائی اور اپنے جدِّ امجد قاضی صدرِ جہاں کے مقبرہ میں، جو بلدہ جون پور سے باہر قریہ مصطفیٰ آباد میں واقع تھا، مدفون ہوئے[۲۲]

۲۳- شیخ ابوالفتح ملتانی

شیخ ابوالفتح ملتانی، علامۂ دوران اور فاضلِ روزگار تھے۔ فقہ و اصول اور علومِ عربیہ کے متبحر علما میں سے تھے۔ فنونِ حکمیہ میں بھی ماہر کامل تھے۔ تدریس و افادۂ طلبا ان کا اصل مشغلہ تھا۔ مغل حکمران شاہ جہان کے عہد میں ان کا فیضانِ علم جاری تھا۔ ان کے چشمۂ علم سے بے شمار لوگوں نے اپنی علمی تشنگی بجھائی[۲۳]

۲۴- قاضی ابوالفتح بلگرامی

قاضی ابوالفتح بلگرامی، قاضی کمال کے عرف سے معروف تھے اور شاہِ ہند جلال الدین اکبر کے عہد میں بلگرام کے منصبِ قضا پر متعین تھے۔ علومِ فقہ میں اس درجہ دسترس رکھتے تھے کہ اس موضوع میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ ارضِ ہند کے اس عدیم المثال عالمِ دین نے چوراسی سال عمر پاکر ۱۰۰۱ھ میں اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کو کوچ کیا[۲۴]

۲۵- قاضی ابوالقاسم کشمیری

قاضی ابوالقاسم بن جمال الدین کشمیری نے اپنے والد شیخ جمال الدین اور

---

[۲۲] تجلّی نور ــ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۲

[۲۳] عمل صالح ج ۲ ص ۳۹۲ ـــ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۴

[۲۴] مفتاح التواریخ ص ۱۹۸ ـــ تذکرہ علمائے ہند ص ۶

اور عم محترم علامہ کمال الدین سے اخذِ علم کیا، یہاں تک کہ فقہ و اصول اور دیگر علوم کے جلیل القدر علما میں سے گردانے گئے۔ علم و فضل کی فراوانی کے ساتھ ساتھ نیکی و صالحیت اور زہد و اتقا کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ کشمیر کے منصبِ قضا پر متعین تھے۔ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان کے تلامذہ میں مولانا محمد امین، مولانا عبدالنبی دیوانی اور علما کی بہت بڑی جماعت شامل ہے۔ کشمیر میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے[۲۵]

تذکرہ علمائے ہند میں انھیں قاضی ابوالقاسم بن ملا جمال الدین سیالکوٹی لکھا گیا ہے، اور مغل حکمران نورالدین جہاں گیر کے ہم عصر قرار دیا گیا ہے[۲۶]

۲۶-مولانا ابوالواعظ ہرگامی

علامہ ابوالواعظ بن صدرالدین بن محمد اسماعیل بن قاضی عمادالدین احمد عمری بدایونی، موضع ہرگام میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بہت بڑے فاضل اور اپنے دور کے مشہور عالم تھے۔ عمر بھر تعلیم و تدریس کا غلغلہ بلند کیے رکھا۔ حلقہ تدریس نہایت وسیع تھا جس سے بے شمار تشنگانِ علوم نے اپنی علمی پیاس بجھانے کا سامان فراہم کیا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ مربی بن عبدالنبی بلگرامی کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے — تذکرۃ الانساب کی روایت کے مطابق شاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر نے بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان کے علم و فضل اور فقہ پر عبور کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ فتاویٰ عالم گیری کے مصنفین میں شامل تھے۔

مولانا ابوالواعظ کے دادا عمادالدین اس خاندان کے پہلے شخص ہیں، جو ہرگام میں جاکر آباد ہوئے، وہاں کے قاضی سے علم حاصل کیا اور اس کی بیٹی سے شادی

---

۲۵ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۳۴، ۱۴۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۳۱

۲۶ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۱

کی۔ پھر وہیں گھر بنا لیا اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مشہور عالم دین، شیخ محب اللہ الہ آبادی مولانا ابو الوعظ کے چچا زاد بھائی تھے۔[۲۷]

۲۷- شیخ احمد بن اسحاق نصیر آبادی

شیخ احمد کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ احمد بن اسحاق بن محمد بن محمود بن علاء الشریف الحسنی نصیر آبادی۔ نصیر آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ ابتدائی کتب درسیہ اور مختصرات اپنے شہر ہی میں پڑھیں۔ مزید تعلیم کے لیے عازم الہ آباد ہوئے۔ الہ آباد میں ان دنوں مشہور عالم دین صاحب التسویہ شیخ محب اللہ الہ آبادی کا سلسلۂ تدریس جاری تھا، یہ اس میں شامل ہو گئے اور عرصہ تک ان سے اخذِ علم کرتے رہے، یہاں تک کہ علوم مروجہ اور اصول و فروع کے مختلف گوشوں میں کامل مہارت پیدا کر لی اور فتویٰ و تدریس کی صلاحیتوں سے بہرہ اندوز ہو گئے۔ پھر اپنے شہر نصیر آباد کو مراجعت کی اور خود درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔ طویل عرصہ تک شائقینِ علوم ان کے چشمۂ علم سے سیراب ہوتے رہے۔ بعد ازاں میلانِ طبع تصوّف کی طرف ہوا تو عالمِ طریقت شیخ آدم بن اسماعیل حسنی بنوری کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ اس زمانے میں گوالیار میں مقیم تھے۔ ان سے کسبِ فیض کیا۔ شیخ آدم سفرِ حج پر روانہ ہوئے تو انھیں اپنا خلیفہ مقرر کر دیا۔ شیخ آدم ناخواندہ تھے اور کسی اہلِ علم سے کوئی کتاب نہ پڑھی تھی، لیکن نہایت نیک، بہت بڑے بزرگ اور متبع سنت تھے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے روحانی فیض حاصل کیا۔ ۲۳ شوال ۱۰۵۳ھ کو مدینہ منورہ میں فوت ہوئے۔ شیخ احمد بن اسحاق نصیر آبادی بھی ان سے مستفیض ہوئے اور مرتبۂ خلافت کو پہنچے۔

شیخ احمد بہت بڑے عالمِ دین، متقی، متورع، کثیر العبادت، منکسر المزاج اور اللہ

۲۷؎ مآثر الکرام ص ۹۴۔ آمدنامہ ۔۔۔ تذکرۃ الانساب ۔۔۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۴، ۳۵ ۔۔۔ ماہنامہ "برہان" دہلی (جنوری ۱۹۴۹ء) برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ ص ۲۰۵

سے ڈرنے والے تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ حرمتِ غنا کے موضوع پر بھی ایک رسالہ تصنیف فرمایا۔ اس نامور عالمِ دین اور صوفی نے ۱۰۸۸ھ کو نصیر آباد میں وفات پائی [۲۸]

۲۸۔ شیخ احمد بن حسین نائطی بیجاپوری

شیخ احمد کا لقب نظام الدین اور ان کے والد شیخ حسین کا لطف اللہ تھا اور یہ شیخ نظام الدین بن لطف اللہ قاضی بیجاپوری کے نام سے معروف تھے۔ شیخ احمد حدیث اور فقہ کے جیّد علما میں سے تھے۔ شیخ عوض بن محمد بن شیخ ضعیف سقاف کے شاگرد تھے۔ بیجاپور میں نظارتِ انشا کے منصب پر متعین تھے۔ عرصہ تک اس خدمتِ جلیلہ پر فائز رہے۔ پھر بیجاپور کے حاکم عادل شاہ نے ان کو مغل بادشاہ شاہجہان کی خدمت میں سفیر بنا کر دہلی بھیج دیا تھا۔ یہ اہم خدمت بھی طویل مدت تک انجام دیتے رہے۔ آخر عمر میں اس سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی علم اور پرہیزگاری میں مشہور تھے۔ حدیث پر عبور حاصل تھا اور بے شمار احادیث زبانی یاد تھیں۔ ان کی اسناد اور ان میں مختلف ائمہ کے مذاہب رجحانات سے خوب آگاہ تھے۔ ۱۸ ربیع الاول ۱۱۰۰ھ کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے [۲۹]

۲۹۔ شیخ احمد بن رضا حیدر آبادی

شیخ احمد بن رضا حیدر آبادی مذہباً شیعہ تھے۔ ۱۰۸۵ھ میں ہندوستان آئے۔ بڑے فاضل بزرگ تھے۔ حدیث و رجال پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس موضوع سے متعلق ایک کتاب بھی تصنیف کی جس کو فائق المقال کے نام سے موسوم کیا۔ یہ

---

[۲۸] سیرتِ سادات ص — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۷، ۳۸

[۲۹] تاریخ نوائط ص — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹

کتاب انھوں نے حیدر آباد دکن میں مکمل کی۔ اس میں اپنی نسبتِ تلمذ حر عاملی کی طرف کرتے ہیں۔ انھیں بارہ ہزار احادیث کے متون بغیر اسناد کے حفظ تھے، اور بارہ ہزار احادیث مع متون و اسناد کے زبانی یاد تھیں۔ فائق المقال کے علاوہ منہج القویم اور قرأت سے متعلق بھی ایک رسالہ ان کی تصانیف میں شامل ہے[۳۰]۔

۳۰- قاضی احمد بن سلامہ جزائری

قاضی احمد بن سلامہ جزائری بھی شیعہ تھے اور اپنے دور کے مشاہیر افاضل میں سے تھے۔ ہندوستان آئے اور حیدر آباد (دکن) کے منصبِ قضا پر متعین ہوئے تمام عمر اس منصب پر فائز رہے۔ بڑے فاضل، فقیہ اور صالح بزرگ تھے۔ مصنف بھی تھے۔ چنانچہ علامہ حلی کی الارشاد کی شرح سپردِ قلم کی۔ کہتے ہیں ان کی بعض اور تصانیف بھی ہیں، لیکن ہمیں ان کا علم نہیں ہو سکا[۳۱]۔

۳۱- مولانا احمد بن سلیمان کردی گجراتی

مولانا احمد کے والد مولانا سلیمان دراصل علاقہ کردستان کے رہنے والے تھے۔ وہاں کی سکونت ترک کر کے ارضِ ہند میں آ گئے تھے اور گجرات میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حدیث و فقہ کے عالم اور شیخ عبدالحق دہلوی کے تلمیذ تھے۔ گجرات ہی میں مولانا احمد کی ولادت ہوئی اور انھوں نے اپنے والد مولانا سلیمان کی گود میں تربیت پائی۔ اکثر کتب درسیہ اس علاقے کے مشہور عالم قاضی محمد شریف گجراتی سے پڑھیں۔ شرح المواقف اور دیگر فنونِ حکمیہ کی تحصیل مولانا ولی محمد خانو گجراتی سے کی۔ تصوف و طریقت کے لیے شیخ فرید الدین گجراتی کی خدمت میں

---

۳۰ نجوم السماء ص — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹

۳۱ امل الآمل (از حر عاملی) — نجوم السماء ص — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹، ۴۰۔

حاضر ہوئے۔ فنونِ ریاضیہ امیر قباد بدخشی یعنی نواب ریاست خاں سے حاصل کیے۔ علمِ حدیث اور بعض فنونِ مروجہ کے لیے اپنے والدِ مکرم شیخ سلیمان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ان تمام علوم و فنون پر عبور حاصل کرنے کے بعد خود مسندِ تدریس بچھائی اور درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے فیضِ علم سے بے شمار علما و طلبا مستفید ہوئے۔ یوں تو یہ تمام علوم پر عبور رکھتے تھے مگر علومِ حامیہ میں بھی نوارضِ گجرات میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ اس نواح میں ان علوم کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں یہ سب سے فوقیت لے گئے تھے۔ علمِ کلام میں شرح فیوض القدس کے نام سے ان کی ایک عمدہ تصنیف بھی ہے۔ اس عالمِ دین نے ۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۰۹۲ھ کو احمد آباد (گجرات) میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

تذکرہ علمائے ہند میں تاریخِ وفات ۲۱ جمادی الاخریٰ ۱۱۱۲ھ (یکم و بست جمادی الثانی سال یازدہ صد و دوازدہ ہجری) مرقوم ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے[۳۲]

۳۲۔ شیخ احمد بن عبداللہ حضرمی

شیخ احمد بن عبداللہ بن احمد بن حسین بن عبداللہ حضرمی حیدرآبادی فقہی مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے۔ اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ مختلف علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ شیخ عبداللہ بن عمر باغریب سے قرآنِ مجید حفظ کیا۔ پھر مختلف علوم و فنون کی بہت سی کتابیں، مختلف اکابر اساتذۂ عصر سے پڑھیں۔ حدیث، فقہ اور تصوف کی تعلیم اپنے والدِ مکرم شیخ عبداللہ سے حاصل کی۔ خرقۂ تصوف بھی ان ہی کے دستِ مبارک سے زیبِ تن کیا۔ شیخ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن شہاب الدین کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ سید زین الدین بن محمد جدیلی، سید محمد بن احمد شاطری اور دیگر علما و فضلا کی بھی مصاحبت و ملازمت اختیار کی اور ان سے مستفید ہوئے۔

---

[۳۲] مرآتِ احمدی — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۲ — تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۲،۱۰۳

جب مروجہ علوم کی تحصیل کر چکے تو علمی سیر و سیاحت کی غرض سے مختلف بلاد و امصار کا رُخ کیا۔ سب سے پہلے احمد آباد (گجرات) تشریف لائے، وہاں ان کے ماموں شیخ جعفر صادق قیام فرما تھے۔ عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے۔ پھر بلادِ دکن کو رختِ سفر باندھا۔ وہاں بعض امرائے مملکت سے منسلک ہو گئے اور طویل عرصہ تک اس علاقے میں سکونت پذیر رہے۔ نہایت کریم، فیاض اور سخی تھے، جو بات زبان سے کہتے اس پر عمل کر کے دکھاتے۔ حدیث، فقہ اور ادب کے بہت ماہر تھے۔ فصاحت و بلاغت اور لغت میں یگانۂ روزگار تھے۔ دیگر علوم میں بھی ماہر تھے۔ کتاب و سنت کے عالم اور عامل تھے۔ ان کا سلسلۂ درس و تدریس جاری تھا اور طالبین و مریدین کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ ارادت مندوں کو مشائخ متقدمین کے انداز میں تصوف و سلوک کی راہوں پر گام زن ہونے کی تلقین کرتے تھے۔

اس رفیع المرتبت شافعی عالمِ دین نے ۱۰۷۳ھ کو حیدر آباد میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔[۳۳]

۳۴- شیخ احمد بیجاپوری

شیخ احمد بیجاپوری، حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ لفظِ محدث، ان کے نام کا جزو ہو گیا تھا اور یہ شیخ احمد محدث بیجاپوری کے نام سے معروف تھے۔ والد کا اسم گرامی عبداللہ تھا۔ قاضی عبداللہ بیجاپوری کے داماد اور بھانجے تھے۔ حدیث اور فقہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ بن طہماسپ شاہ کے دور کے جلیل القدر عالمِ دین تھے۔ بیجاپور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔[۳۴]

---

[۳۳] محبوب ذی المنن — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۵۳، ۵۴

[۳۴] روضۃ الاولیا ص — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۲

۳۴۔ شیخ احمد بن علوی حضرمی

شیخ احمد کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ احمد بن علوی بن عمر بن عقیل بن محمد بن احمد بن عبد اللہ بن محمد جمیل حضرمی۔ شیخ احمد گیارھویں صدی ہجری کے بہت بڑے شافعی المسلک عالم و فقیہ تھے۔ "روغہ" نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور وہیں اپنے والد علوی کی گود میں پرورش پائی۔ سب سے پہلے امام ابو عمر کی روایت کے مطابق قرآن مجید پڑھا۔ پھر علوم مروجہ کی تحصیل شروع کی۔ حدیث اور فقہ میں کامل عبور حاصل کیا۔ حصولِ علوم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے وطن کو خیرباد کہا اور عازم دیار ہند ہوئے۔ اس نواح میں کئی سال مقیم رہے۔ پھر مکہ مکرمہ کو روانہ ہوئے۔ حج و زیارت کی سعادت حاصل کی اور وہاں کے اساتذہ کی کثیر جماعت سے علمی استفادہ کیا۔ حدیث، فروع اور علوم عربیہ میں مہارت پیدا کی اور پھر دوبارہ وارد ہند ہوئے۔ [۳۵]

۳۵۔ شیخ احمد بن علی بُسکری

شیخ شہاب الدین احمد بن علی بن احمد بُسکری، نہایت متقی، مصلح وقت صالح عالمِ دین اور فاضلِ کبیر تھے۔ مسلکاً مالکی تھے۔ اپنے والد شیخ عبد القادر بن شیخ عیدروس اور دیگر اساتذۂ عصر سے علم حاصل کیا۔ کامل الصفات اور بلند افکار و خیالات کے حامل تھے۔ یومِ آخرت سے بہت ڈرتے تھے۔ متبع کتاب و سنت مسلکِ سلف کے پابند، قناعت پسند، عفیف اور نیک شخصیت تھے۔ کسی وقت بے کار نہیں رہتے تھے، جب دیکھو یا تو کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہیں یا کچھ لکھ رہے ہیں۔ یعنی ان کا سارا وقت قلم و قرطاس کی صحبت میں گزرتا تھا۔ وفات سے

---

۳۵ المشرع الروی۔ از شلی ــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۵۸

کر عرصہ قبل نابینا ہو گئے تھے۔ بعض اہل علم نے ان کی مدح میں بڑے اچھے شعر کہے ہیں۔ مثلاً اس دور کے ایک ادیب شیخ عبداللطیف بن محمد دبیر کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

اعنی به احمد المختار سیرته	خلقا وخلقا سواه لا یساویه
شهاب نجل علی البسکری بلدا	المالکی مذهبا من ذا یسامیه
قد خصه بجمیل الفضل خالقه	بسر علی معان فی معالیه
له بدیع بیان فی الخطاب یری	وجیز لفظ وقد جلت معانیه
اخباره قد اتت فی الحال تخبر عن	ابیات افکاره المخصوص من فیه
حدیثه الحسن اعالی روایته	اعلت لسامعه شأنا وراویه

منقول ہے کہ علم و فضل، ذکاوت و فطانت، ادب و فصاحت اور تقویٰ و تدین میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ دین داری اور احکام خداوندی کے بارے میں نہ جھجک اور خوف محسوس کرتے تھے، نہ کسی کی ملامت کی پرواہ کرتے تھے۔ شیخ احمد بن محمد حضرمی باجابر کا شوٹے اشعار میں کہا۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

زم المطی بحمله یا ساری	عن ان یسیر باسوء الاخبار

اس سلسلے کے دو شعر یہ ہیں:

حق البقاء علی الذی حاز العلی	سهر اللیالی والنجوم سواری
اعنی الشهاب الجاسری فانه	قد کان خلا خالصا مختاری

اس نامور مالکی عالم دین نے احمد آباد (گجرات) کو اپنا مستقل وطن قرار دے لیا تھا اور ہفتے کی رات ۲۳ ربیع الثانی ۹۰۰ھ احمد آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔

۳۶۔ شیخ احمد بن مجتبیٰ مانک پوری

شیخ احمد بن مجتبیٰ بن مبارک بن احمد بن نور بن حامد حسینی رضوی مانک پوری احمد حلیم کے نام سے معروف تھے، نہایت صالح عالم دین تھے اور مشائخ چشتیہ

میں سے تھے۔ مانک پور ہیں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ اپنے والدِ گرامی شیخ مجتبیٰ سے علم فقہ حاصل کیا۔ طریقت وتصوف کی منزلیں بھی ان ہی کی صحبت میں طے کیں اور طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہے۔ بعدازاں ارشاد وتلقین کی مسند پر متمکن ہوئے اور خلقِ کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ اس عالم دین نے ۵ اجمادی الاولیٰ ۱۰۴۰ھ کو شہر مانک پور میں وفات پائی۔[۳۶]

۳۷۔ شیخ احمد بن محمد حضرمی

شیخ احمد بن محمد بن عبدالرحیم شہاب حضرمی گجراتی، اپنے عصر کے فاضلِ اجل اور رفیع المرتبت عالم دین تھے۔ شافعی المسلک تھے اور باجابر الشافعی الحضرمی کے نام سے مشہور تھے۔ فقہِ شافعی پر عبور رکھتے تھے۔ اس لیے اہلِ علم کی محفلوں میں لفظ "فقیہ" ان کے نام کے جزکے طور پر استعمال ہونے لگا تھا۔ علم وفضل میں منفرد اور تقویٰ و تدین میں یگانہ تھے۔ اپنے والدِ نامدار شیخ محمد حضرمی سے اکثر علوم حاصل کیے، اور ان ہی کی آغوشِ تربیت میں نشو ونما پائی۔ پھر دیگر علمائے کرام کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ بعدازاں واردِ ہند ہوئے اور شیخ عبدالقادر بن عیدروس وغیرہ اصحابِ علم کی خدمت میں حاضری دی۔ بہت بڑے محقق، جودتِ فکر میں معروف، دقیق سے دقیق مسائل حل کرنے میں ماہر، نیک، عالم عصر اور امامِ وقت تھے حافظہ نہایت تیز پایا تھا اور ذہنی وفکری اعتبار سے بلند مرتبہ کے حامل تھے۔ دیگر مروجہ علوم وفنون کے علاوہ کتبِ ادب، لغت اور دواوین شعر پر گہری نظر تھی اور اس سلسلے کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے حافظہ میں محفوظ تھا۔ گوناگوں علمی صلاحیتوں کی بنا پر اس دور کے علما وفضلا کے نزدیک بڑی قدر ومنزلت کے مالک تھے۔ متعدد حضرات کی طرف سے انھیں درس وتدریس اور افتا کی اجازت

---

[۳۶] گنج ارشدی ص — نزہتہ الخواطر، ج ۵ ص ۵۹، ۶۰

حاصل تھی اور بے شمار واقعات، ادبی لطائف اور اشعار، انھیں مستحضر تھے، نپی تلی اور سلجھی ہوئی گفت گو کرتے تھے۔

یہ جلیل القدر عالم دین اور نامور شافعی فقیہ ۹۹۶ھ کو حج بیت اللہ سے سعادت اندوز ہوئے۔ وہاں مشائخ حجاز میں سے سید ابوبکر بن ابو القاسم الشہیر بصائم الدہر، امام کبیر شیخ محمد الخاص، علامہ ابو القاسم مطیر، ان کے بیٹے امام ابوبکر اور بھائی علامہ امین، شیخ احمد الشنخر، علامہ محدث سید طاہر بن حسین اہدل، علامہ عبدالملک بن عبدالسلام دعسی اور سید حاتم بن اہدل وغیرہ سے اخذ علم کیا اور ان کی صحبت میں رہے انھوں نے ان کو متعدد کتابوں کے درس و تدریس کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس دوران میں ربیع الاول ۹۹۷ھ سے لے کر جمادی الاولی ۹۹۸ھ تک شیخ عبدالقادر حضرمی کی خدمت میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔ ان سے بڑا استفادہ کیا اور پھر بلادِ ہند میں جانے کی اجازت لی۔ وہاں سے برہان پور گئے۔ برہان پور کا حکمران اس زمانے میں سلطان علی عادل شاہ تھا۔ اس نے ان کی بڑی پذیرائی کی، وہاں کے علما و فضلا اور رؤسا نے بھی گرم جوشی سے استقبال کیا اور ان کی تشریف آوری پر خوشی اور مسرت ظاہر کی۔ برہان پور میں ان کو انتہائی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی اور شیخ عبداللطیف دبیر نے ان کی آمد پر یہ شعر کہے:

الجابر بن شہاب دفق فضیلۃ فی النظم فاق البحر راحاجر

وافی دیار الہند یا لک وافدا ووصولہ وقدومہ لی جابر

شیخ احمد بن محمد حضرمی کی وفات لاہور میں ہوئی اور انھیں زہر دے کر مارا گیا۔ بات یہ ہوئی کہ یہ بُرہان پور پہنچے تو شیخ عبداللطیف دبیر نے اپنا کتب خانہ دکھایا اور تمام کتابوں سے مطلع کیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ شیخ عبداللطیف۔ وفات پا گئے اور بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر کی طرف سے فیضی کو ایک اعلیٰ منصب پر متعین کر کے دکن بھیجا گیا۔ اثنائے سفر میں فیضی کا گزر برہان پور سے ہوا تو والی برہان پور سلطان علی عادل شاہ نے راجہ علی خاں کو بہت سے تحائف دے کر فیضی کے پاس بھیجا۔ فیضی نے سلطان کو کہلا بھیجا کہ مجھے تحائف کی ضرورت نہیں۔ البتہ فلاں کتاب دی جائے، جو

شیخ عبداللطیف کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے اور وہ ذخیرۂ کتب اب سلطان علی عادل شاہ کے قبضے میں ہے۔ سلطان مذکور کو فیضی کے اس سوال سے ذہنی کوفت ہوئی۔ وہ کتاب نہیں دینا چاہتا تھا مگر مجبوراً با دلِ نخواستہ کتاب فیضی کو دینا پڑی۔ پھر سلطان نے اپنے طور پر یہ تحقیق کی کہ فیضی کو اس کتاب کے متعلق کس نے اطلاع دی، تو پتا چلا کہ شیخ احمد باجابر فقیہ نے فیضی کو اس کی اطلاع دی ہے اور شیخ احمد کو خود شیخ عبداللطیف نے اپنی کتاب کے بارے میں معلومات مہیا کی تھیں۔ اس سے والی برہان پور کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ شیخ عبداللطیف بہت سے اسرارِ مملکت اور رازہائے سلطنت سے آگاہ ہیں۔ ممکن ہے انھوں نے کسی راز سے شیخ احمد باجابر فقیہ کو بھی مطلع کر دیا ہو اور وہ راز فیضی کے گوش گزار ہو جائے اور پھر فیضی کی معرفت اس کی اطلاع اکبر بادشاہ تک پہنچ جائے، اور اس طرح والی برہان پور کسی نئی مصیبت میں پھنس جائے۔۔۔ اتفاق سے ان ہی دنوں شیخ احمد باجابر فقیہ فیضی کی معیت میں عازم لاہور ہو رہے تھے۔ اس سے سلطان علی عادل شاہ کو اور بھی خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں شیخ اس کو راز کی باتیں نہ بتا دیں اور یہ باتیں اکبر تک پہنچ جائیں اور وہ اس سے بدظن ہو جائے۔۔۔ اس خوف اور خطرے کے پیشِ نظر اس نے اپنے چار غلاموں کو شیخ کے ساتھ کر دیا اور ان کو ہدایت کی کہ راستے میں جہاں کہیں ان کا داؤ لگے، زہر دے کر شیخ کو ہلاک کر دیں۔ چنانچہ لاہور کے قریب پہنچے تو ان کو موقع ہاتھ آ گیا اور وہ شیخ احمد باجابر فقیہ کو زہر دینے میں کامیاب ہو گئے، جس سے شیخ کو سخت تکلیف اٹھانا پڑی اور وہ بدرد کی رات ۴ شوال ۱۰۰۱ھ کو لاہور میں وفات پا گئے۔

ان کی وفات سے بزمِ علم و فضل سونی ہو گئی، ادب و شعر کی رونقیں ختم ہو گئیں اور فقہ و حدیث کے دقیق مسائل پر بحث و مذاکرہ کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ مختلف ہم عصر علما نے اس پر شدید کرب کا اظہار کیا اور ان کی وفات پر دردناک مرثیے کہے۔ شیخ شہاب الدین احمد بن علی بسکری نے سو سے زیادہ اشعار پر مشتمل

قصیدہ کہا - ایک شعر یہ ہے :

زم المطی لحمله یا ساری　　عن ان یسیر باسوء الاخبار

قصیدہ کے دو شعر یہ ہیں :

حق البکاء علی الذی حاز العلی　　سهر اللیالی والنجوم سواری

اعنی الشهاب الجابری فانه　　قد کان خلا خالصا مختاری

شیخ محمد بن عبداللطیف جامی الشہیر بہ مخدوم زادہ کے مرثیے سے دو شعر ملاحظہ ہوں :

مات الشهاب وکل حی هالك　　لم یبق الا الواحد القهار

فالله یرحمه ویجبر کسره　　فهو الرحیم المالك الغفار

اس سے قبل شیخ محمد بن عبداللطیف موصوف نے شیخ احمد باجابر فقیہ کے ارضِ ہند میں ورود کے موقع پر جو قصیدہ کہا تھا، اس کے تین شعر یہ ہیں :

ماجال فی خلدی ولا فی خاطری　　انی افوز بوصل ذاك الجابری

کلا ولا ظننت انی فی الکری　　احظو بوصل من جبیب هاجری

تری یقیناً ان طیف خیاله　　ادی الی طرف فی القریح الساهر

صاحبِ النور السافر فی اخبار القرن العاشر شیخ عبدالقادر حضرمی نے بھی ان کی موت پر ایک قصیدہ کہا تھا، جس سے دو شعر یہ ہیں :

سلام الله عود ابعد بدء　　علی قبر نوی فیه الشهاب

لقد جلت مصیبته لدینا　　وصار القلب منها فی التهاب

بہر حال شیخ احمد بن محمد حضرمی باجابر شافعی فقیہ بہت بڑے عالم اور فقہ و حدیث کے ماہر تھے اور ان کی موت اصحابِ علم کے لیے عظیم المیہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

۳۸ - مفتی احمد بن محمد بہاری

مفتی احمد بن محمد حسینی علوی بہاری، حاجی احمد سعید بن محمد سعید کے نام سے

سے معروف تھے، علاقہ بہار کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے - ان کے والد شیخ محمد بہاری اپنے دور کے صاحب علم و فضل بزرگ تھے - انھوں نے اپنے اس بیٹے کو خود ہی علوم و فنون کی تعلیم دی اور بہترین انداز سے اس کی تربیت کی - یہاں تک کہ یہ منزلِ فضیلت پر فائز ہوئے، درس و افتا کی مسند کو زینت بخشی، علم فقہ اور دیگر علوم میں کمال مہارت پیدا کی اور دیارِ ہند کے کبار فقہائے حنفیہ میں سے گردانے گئے - ہندوستان کے مغل حکمران شاہ جہان نے ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انھیں مفتیِ عساکر مقرر کر دیا تھا، طویل عرصہ تک اس منصب پر متمکن رہے اور نہایت حسن و خوبی سے یہ فرائض انجام دیے - واقعہ یہ ہے کہ مفتی احمد بہاری علوم عربیہ، فقہ و اصول، معرفتِ مذاہب، فہم دین اور فراستِ زیرکی میں دیگر علمائے عصر سے منفرد حیثیت کے مالک تھے -

ان کی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر اپنے آخری ایام حکومت میں شاہ جہان نے ان کو ترکی کی دولتِ عثمانیہ اور حرمین شریفین میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا اور اس منصب کی ذمہ داریوں کو انھوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ انجام دیا - اس اثنا میں حج بیت اللہ بھی کیا - واپس آئے تو شاہ جہان معزول ہو چکا تھا اور تاج شاہی اس کے بیٹے عالم گیر کے سر کی زینت بنا ہوا تھا - عالم گیر نے ان کی انتہائی تکریم کی اور بدرجۂ غایت عزت و احترام سے پیش آیا - ایک ہزاری منصب سے نوازا اور اپنی بہن جہاں آرا بیگم کا دیوان مقرر کیا - اس عالم دین نے ۱۰۸۷ھ میں وفات پائی [۳۷]

۳۹ - قاضی احمد عسکری بیجاپوری

قاضی احمد بن ابو احمد حسینی بیجاپوری، گیارھویں صدی ہجری کے ہندوستان کے

---

[۳۷] بادشاہ نامہ ــــ مرآۃ العالم ورق ۴۹۴ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۶۸ ــــ بزم تیموریہ ص ۲۵۰

معروف شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ بیجاپور کے حکمران ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں شہر بیجاپور میں عسکر سلطانی کے قاضی تھے اس لیے قاضی عسکری کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس عہدے پر کافی عرصہ تک فائز رہے۔ کبار علمائے وقت میں سے تھے منصب قضا کے نازک تقاضوں کو نہایت حسن خوبی سے پورا کیا اور اس میں کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔ بہترین خطاط بھی تھے۔ ۱۰۹۵ھ کو بیجاپور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔[۳۸]

۴۰۔ شیخ احمد سرہندی۔ مجدّد الف ثانی

حضرت شیخ احمد سرہندی، جمعہ کے روز ۱۴ شوال ۹۷۱ھ کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ نسباً فاروقی تھے۔ سلسلۂ نسب ستائیس واسطوں سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ذریعے امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ سے ملتا ہے۔ والدِ مکرم کا اسم گرامی شیخ عبدالاحد تھا جو فاضلِ اجل اور فقہ، اصولِ فقہ، اور معقولات ومنقولات کے ماہر تھے۔ طریقت وتصوّف میں بھی کامل تھے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صاحب زادۂ گرامی، شیخ رکن الدین گنگوہی سے بیعت تھے اور سلسلۂ چشتیہ میں ان سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ طریقۂ قادریہ میں شاہ کمال الدین کیتھلی سے مستفیض اور خرقۂ خلافت سے بہرہ مند تھے۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں بھی منازلِ سلوک طے کی تھیں۔ شیخ عبدالاحد نے اسّی سال عمر پاکر ۱۷ رجب ۱۰۰۷ھ کو سرہند میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

سرہند کی تعمیر

سرہند ایک مشہور شہر ہے جو ضلع پٹیالہ (مشرقی پنجاب۔ ہندوستان) میں واقع ہے۔ سرہند دراصل سہرند تھا۔ یہ دو الفاظ — "سہ" اور "رند"، — سے مرکب ہے اور اس کے معنی ہیں شیروں کا جنگل — "سہ" کے معنی شیر اور

---

[۳۸] محبوب ذی المنن — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۶۹،۷۰۔

"رند" کے معنی جنگل کے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں یہ علاقہ بہت بڑا جنگل اور شیروں کا مسکن تھا، اس لیے "سہرند" کے نام سے مشہور تھا۔ کہتے ہیں، فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ایک مرتبہ شاہی خزانہ محافظوں کی نگرانی میں لاہور سے دہلی منتقل کیا جارہا تھا، جب قافلہ اس مقام پر پہنچا جہاں اب سرہند آباد ہے تو ایک صاحبِ کشف بزرگ پر جو قافلے کے ہمراہ سفر کر رہے تھے، یہ منکشف ہوا کہ یہاں ایک بہت بڑا ولی پیدا ہوگا ۔ یہ خبر بادشاہ کے گوش گزار ہوئی تو اس نے وہاں ایک شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا اور تعمیرِ شہر کا کام شیخ رفیع الدین کے سپرد کیا۔ شیخ رفیع الدین چھٹی پشت میں شیخ احمد سرہندی کے اجداد میں سے تھے۔ شہر کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد شیخ رفیع الدین وہیں آباد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد کثرتِ استعمال سے یہ شہر "سہرند"، سے "سرہند" میں بدل گیا، اور اب اس کو اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ابتدائی حالات

شیخ احمد سرہندی برصغیر کے ایک ایسے برگزیدہ خاندان کے چشم و چراغ تھے جو ابتدا ہی سے علم وفضل، زہد و ورع اور تدین و تقویٰ کی دولت سے مالا مال تھا۔ ان کے والدِ محترم شیخ عبدالاحد بھی صاحبِ علم وصلاح اور متبع کتاب و سنت بزرگ تھے۔ ان کی فیض رسانی کا سلسلہ بہت وسیع تھا اور بے شمار لوگ ان کے حلقۂ درس وافادہ میں شامل تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے بھی ابتدائی تعلیم اپنے والدِ ماجد سے حاصل کی۔ پہلے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر تفسیر و حدیث اور علومِ عقلیہ کی تکمیل کے لیے فحول و کبار علمائے کرام سے رجوع کیا۔ سیالکوٹ بھی گئے جہاں اس زمانے کے مشہور محدث و فقیہ مولانا یعقوب صرفی کشمیری اور مولانا کمال الدین کشمیری کا سلسلہ درس جاری تھا۔ شیخ احمد نے مولانا یعقوب سے سندِ حدیث حاصل کی اور معقولات کی بعض انتہائی کتابیں مولانا کمال الدین سے پڑھیں، جو اس دور کے عالم و محقق اور عابد و زاہد شخص تھے۔ سیالکوٹ میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی شیخ احمد کے ہم سبق و

ہم مکتب تھے۔ نواب سعد اللہ خاں بھی جو بعد کو مغل حکمران شاہ جہان کے وزیر مقرر ہوئے، اس زمانے میں مولانا کمال الدین کے حلقۂ درس میں شامل تھے۔

شیخ احمد سرہندی نے ذہن اس قدر اخاذ، حافظہ اس درجہ تیز پایا تھا اور حصول علم کا شوق ان پر اتنا غالب تھا کہ سترہ سال (اور ایک روایت کے مطابق اکیس سال) کی عمر میں تمام علوم مرّجہ سے فارغ ہوگئے تھے اور سرہند میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔

شیخ کی ذہانت و فطانت کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا تھا اور اصحاب علم ان سے بہت متاثر تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ جس زمانے میں شیخ آگرہ میں تفسیر و حدیث کے مطالعہ میں مشغول تھے، ابوالفضل اور فیضی نے جو اکبر بادشاہ کے دست راست تھے، ان کی ذہانت کی شہرت سن کر انھیں اپنے حلقۂ احباب میں شامل کرنے کی سعی کی، مگر یہ تعلق زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا، کیوں کہ ان کے دینی و مذہبی عقائد سے شیخ کو شدید اختلاف تھا۔ یہ بھی منقول ہے کہ فیضی کی مشہور بے نقط تفسیر سواطع الالہام کا کچھ حصہ شیخ سرہندی نے لکھا تھا۔[39]

خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں

شیخ احمد سرہندی کے زمانے میں دہلی کی مسند تصوّف پر حضرت خواجہ باقی باللہ متمکن تھے۔ حضرت خواجہ کا اصل وطن کابل تھا، وہ ترک وطن کرکے وارد ہند ہوئے تھے اور دہلی کو مسکن ٹھہرالیا تھا۔ اپنے عصر کے عظیم المرتبت صوفی اور رفیع القدر بزرگ تھے۔ ان کی تاریخ ولادت ۵ ذی الحجہ ۹۷۲ھ اور تاریخ وفات ۲۵ جمادی الاخری ۱۰۱۲ھ ہے۔ انھوں نے کل چالیس برس عمر پائی۔ اکبر کے عہد میں وارد ہند ہوئے اور دہلی میں اقامت گزیں ہوگئے تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے تکمیل علم کے بعد خود مسند تدریس آراستہ کی اور منازل سلوک طے کیں۔ اس کے بعد دہلی میں خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ باقی باللہ ان کی فراوانیِ علم وفضل، جودت

---

[39] روضۃ القیومیہ رکن اول ص ۶۱، ۶۲، ۶۳ — حضرات القدس ج ۲ ص ۱۰۹۔

طبع اور زہد و تقویٰ سے نہایت متاثر ہوئے اور بہت ہی قلیل مدت میں انھوں نے حضرت خواجہ سے تمام مراتب سلوک طے کر لیے۔ اس ضمن میں حضرت خواجہ اپنے ایک دوست کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

شیخ احمد مردیست از سرہند، کثیر العلم و قوی العلم، روزے چند فقیر با او نشست و برخاست کرد۔ عجائب بسیار از روزگار او وقات او مشاہدہ نمود، بآں ماند کہ چراغے شود کہ عالمہا ازو روشن گردد۔ الحمد للہ تعالیٰ احوالِ کاملہ او مرا بیقین پیوستہ۔[۴۰]

شیخ احمد سرہند کے رہنے والے ہیں۔ کثرتِ علم اور پختگیٔ علم میں یکتا ہیں۔ کچھ مدت فقیر نے ان کے ساتھ نشست و برخاست کی۔ ان کے کوائفِ اوقات سے بہت عجائبات مشاہدہ میں آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک چراغ کی طرح چمکیں گے جس سے کئی جہان روشن ہوں گے۔ الحمد للہ، ان کے احوالِ کاملہ سے مجھے اس بات کا یقین ہو چکا ہے۔

ورودِ لاہور

خواجہ باقی باللہ نے حکم سے شیخ احمد سرہندی، واردِ لاہور ہوئے۔ لاہور میں ان کے علمی فیوض و کمالات نے بڑی شہرت پائی۔ یہاں کے جلیل القدر علما جن میں مولانا جمال الدین تلوی اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، ان کے حلقۂ بیعت و ارادت میں داخل ہوئے اور بہت سے مشائخ نے ان سے فیض حاصل کیا۔ شیخ لاہور ہی میں تھے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات کی خبر پہنچی۔ شیخ لاہور سے پاپیادہ دہلی پہنچے اور اپنے مرشد زادوں، ان کے عقیدت مندوں اور دیگر حضرات سے اظہارِ تعزیت کیا۔ یاد رہے، حضرت خواجہ کے پسماندگان میں دو کم عمر بیٹے تھے، ایک کا نام خواجہ عبید اللہ اور ایک کا خواجہ عبداللہ تھا۔ دو بیوگان تھیں اور یہ دونوں لڑکے ان دونوں کے بطن سے تھے۔

مذہبی حالات

شیخ احمد سرہندی کی پیدائش شہنشاہِ ہند جلال الدین اکبر کے عہد میں ہوئی۔

---

[۴۰] مقامات امام ربانی، ص ۱۱

اکبر کا عہد حکومت ۹۶۳ھ سے شروع ہو کر ۱۰۱۴ھ تک چلتا ہے اور اکیاون سال کے لیل و نہار میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی حکومت کے ابتدائی عہد کو اسلامی عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن بعد میں اس کی زندگی کا دھارا بالکل بدل گیا تھا اور اسلامی احکام و اوامر کو ترک کر کے اس نے ہندوانہ رسوم و رواج کو خود بھی اپنا لیا تھا اور اپنی حکومت میں بھی یہ رسوم نافذ کر دی تھیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی اکبر کا درباری عالم اور اس کا ہم عصر مؤرخ ہے۔ وہ ایک پُرجوش اور پابندِ اسلام مؤرخ ہے۔ اس نے اپنی مشہور تصنیف منتخب التواریخ میں وہ واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں، جو اکبر کے اسلام سے دور ہونے کا باعث بنے۔ ملا بدایونی لکھتا ہے کہ بادشاہ اپنی ہندو رعایا کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اپنا رُخ اسلام سے پھیر لیا تھا۔ اس نے علمائے سوء کی بے حد ہمت افزائی کی جو اس کا ہدفِ عنایات بننے کے لیے ہر قدم اٹھانے کو تیار رہتے تھے۔ اس نے اپنے گرد و پیش ایسے لوگوں کو جمع کر لیا تھا جو وحی اور شریعت کے منکر تھے۔ عقیدۂ وحی کے حاملین کو پرانی ذہنیت کے مقلدین قرار دیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے علی رؤس الاشہاد اسلام کی مخالفت کی اور احکام اسلامی کو عارضی اور نامعقول قرار دیا۔ ہندوؤں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زبانِ طعن دراز کی اور برملا آپ پر سب و شتم کیا۔ بادشاہ قرآن کا منکر ہو گیا تھا، حیات بعد الممات اور یوم جزا کا انکار کرتا تھا۔ اس نے پہلے یہ حکم دیا تھا کہ لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ بر سر عام پڑھا جائے لیکن جب اس سے ہنگامہ آرائی کا خطرہ پیدا ہوا تو مصلحتاً اس کلمہ کو حرم سرائے کی چار دیواری تک محدود رکھنے کا حکم دیا گیا۔ سجدہ جسے اسلام نے فقط اللہ کے لیے مخصوص کیا ہے، بادشاہ کے لیے لازم ٹھہرایا گیا۔ شراب نوشی حلال کی گئی، خنزیر کا گوشت جزو خوراک بنایا گیا، جزیہ موقوف کر دیا گیا۔ ذبیحہ گاؤ حرام قرار دیا گیا، ملک میں کتے اور سؤر کے بچوں کی پرورش کو خاص طور پر مروج کیا گیا، کیوں کہ وہ مظہرِ الٰہی سمجھے جاتے تھے۔ صوم و صلوٰۃ اور حج منسوخ کیے گئے۔ تقویم اسلامی کے بجائے الٰہی ماہ و سال رائج

کیے گئے اور کہا گیا کہ اسلام ایک ہزار سال کے بعد ختم ہوگیا ہے۔ عربی کی تعلیم کو بنظرِ حقارت دیکھا جانے لگا، اذان اور نماز با جماعت جس کی پابندی پانچ وقت دیوانِ حکومت میں کی جاتی تھی، بند کردی گئی۔ اس طرح اور بھی بہت سے اسلامی احکام پر عمل پیرا ہونے سے سختی سے روک دیا گیا تھا جو علمائے کرام اسلام کی کھل کر تبلیغ کرتے یا بادشاہ سے اختلاف کی جرأت کرتے یا ارکانِ دین پر کاربند ہوتے انھیں یا تو جلاوطن کردیا جاتا یا دور دراز علاقوں میں بھیج دیا جاتا یا جیل میں محبوس کردیا جاتا یا موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔

اکبر کے بعد ہندوستان کا تختِ حکومت، جہاں گیر کے سپرد ہوا۔ جہاں گیر عملی اور فکری اعتبار سے اگرچہ باپ سے بہت مختلف تھا، تاہم بعض گمراہیاں اس وقت بھی موجود تھیں ــــ یہ وہ حالات تھے جو واقعتہً کسی مصلح اور مجدد کی آمد کے طالب تھے اور متقاضی تھے کہ کوئی ایسا شخص پیدا ہو جو از سرِ نو اسلام کی نشر و اشاعت کا اہتمام کرے اور کسی خوف اور خطرے کی پرواہ کیے بغیر اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے میدانِ عمل میں نکلے۔

مسندِ تدریس

چنانچہ اس دور میں اللہ نے شیخ احمد سرہندی کے دل میں اعلائے کلمۃ اللہ کا جذبہ پیدا کیا اور وہ اس کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے اپنے شہر سرہند میں مسندِ تدریس آراستہ کی اور تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، علمِ کلام اور تصوّف کا درس دینا شروع کیا۔ ان کے حلقۂ درس میں بے شمار علما و طلبا شریک ہوتے اور شیخ ان کو تفسیر بیضاوی، صحیح بخاری، مشکوٰۃ، ہدایہ، بزدوی، شرح المواقف اور عوارف المعارف وغیرہ کتابوں کا درس دیتے۔ یہ گویا شیخ کا پہلا حلقۂ دعوت و ارشاد تھا۔

منصبِ تجدید

اب زمانے نے انگڑائی لی، افقِ سرہند سے جمالِ حق کی شعاع پھوٹی اور حجۃ الاسلام

مجدد العصر شیخ احمد سرہندی قدس اللہ سرہٗ منصبِ تجدید پر فائز ہوئے۔ وقت آیا کہ بدعات کی شبِ تاریں سنت و ہدایت کی مشعل فروزاں ہو اور رسولِ عربی علیہ الف الف تحیۃ وسلام کے لائے ہوئے دین کو الحاد و زندقیت کی آلودگیوں سے پاک کر کے اپنے سادہ اور صحیح رنگ میں جلوہ گر کیا جائے۔ حضرت مجدد امن و عافیت کی وادی سے باہر نکلے اور دعوت و اصلاح کی امتحان گاہ میں پہنچ گئے۔ وہ نصرتِ الٰہی پر اس درجہ یقین رکھتے تھے کہ نہ شہنشاہِ ہند کا تخت و تاج انھیں مرعوب کر سکا، نہ اس کا جبر و جلال ان کا راستہ روکنے میں کامیاب ہو سکا اور نہ اس کا لشکرِ جرار ان کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں میں رکاوٹ پیدا کر سکا۔

شیخ احمد سرہندی بلا شبہ اپنے وقت کے مجدد تھے، سب سے پہلے جس شخص نے ان کو مجدد الف ثانی کے لقب سے ملقب کیا، وہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی تھے روضۃ قیومیہ کی روایت کے مطابق مولانا عبدالحکیم نے ایک مکتوب میں ان کو ان الفاظ سے مخاطب فرمایا — امام ربانی محبوب سبحانی مجدد الف ثانی —

زمانۂ طالب علمی کے تیس سال بعد ۱۰۲۲ھ میں ان دونوں نامور شخصیتوں کے درمیان از سرِ نو تعلقات استوار ہوئے، اور اب تعلقات کی نوعیت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اس طویل عرصے میں دونوں کی علمی شہرت دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی تھی۔ مولانا عبدالحکیم کی علوم تفسیر و حدیث میں مہارت، علم کلام اور منطق و فلسفہ اور دیگر علوم میں عبور کی دھوم صرف مسجد کی چار دیواری تک محدود نہ رہی تھی بلکہ امرا و وزرا کے ایوانوں سے بھی آگے بڑھ کر بادشاہ کے فلک بوس محلوں تک جا پہنچی تھی اور شیخ کے دل میں بھی ان کی انتہائی قدر و منزلت جاگزین تھی۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ شیخ نے ان کو "آفتابِ پنجاب" کا خطاب عطا فرمایا۔

دوسری طرف شیخ احمد سرہندی، امام الشریعت، قیوم اول اور مجدد الف ثانی کے پُر عظمت القاب سے ملقب ہو چکے تھے اور سرزمینِ برصغیر میں سرہند کو علم و فضل کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی

بایں شکوہِ علم و فضل سرہند گئے اور شیخ کی بیعت سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے "دلائل التجدید"، کے نام سے ایک رسالہ سپردِ قلم فرمایا، جس میں دلائل و براہین سے شیخ کے مجدد ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ اور خود شیخ نے بھی مکتوبات میں کہیں اشارۃً اور کہیں صراحتاً مجددالف ثانی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ اپنے بیٹے خواجہ محمد صادق کو ضرورتِ مجدد کا شدید احساس کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

اے فرزند! ایں وقت آں است، کہ در امم سابقہ دریں طور وقتے کہ پُر از ظلمت است، پیغمبر اولوالعزم مبعوث می گشتند و احیائے شریعت جدیدہ می کردند، و دریں امت کہ خیرالامم است، پیغمبر ایشاں خاتم الرسل علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیمات علما را مرتبۂ انبیائے بنی اسرائیل دادہ اند و بوجود علما از وجود انبیا کفایت فرمودہ اند، لہٰذا بر سر ہر مائۃ از علمائے ایں امت مجددے تعین می نمایند کہ احیائے شریعت فرمائند، علی الخصوص بعد از مضیّ الف کہ در امم سابقہ وقتِ بعثتِ پیغمبر اولی العزم است و بہ ہر پیغمبرے دراں وقت اکتفا نمودہ اند، دریں طور وقتے عالمے عارفے تام المعرفت درکار است کہ قائم مقام اولوالعزم امم سابقہ باشد[لے]

اے عزیز! یہ وہ وقت ہے، جبکہ ایسے ظلمت سے بھرے ہوئے دور میں پہلی امتوں میں اولوالعزم پیغمبر مبعوث ہوتے تھے اور نئی شریعت کا احیا کرتے تھے، اور اس امت (محمدیہ) میں جو خیرالامم ہے اور اس امت کے رسول خاتم الرسل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں، اس کے علما کو انبیائے بنی اسرائیل کا درجہ عطا کیا گیا ہے اور انبیا کے بجائے علما کے وجود کو کافی سمجھا گیا ہے۔ اسی لیے ہر صدی کے آخر میں اس امت کے علما میں سے ایک مجدد متعین کرتے ہیں تاکہ وہ شریعت کا احیا کرے۔ بالخصوص ہزار سال کے بعد جو کہ اولوالعزم پیغمبر کے مبعوث ہونے کا وقت ہے، اور اس وقت ہر پیغمبر پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ پیغمبرِ اولوالعزم کو مبعوث فرمایا۔ اسی طرح اس زمانے میں ایک ایسے عالم و عارف کی ضرورت

لے دفترِ اول۔ مکتوب ۲۳۴

ہے جو پوری معرفت رکھتا ہو اور گزشتہ امتوں کے اولوالعزم پیغمبر کے قائم ہو۔

ایک اور مکتوب میں واضح الفاظ میں اپنے مجدد ہونے کا اعلان فرماتے ہیں، ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے :

یہ معارف احاطۂ ولایت سے بالاتر ہیں، ان کے سمجھنے میں علمائے ظواہر کی طرح اصحابِ ولایت عاجز و قاصر ہیں، یہ علوم انوارِ نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والتحیہ کی مشکوٰۃِ نبوت سے مقتبس ہیں، جو الف ثانی کی تجدید کے بعد تبعیت و وراثت کے طور پر تر و تازہ اور ظہور پذیر ہوئے۔ ان علوم و معارف کا حامل اس الف کا مجدد ہے، چنانچہ اس کے علوم و معارف میں جو ذات و صفات اور افعال سے متعلق ہیں، اصحابِ نظر و فکر پر یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ان علوم کی تربیت احوال و مواجید اور تجلیات و ظہورات سے ہوتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ علوم و معارف علما کے علوم اور اولیا کے معارف سے بہت بلند اور ماورا ہیں۔ بلکہ اولیا و علما کے علوم ان علوم کے مقابلے میں قشر اور چھلکے کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان معارف کو ان چھلکوں کے اندر مغز کا درجہ حاصل ہے۔ اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی ہادی ہے۔ جان لینا چاہیے کہ ہر سو سال بعد ایک مجدد ہو گزرا ہے، لیکن سو سال کا مجدد اور ہے اور ہزار سال کا مجدد اور — جس قدر سو اور ہزار سال کے درمیان فرق ہے، اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ ان دونوں مجددوں کے درمیان فرق ہے۔ اور مجدد وہ ہوتا ہے کہ جو فیض اس مدت میں امتوں کو پہنچتا ہے، اسی کے ذریعے پہنچتا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں اقطاب اوتاد بھی موجود ہوں اور ابدال و نجبا بھی۔[۴۲]

ایک اور مقام پر اپنے صاحب زادۂ گرامی خواجہ محمد معصوم کو ایک مکتوب تحریر فرماتے ہیں، جس کا ترجمہ درج ذیل ہے :

اے فرزند! باوجود اس امر کے جو میری آفرینش سے متعلق ہے، ایک بہت بڑا کام میرے سپرد کیا گیا ہے۔ مجھے پیری مریدی کے لیے اس دنیا میں نہیں لایا گیا اور نہ میرے وجود سے ارشاد و تربیت

مقصود ہے، معاملہ کچھ اور ہی ہے اور اللہ تعالیٰ مجھ سے کچھ اور ہی کام لینا چاہتا ہے۔ ہاں اس سلسلے میں جس کو مناسبت ہو، وہ یہ فیض بھی حاصل کرے، جو کام اللہ کو مجھ سے لینا مقصود ہے، اس کے مقابلے میں یہ دعوت و ارشاد کا کام بہت ہیچ ہے۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت کو ان کے باطنی معاملات سے یہی نسبت تھی، اگرچہ منصبِ نبوت ختم ہو چکا ہے، لیکن نبوت کے کمالات و خصائص سے بطریقِ تبعیت و وراثت، انبیائے کرام علیہم السلام کے کامل متبعین کو بہرہ حاصل ہے[۴۳]

حضرت علامہ نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تصنیف تقصار جنود الاحرار میں شیخ کے حالات بیان کرتے ہوئے، انھیں مجدد، متبحر عالم، عارف کامل متبع سنت اور شدید مخالفِ بدعات قرار دیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

عالم، عارف، کامل مکمل بود۔ طریقۂ نقشبندیہ را امام عہد است و برائے صوفیا در مسالک سلوک مجدد، مکتوبانش در سہ مجلد است۔ دلیل واضح اند بر علوِ علم و کمال تبحر او در معرفت وبلوغ غایت مقامات، ترجمۂ شریفۂ او رسالہا ساختہ اند۔ ایں موقع مختصر ذکر آں کمالات را نمے تواند گنجد۔ حریص بود بر اتباع سنت و ترکِ بدعت، وجود امثال شاہ ولی اللہ و میرزا جانِ جاناں مظہر در اصحاب طریقۂ او کفایت است از برائے دریافت قدر و منزلت وے، رضی اللہ عنہ۔ و بالجملہ امام اہلِ سنت بود در عہدِ خود، و طریقہ علیہ وے رحمۃ اللہ علیہ مبنی بر اتباع کتاب و سنت در ظاہر و باطن، و نہ پذیرفتن چیزے کہ مخالف ایں ہر دو اصل محکم باشد، و ایں مکتوبات اصولِ عظیمہ است از برائے وصول بمنازل معرفت و قبول، طالب صادق و سالک راغب را در ہیچ وقت از اوقات از مطالعہ آں بے نیازی حاصل نیست[۴۴]۔

یعنی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ عالم و عارف اور کامل و مکمل تھے۔ اپنے عہد میں طریقۂ نقشبندیہ کے امام تھے اور صوفیا کے لیے راہِ سلوک کے مجدد، معرفتِ خداوندی

---

۴۳ دفتر دوم۔ مکتوب ۶

۴۴ تقصار جنود الاحرار، ص ۱۱۱، ۱۱۲

اور مقاماتِ سلوک کی انتہا پر پہنچے ہیں ان کو جو علوِّ علم اور کمال تبحر حاصل تھا، اس پر ان کے مکتوبات شاہد اور واضح دلیل ہیں، جو تین جلدوں کو محتوی ہیں۔ ان کے مبارک سوانح میں کئی رسالے لکھے گئے ہیں۔ ان مختصر الفاظ میں ان کے کمالات کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اتباعِ سنت او رترکِ بدعت میں حریص تھے، شاہ ولی اللہ (محدث دہلوی) اور میرزا مظہر جان جاناں ایسے حضرات کا ان کے سلسلۂ طریقت میں داخل ہونا ان کی قدر و منزلت کے ثبوت کے لیے کافی ہے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ ــ خلاصۂ کلام یہ کہ وہ اپنے زمانے میں امام اہلِ سنت تھے، اللہ ان پر اپنی رحمت کی بارش کرے۔ ظاہر و باطن میں ان کا طریقہ کتاب و سنت پر مبنی ہے اور جو چیز ان دو محکم اصولوں کے خلاف ہو، وہ ان کے طریقے میں مقبول نہیں۔ معرفت و قبول کی منازل پر پہنچنے کے لیے یہ مکتوبات اصولِ عظیمہ ہیں۔ طالبِ صادق اور سالکِ راغب کو کسی بھی حال میں مکتوبات کے مطالعہ سے بے نیازی و بے اعتنائی نہیں ہو سکتی ــ

ریاض المرتاض میں حضرت نواب صاحب ممدوح رقم طراز ہیں:

علوِ مرتبہ کشف ہائے مجدد الف ثانیؒ دریافت باید کرد کہ از سر چشمۂ صحو سر زدہ، و گاہے مخالفِ شرع نہفتادہ بلکہ بیشتر را شرع مؤید است، و بعضے چناں است کہ شرع ازاں ساکت است و مرتبۂ او در اولیا مثل مرتبۂ اولو العزم است در انبیا۔[۴۵]

مجدد الف ثانی کے کشوف کے مرتبۂ بلند کا اس سے اندازہ کرنا چاہیے کہ وہ چشمۂ صحو سے ظہور پذیر ہوئے اور کبھی کوئی کشف خلافِ شریعت نہ ہوا، بلکہ اکثر کی شریعت موید ہے، اور بعض کشف ایسے ہیں کہ شریعت ان کے بارے میں ساکت ہے۔ اولیائے کرام میں ان کا مرتبہ ایسا ہے، جیسا انبیا علیہم السلام میں اولوا العزم نبیوں کا۔

شیخ محسن بن یحییٰ بکری تیمی الیانع الجنی میں ارقام فرماتے ہیں کہ حضرت مجدد نے جس انداز سے اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور جس اسلوب و طریق سے انھوں نے دین کے نشر و ذیوع کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرایا۔ اس میں وہ قطعی حق بجانب تھے اور اس

---

۴۵ ریاض المرتاض ص ۱۲۱، ۱۲۲

ضمن میں انھوں نے جو قدم اٹھایا، علما کی بہت بھاری اکثریت نے اس میں ان کی تائید کی۔ اگر کسی طرف سے اظہارِ اختلاف ہوا بھی تو بہت کم مسائل میں۔

وقلّ ما تعقب به عليه ورد من قوله والمسائل المعدودات التى شدد بها النكر عليه بعض اهل العلم فالحق انه مصيب فى بعضها وله تاويل سائغ فى البعض الاخر وشاركه فيها من هذا الطائفة ممن لا يحصى كثرة۔[۴۶]

بہت کم مسائل ہیں، جن میں حضرت مجدد کی تعقیب اور تردید کی گئی ہے، اور جن بعض اہلِ علم نے کچھ مسائل میں ان سے اختلاف کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بعض مسائل میں مجدد صاحب برسرِ حق ہیں، بعض میں ان کی تعبیر درست ہے اور ان میں علما کی بہت بڑی تعداد ان کی مؤید اور ان سے متفق ہے۔

بدعات کی تردید اور سنت کی ترویج کے بارے میں مجدد صاحب نے جو موقف اختیار کیا اور جو خدماتِ عظیم انجام دیں، اس کے متعلق الیانع الجنی کے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

ومنها انه حقق الفرق بين البدعة والسنة واقيسة المجتهدين واستحسانات المتأخرين والتعارف عن المشهود لها بالخير وما احدثه الناس فى القرون المتأخرة وتعارفوه فيما بينهم، فرد بذلك مسائل مما استحسنها المتأخرون من فقهاء مذهبه۔[۴۷]

مجدد صاحب نے بدعت وسنت اور مجتہدین کے قیاس اور متاخرین کے استحسان میں فرق واضح کیا، اور قرونِ خیر میں اور متاخرین کی ان بدعات میں جن کو انھوں نے مستحسن قرار دے لیا تھا، امتیاز فرمایا اور ان مسائل کا رد کیا، جنھیں فقہائے متاخرین، بدعتِ حسنہ

---

[۴۶] الیانع الجنی ص ۶۶

[۴۷] الیانع الجنی ص ۶۵

سے تعبیر کرتے تھے۔

گھریلو صدمات اور حضرت مجدّد کا صبر و ضبط

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ انتہائی بلند حوصلہ اور پیکرِ تسلیم و رضا تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۱۰۲۵ھ میں طاعون کا مہلک مرض پورے زوروں سے پھوٹا۔ اس میں تین چار روز کے اندر اندر ان کے خاندان کے متعدد افراد لقمۂ اجل ہو گئے۔ ان کے بڑے بیٹے خواجہ محمد صادق (جو چوبیس[۲۴] سال کے جوانِ رعنا تھے۔ ۱۹ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ کو فوت ہوئے) دو کم سن بیٹے (محمد فرخ اور محمد عیسیٰ) ایک صاحب زادی (ام کلثوم) اور خاندان کے کئی افراد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خواجہ محمد صادق جیّد عالم، متقی اور بڑے پرہیز گار تھے۔ انتہائی اور مشکل کتبِ درسیہ طلبا کو پڑھاتے تھے، جن میں مطول مع حاشیہ میر، شرح عقائد مع حاشیہ خیالی اور تحریر اقلیدس خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ کتابیں خود حضرات القدس کے مصنف اور شیخ مجدد کے شاگرد خلیفہ ملا بدر الدین سرہندی نے ان سے پڑھی تھیں۔ خواجہ ممدوح اپنے چھوٹے بھائی محمد عیسیٰ کے جنازے میں گئے اور انھیں دفن کر کے واپس لوٹے تو طاعون کی گلٹی نمودار ہوئی اور دوسرے روز انتقال کر گئے۔ یہ تمام موتیں بالخصوص خواجہ محمد صادق کی موت حضرتِ مجدد کے لیے انتہائی باعثِ حزن و ملال تھی۔ اس کا اندازہ دفترِ اول کے آخر اور دفترِ دوم کے شروع کے ان مکتوبات سے ہوتا ہے، جو انھوں نے تعزیتی خطوط کے جواب میں لکھے۔ ان میں ایک مکتوب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے نام بھی ہے۔

عہدِ جہانگیری میں مجدّد الف ثانی کی مساعی

مجدّد الف ثانی کی ولادت شہنشاہ اکبر کے عہد میں ہوئی۔ اکبر کا عہدِ حکومت ۹۶۳ھ سے شروع ہوتا ہے۔ اس نے اکیاون[۵۱] سال سرزمینِ ہند پر حکومت کی اور ۱۰۱۴ھ کو وفات پائی۔ عہدِ اکبری کے اختتام کے وقت حضرت مجدّد کی عمر تینتالیس[۴۳] سال کی ہو چکی تھی۔ وہ اکبر کے زمانے میں کھل کر میدانِ جہاد میں نہیں اترے۔ البتہ درس و تدریس

تصنیف وتالیف اور مکتوبات کا سلسلہ جاری رہا۔ اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر تختِ ہند پر متمکن ہوا تو وہ کھل کر اور پورے زور سے میدانِ عمل و حرکت میں نکل آئے۔

اس زمانے میں جو گوناگوں برائیاں پھیلی ہوتی تھیں اور جن بدعات و منکرات کا زور تھا، ان کو ختم کرنے کے لیے حضرت مجدد الف ثانی نے جو طریق کار اختیار کیا، اس کو مختصر الفاظ میں مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ا۔ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کی بہت بڑی تعداد خدمتِ دین کی انجام دہی کے لیے تیار کی اور انھیں دینِ صحیح کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مختلف علاقوں اور شہروں میں متعین کیا۔ انھیں حکم دیا گیا کہ وہ اتباعِ سنت پر زور دیں اور لوگوں کو دائرۂ شریعت میں واپس لانے کے لیے جدوجہد کریں۔ اس مہم کو فقط سرزمین برصغیر پاک و ہند تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اس سے متصل دیگر مسلمان ملکوں میں بھی مؤثر و منظم طریق سے اس کا آغاز کیا گیا۔

۲۔ شیخ نے متعدد ملکوں، علاقوں، شہروں کے سرکردہ اور نامور افراد سے بہت بڑے پیمانے پر سلسلۂ مراسلات جاری کیا۔ یہ مراسلات و مکتوبات اب بھی موجود ہیں اور کئی بار شائع ہو چکے ہیں، ان میں شیخ کا انداز یہ تھا کہ دینی امور کی وضاحت اور مذہبی مسائل کی تفصیلات بیان کرنے اور ان اعتراضات کا تسلی بخش جواب دینے، جو اس زمانے میں عام طور پر اسلامی اوامر و احکام پر وارد کیے جاتے تھے اور جو لوگوں کے قلوب و اذہان میں ارکانِ حکومت کے ایک حلقے کی طرف سے مرتسم کر دیے گئے تھے۔ ان اعتراضات کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کی تشریح کی جاتی اور کتاب و سنت کی اتباع کو نقلی و عقلی دلائل سے ثابت کیا جاتا۔

۳۔ دربارِ شاہی کے معروف امرا اور مؤثر شخصیتوں کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کیا تاکہ ایک طرف یہ اپنے دائرۂ اثر کے لوگوں میں اسلامی ذہن پیدا کریں اور ان میں دینی انقلاب بپا کرنے کے لیے کوشاں ہوں، دوسری طرف بادشاہ کی

ذہنی و قلبی کیفیت کو بدلنے کے لیے اپنا ذاتی اور حکیمانہ اثر استعمال کریں۔

۴۔ چوتھی اہم اور عظیم جدوجہد یہ شروع کی کہ لوگوں سے یہ عہد لیا جائے کہ وہ بادشاہ کے ان احکام کی اطاعت نہیں کریں گے جو اسلام کے خلاف ہیں۔ اس سلسلۂ جدوجہد کو رعایا کے عوام سے شروع کر کے شاہی فوج کے اعلیٰ ارکان تک وسعت دی گئی اور ہر شخص کو متاثر کرنے کے لیے اس کی ذہنی و فکری سطح کے مطابق دینی ضوابط اور شرعی ذرائع عمل میں لائے گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں شیخ کو بڑی کامیابی ہوئی۔ ان کی آواز صرف عوام تک ہی محدود نہ رہی، بلکہ ان کی صدائے حق بادشاہ کے امرا و وزرا کے رفیع الشان محلوں تک جا پہنچی اور پھر ان کی وساطت سے قصرِ شاہی کے بابِ عالی پر دستک دینے لگی، بلکہ اس سے بھی آگے نکل کر خود بادشاہ کے کانوں میں جا گونجی۔ یہ ایک مردِ حق کی ایسی یلغار تھی، جس سے بادشاہ اور شاہی ارکان کے فکر و عمل کی بنیادوں میں لرزہ پیدا ہو گیا۔

ردِّ عمل

بادشاہِ ہند جہاں گیر اور اس کے بعض وزرا پر اس کا شدید ردِّ عمل ہوا اور وہ شیخ کی اس ہمہ گیر دینی جدوجہد سے گھبرا اٹھے۔ آصف جاہ جہاں گیر کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ شیخ احمد کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے، یہ نہایت سرکش اور حکومت کا باغی ہے اس کا اثر ہندوستان کی سرحدوں سے بھی آگے بڑھ گیا ہے اور ایران، توران اور بدخشان وغیرہ ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے اس نے بادشاہ کو سجدہ کرنے کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے، جب کہ سجدہ کی رسم شہنشاہ اکبر کے زمانے سے چلی آرہی ہے اور علما و فقہا اس کے جواز کا فتویٰ دے چکے ہیں۔ فوج کے سپاہیوں اور دیگر محکموں کے ارکان کو اس کے اور اس کے مریدین کی مجلسوں میں جانے سے روکا جائے۔ نیز اس موقع پر یہ بھی ضروری ہے کہ شیخ کو نظر بند کر دیا جائے۔

بادشاہ بلاشبہ شیخ کو نظر بند کرنا چاہتا تھا مگر یہ آسان کام نہ تھا، بڑے بڑے امرا اور مشہور اعیانِ سلطنت ان کا احترام کرتے اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو

چکے تھے۔ شیخ کو نظر بند کرنے کی صورت میں بادشاہ کو ان امرا کی طرف سے شدید خطرہ لاحق تھا لیکن بادشاہ نے اس مشکل کا حل یہ تلاش کیا کہ ان امرا کو دُور دراز مقامات میں بھیج دیا۔ خان خاناں کو دکن میں، سیّد صدر جہاں کو مشرقی ممالک میں، خان جہاں لودھی کو مالوہ میں، خانِ اعظم کو گجرات میں اور مہابت خاں کو کابل میں تبدیل کر دیا۔

جہاں گیر کے دربار میں

اس کے بعد بادشاہ نے حضرت مجدّد کو ایک شاہی فرمان کے ذریعے ملاقات کی دعوت دی اور کہا کہ ہم آپ کی اور آپ کے خلفا کی زیارت کے مشتاق ہیں۔ تشریف لا کر شکریہ کا موقع دیں۔ اس فرمان کے بعد حضرتِ مجدّد اپنے بعض خلفا کی معیت میں جہاں گیر کے دربارِ شاہی میں داخل ہوئے۔

بادشاہ تخت پر جلوہ افروز تھا۔ حضرت مجدّد تشریف لائے۔ بادشاہ کے حضور پیش ہوئے مگر اس حالت میں کہ خلافِ شرع آداب و رسوم بجا لانا تو کجا، سلام تک نہ کیا۔ بادشاہ نے دریافت کیا۔ تم آدابِ سلطنت کیوں بجا نہیں لائے۔؟ فرمایا۔ دینِ اسلام کا یہ حکم ہے کہ ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو السلام علیکم کہنا چاہیئے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ آپ ہمارے سلام شرعی کا جواب نہیں دیں گے، اس لیے مَیں نے السلام علیکم بھی نہیں کہا۔

اب بادشاہ مروّجہ آداب کے مطابق سجدہ کا طالب ہوا۔ لیکن حضرت شیخ نے انکار کر دیا اور فرمایا سجدہ ذاتِ خداوندی کے سوا کسی کو کرنا روا نہیں۔ شیخ کے اس جواب پر مفتی عبدالرحمٰن آگے بڑھے جو دربارِ جہاں گیری میں شیخ الاسلام کے مرتبے پر فائز تھے۔ انھوں نے کتبِ فقہ سے سلاطین کے لیے سجدۂ تحیت کا جواز پیش کیا اور کہا میں بحیثیت مفتی فتویٰ دیتا ہوں کہ شہنشاہ کے سامنے سجدۂ تحیت جائز ہے۔ لیکن حضرت مجدّد نے ان کے دلائل کو ٹھکرا دیا اور بادشاہ کے سامنے سجدہ ریز نہ ہوئے۔

حضرت مجدد کے اس جواب سے بادشاہ سخت غضب ناک ہوا اور ان کے لیے

سزائے موت کا حکم جاری کر دیا۔ پھر کچھ سوچنے کے بعد گوالیار کے قید خانے میں ڈال دیا اور شیخ ایک مدت تک اس قید خانے میں محبوس رہے۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ جہاں گیر کو اپنے باپ کے ”دین الٰہی“ یا اکبری الحاد سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور واقعات کے تسلسل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان حالات کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا جو اکبر نے علمائے سُو کے کہنے سے پیدا کر دیے تھے۔ وہ ابوالفضل کا بھی سخت مخالف تھا۔ بلاشبہ اس کی چہیتی بیوی نور جہاں کا بھائی آصف جاہ اس کا وزیر سلطنت تھا اور یہ دونوں بہن بھائی امور سلطنت میں بڑے دخیل تھے اور شیعہ تھے لیکن جہاں گیر کو ان کے مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ خلفائے ثلاثہ ——— حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور عثمان رضی اللہ عنہم ——— کا بے حد احترام کرتا تھا اور جیسا کہ وہ خود تزک جہاں گیری میں لکھتا ہے حضرت مجدد سے اس کی خفگی کی ایک وجہ دفتر اول کا گیارھواں مکتوب ہے ——— اس مکتوب کے مندرجات سے بعض لوگوں نے جہاں گیر کے دل میں حضرت مجدد کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا کر دی تھی کہ وہ خود کو خلفائے ثلاثہ سے بھی افضل قرار دیتے ہیں۔ اس کے متعلقہ حصے کا اردو ترجمہ یہ ہے:

”دیگر عرض یہ ہے کہ دوسری مرتبہ اس مقام کے ملاحظہ کے وقت اور بہت سے مقامات ایک دوسرے کے اوپر ظاہر ہوتے۔ نیازمندی و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس مقام سے اوپر کے مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذوالنورین کا مقام ہے اور دوسرے خلفا کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے۔ اور یہ مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے، اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی جن کا اب ذکر ہوتا ہے، تکمیل و ارشاد کے مقام ہیں اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا، جب اس مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مقام ہے اور دوسرے خلفا کا بھی وہاں عبور واقع ہوا ہے اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام ظاہر ہوا۔ بندہ اس مقام پر بھی پہنچا اور اپنے مشائخ میں سے حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ کو اپنے مقام میں اپنے ہمراہ پایا۔ اور دوسرے

خلفا کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہوا ہے، سوائے عبور اور مقام اور مرور اور اثبات کے کچھ فرق نہیں ہے اور اس مقام کے اوپر سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابل ایک اور نہایت عمدہ نورانی مقام کہ اس جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا، ظاہر ہوا، اور وہ مقام اس مقام سے تھوڑا سا بلند تھا، جس طرح کہ صفہ کو سطح زمین سے ذرا بلند بناتے ہیں اور معلوم ہوا کہ وہ مقام محبوبیت کا مقام ہے اور وہ مقام رنگین اور منقش تھا۔ اپنے آپ کو بھی اس مقام کے عکس سے رنگین معلوم کیا۔"

اس مکتوب کی وجہ سے کچھ لوگوں نے حضرت مجدد پر اعتراض کیا اور کہا کہ وہ اپنے آپ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے افضل گردانتے ہیں۔ اس کا انھوں نے جواب بھی دیا مگر معترضین کی تسلّی نہ ہوئی اور مرزا فتح اللہ گیلانی اور قاضی سنام ایسے بعض مرید اس مسئلے پر ان سے علیحدہ بھی ہو گئے۔ اس پر شیخ نے مرزا فتح اللہ کو ایک تفصیلی خط لکھا، جس میں واضح کیا کہ میں اپنے آپ کو قطعاً حضرت صدیق اکبر سے افضل نہیں سمجھتا۔ شیخ کے چند الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

"وہ شخص جو اپنے آپ کو حضرت صدیق رضؓ سے افضل جانے اس کا حال دو امر سے خالی نہیں ہے، یا وہ زندیق محض ہے یا جاہل ..... وہ شخص جو حضرت امیرؓ کو حضرت صدیقؓ سے افضل کہے، وہ اہل سنت والجماعت کے گروہ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس شخص کا کیا حال جو اپنے آپ کو افضل جانے؟"

مجدد الف ثانی کے اس مکتوب کا تذکرہ خود جہاں گیر نے بھی اپنے تزک میں کیا ہے وہ چہاردہم سالِ جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے:

دریں ایام بعرض رسید کہ شیخ احمد نام ... در سرہند ... خلیفہ نام نہادہ ... خود نوشتہ کتابے فراہم آوردہ، مکتوبات نام کردہ ... ازاں جملہ در مکتوبے نوشتہ کہ در اثنائے سلوک گذارم بمقام ذی النورینؓ افتاد، مقامے دیدم بغایت عالی و خوش بصفا۔ ازاں جا در گذشتم بمقام فاروقؓ پیوستم، و از مقام فاروق بمقام صدیق عبور کردم و ہر کدام را تعریفے در خور آں

نوشتہ، وازاں جا بمقام محبوبیت واصل شدہ مقامے مشاہدہ افتاد بغایت منور وملون۔ خود را بانواع انوار و الوان منعکس یافتم۔ یعنی استغفراللہ از مقام خلفا در گزشتہ بعالی مرتبت رجوع نمودم و دیگر گستاخی ہا کہ وہ کہ نوشتن آن طولے دارد و از ادب دور است، بنا بریں حکم فرمودم کہ بدرگاہِ عدالت آئین حاضر سازند۔ حسب الحکم بملازمت پیوست و از ہر چہ پرسیدم جواب معقول نتوانست، سامان نمود و باعدمِ خرد و دانش بغایت مغرور و خود پسند ظاہر شد۔ صلاح حالِ او منحصر دریں دیدم کہ روزے چند در زندانِ ادب محبوس باشد، تا شوریدگی مزاج و آشفتگی دماغش قدرے تسکین پذیرد و شورشِ عوام نیز فرونشیند۔ لاجرم بانی رائے سنگھ دلن حوالہ شد کہ در قلعہ گوالیار مقید دارد۔[۴۹]

ان ہی دنوں ایک درخواست پہنچی کہ شیخ احمد نامی ...... نے سرہند میں ..... جو خلیفہ کہلاتا ہے ... ایک خود نوشت کتاب تیار کی ہے جس کو مکتوبات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ... ان مکتوبات میں ایک مکتوب یہ تحریر کیا ہے کہ میں منازلِ سلوک طے کرتا ہوا مقام ذی النورین (حضرت عثمانؓ) تک پہنچا۔ وہاں ایک نہایت بلند و بالا اور عمدہ و نفیس مقام دیکھا۔ میں اس سے آگے نکل کر مقامِ فاروقؓ تک پہنچا اور مقامِ فاروق سے مقامِ صدیقؓ کو عبور کر گیا۔ پھر ہر مقام کی تعریف بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ وہاں سے مقامِ محبوبیت سے واصل ہو گیا۔ وہاں بدرجۂ غایت پُرانوار اور منقش مقام دیکھا، میں نے اپنے آپ کو بھی اس مقام کے انوار و الوان سے انعکاس پذیر پایا۔ (جہاں گیر لکھتا ہے) یعنی استغفراللہ! وہ مقامِ خلفا سے بھی عالی مرتبت ہو گیا۔ اس (مکتوب) میں اور بھی بہت سی گستاخانہ باتیں معرضِ تحریر میں لائی گئی ہیں، جن کا لکھنا باعثِ طوالت بھی ہے اور حدِّ ادب سے باہر بھی۔ اس لیے میں نے حکم جاری کیا کہ اسے بارگاہِ عدالت میں حاضر کیا جائے۔ چنانچہ حسبِ حکم اسے پیش کیا گیا، اور پھر میں نے جو سوال کیا، وہ غرور اور عدم خرد و دانش کی وجہ سے اس کا کوئی معقول جواب

---

[۴۹] تزکِ جہاں گیری ص ۲۷۴، ۲۷۵۔

نہ دے سکا۔ معلوم ہوا کہ انتہائی مغرور اور خود پسند شخص ہے۔ اس کے اصلاحِ احوال کی یہی صورت نظر آئی کہ کچھ دنوں کے لیے زندانِ ادب میں محبوس کر دیا جائے تاکہ اس کی شوریدگیٔ مزاج اور آشفتگیٔ دماغ کی تسکین کا کچھ سامان پیدا ہو جائے، نیز عوام کی شورش بھی دب جائے۔ پھر بلاشبہ اسے انی رائے سنگھ دلن کے حوالے کر دیا گیا تاکہ وہ اسے گوالیار کے قلعے میں قید کر دے۔

"حضرات القدس" ایک مشہور کتاب ہے جو حضرت مجدد کے سوانح حیات اور اصلاحی کارناموں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مولانا بدرالدین سرہندی کی تصنیف ہے، جو مجدد صاحب کے شاگرد اور خلیفہ تھے اور سترہ سال ان کی خدمت میں رہے تھے۔ اس میں بھی جہانگیر کے دربار میں ان کی حاضری اور دونوں کے درمیان سوال و جواب کا ذکر موجود ہے۔ الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

"جب کہ حضرت شیخ قدس سرہٗ کو اس کلام (مکتوب یازدہم) کے باعث جہانگیر بادشاہ کے پاس لے گئے تو بادشاہ نے ان سے پوچھا کہ ہم نے سنا ہے، آپ نے لکھا ہے کہ میرا مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بلند تر ہے۔۔ آپ نے یہی جواب دیا۔ (یعنی عبور و مرور اور اثبات کے فرق کی وضاحت کی) اور بادشاہ سے ایک مثال بھی بیان کی کہ مثلاً آپ کسی ادنیٰ کو خدمت کے لیے بلائیں اور اس سے ازراہِ نوازش اسرار کی باتیں کریں تو وہ لامحالہ پنج ہزاری امرا کے مقام کو طے کر کے بیٹھی تک پہنچے گا اور پھر اپنے مقام پر واپس جا کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتبہ امرائے پنج ہزاری سے زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ جواب سن کر بادشاہ کا عتاب دور ہو گیا۔"

"اسی اثنا میں ایک شخص نے جو خدا شناسی سے دور تھا، بادشاہ سے کہا کہ اس شیخ کا حال دیکھیے کہ آپ ظل اللہ اور خلیفۃ اللہ ہیں، اس نے آپ کو سجدہ نہیں کیا، بلکہ معمولی آداب بھی بجا نہیں لایا۔ بادشاہ یہ کلام سن کر خفا ہوا اور گوالیار میں حضرت کو قید کرنے کا حکم دیا۔ اس واقعہ سے پہلے شہزادہ دین پناہ شاہ جہان کہ شیخ سے خلوص کامل رکھتا تھا، علمائے مقامی افضل خاں اور خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کو کتبِ فقہ کے ساتھ حضرت کی خدمت

میں بھیج چکا تھا کہ سجدۂ تحیت سلاطین کے لیے جائز ہے۔ اگر آپ سجدہ کرلیں تو کوئی گزند بادشاہ سے آپ کو نہیں پہنچے گا۔ میں اس کا ضامن اور ذمہ دار ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ مسئلہ ضعیف ہے اور حکم رخصت رکھتا ہے۔ مسئلہ قوی یہ ہے اور عزیمت اسی میں ہے کہ غیر اللہ کو کبھی سجدہ نہ کیا جائے [۴۹]

قلعہ گوالیار میں

حضرت مجدد کے انکار اور ردِ عمل سے بادشاہ نہایت خشمگین ہوا اور حضرت مجدد کو انی رائے سنگھ دلن کے حوالے کرکے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔ ظاہر ہے کہ شیخ کو پہلے سے معلوم تھا کہ بادشاہ ان پر کس درجہ خفگی کا اظہار کرے گا اور اس کا انھیں کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ لیکن چوں کہ دربار شاہی کے بڑے بڑے امرا اور فوج کے بعض نامور عہدہ دار شیخ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو چکے تھے اور ان سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے، اس لیے ان پر شیخ کی گرفتاری کا شدید ردِ عمل ہوا۔ اگرچہ بادشاہ نے بغاوت کے خطرے کے پیش نظر انھیں دور دراز علاقوں میں بھیج دیا تھا، تاہم ان کے دل شیخ کے دامِ عقیدت سے بندھے ہوئے تھے اور وہ کسی صورت میں ان کی اس عظیم ابتلا کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ وہ اس سے متاثر ہوئے اور بادشاہ کے اس انتہائی اقدام کی سخت مذمت کی۔ ان حضرات میں کابل کے گورنر مہابت خاں کا نام بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ اسے جب شیخ کی گرفتاری کی اطلاع پہنچی تو بہت برافروختہ ہوا۔ اس نے خطبے اور سکّے سے جہاں گیر کا نام نکال دیا اور اپنی فوج کی ایک خاص تعداد کے ساتھ جو چیدہ چیدہ افراد پر مشتمل تھی۔۔ ہندوستان پر حملہ آور بھی ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے دریائے جہلم کے کنارے بادشاہ کو گرفتار بھی کر لیا تھا۔ ممکن ہے وہ اس سے بھی تجاوز کرتا، لیکن حضرت مجدد نے قید خانے سے اس کو پیغام بھجوایا اور ہدایت کی کہ بغاوت سے باز رہے۔

---

[۴۹] حضرات القدس دفتر ۲، ص ۸۹، ۹۰

بادشاہ کی اطاعت سے انحراف نہ کرے اور فتنہ و فساد کو روکے۔ شیخ کے اس حکم سے اس نے بادشاہ کو رہا کر دیا۔[۵۰]

قید سے رہائی

جہاں گیر بادشاہ، تزکِ جہاں گیری میں پندرھویں سالِ جلوس (جشنِ پانزدہمین نوروز از جلوس ہمایون) کے واقعات کے ضمن میں شیخ احمد سرہندی کی رہائی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

درین تاریخ شیخ احمد سرہندی را کہ ..... روزے چند در زندانِ ادب محبوس بود، بحضور طلب داشتہ، خلاص ساختم خلعت و ہزار روپیہ خرچ عنایت نمودہ، در رفتن و بودن مختار گردانیدم۔ او از روئے انصاف معروض داشت کہ این تنبیہ و تادیب در حقیقت ہدایتے و کفایتے بود۔[۵۱]

اسی تاریخ شیخ احمد سرہندی کو جو ..... چند روز زندانِ ادب میں محبوس رہے، حضور میں طلب کیا گیا، میں نے ان کو رہا کر دیا۔ خلعت اور ہزار روپے خرچ کے لیے عنایت کیے، چلنے پھرنے اور قیام کی آزادی عطا کی۔ انھوں نے از روئے انصاف، اس تنبیہ و تادیب کو اس بات پر محمول کیا کہ یہ درحقیقت ایک ہدایت اور سبق کا ذریعہ تھی۔

شیخ کی رہائی کا اصل باعث کیا تھا؟ اس کے بارے میں تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ ایک رات بادشاہِ ہند جہاں گیر نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ کھڑے ہیں اور حیرت و افسوس کے ساتھ دانتوں میں انگلی دبا کر بادشاہ سے فرما رہے ہیں:

"جہاں گیر! تو نے میرے دین کے کتنے بڑے خدمت گار کو قید کر دیا۔"

یہ منظر دیکھ کر جہاں گیر فوراً خواب سے بیدار ہوا، قلب و ذہن پر سخت

---

[۵۰] تفصیلات کے لیے دیکھیے روضۃ القیومیہ وغیرہ۔

[۵۱] تزکِ جہانگیری ص ۳۱۲

ندامت و پریشانی کے اثرات ظاہر ہوئے اور بلا تاخیر شیخ کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ بعض روایات کے مطابق جہان گیر نے خود جا کر شیخ کو زندان سے نکالا، اپنی غلطی اور سوئے ادب پر ندامت کا اظہار کیا اور طالب عفو ہوا۔ شیخ نے معاف فرما دیا۔ اس نے آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، آپ کو گواہ بنا کر اللہ کے حضور معاصی و منہیات سے تائب ہوا اور مغفرت کے لیے دعا کی درخواست کی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ عاملِ کابل مہابت خاں کے حملے کے بعد بادشاہ نے شیخ کو رہا کر دیا اور ان سے ملاقات کی خواہش بھی کی۔ مگر شیخ نے فرمایا، اس وقت تک ملاقات نہیں ہو سکتی، جب تک مندرجہ ذیل شرائط منظور نہیں کی جائیں گی:

۱۔ سجدۂ تعظیمی موقوف کیا جائے۔
۲۔ جو مساجد منہدم کی گئی ہیں، وہ از سرِ نو تعمیر کی جائیں۔
۳۔ ذبیحہ گاؤ کا امتناعی حکم منسوخ کیا جائے۔
۴۔ احکام شرعی کے نفاذ کے لیے قاضی اور مفتی و محتسب مقرر کیے جائیں۔
۵۔ غیر مسلموں سے جزیہ کی وصولی شروع کی جائے۔
۶۔ بدعات کا سدِ باب کیا جائے اور احکام شریعت کی تنفیذ کی جائے۔
۷۔ جو لوگ اس جھگڑے میں محبوس کیے گئے ہیں، انھیں رہا کیا جائے۔[۵۲]

بادشاہ نے یہ شرائط منظور کر لیں تو شیخ احمد نے آگرہ تشریف لا کر ملاقات کی۔ اس نے شیخ کو خلعت اور نذر پیش کی۔ بعد ازاں شیخ نے عمر کے آخری چھ سال بادشاہ کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے بسر کیے۔[۵۳]

۵۲؎ تفصیل کے لیے دیکھیے روضۃ القیومیہ رکن اول ص ۱۸۶ تا ۱۹۵

۵۳؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ مکتوبات دفتر دوم مکتوب نمبر ۴۳، ۴۴ ۔ نیز دیکھیے روضۃ القیومیہ رکن اول ص ۱۹۹ تا ۲۰۹ ۔

شیخ احمد سرہندی اکبر کے عہد (۹۷۱ھ) میں پیدا ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق سترہ[17] اور ایک روایت کے مطابق اکیس[21] سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ انھوں نے اپنے شہر سرہند ہی کو تبلیغی مرکز بنایا۔ وہاں انھوں نے درس و تدریس کا ہنگامہ بھی بپا کیا، تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا اور مختلف سرکردہ لوگوں کو مکاتیب بھی تحریر کیے۔ یعنی انھوں نے ہر اعتبار سے باقاعدہ اپنی تبلیغی مہم کا آغاز فرمایا۔ مگر یہ سب سرگرمیاں نہایت دھیمے پن اور انتہائی محتاط طریقے سے کی گئی تھیں، اس لیے مؤثر اور ہمہ گیر ہونے کے باوجود اکبر کو اس سے زیادہ خطرہ لاحق نہیں ہوا، نہ انھیں کچھ کہا گیا، نہ گرفتار کیا گیا اور نہ ان پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کی گئیں۔ انھیں جہاں گیر کے عہد میں ہدفِ ابتلا بنایا گیا اور پھر اس کا نتیجہ بہت بڑے اسلامی اور روحانی انقلاب کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

عہدِ جہانگیری میں شیخ کی تبلیغِ دین اور اس کے اثرات

رہائی کے بعد جہاں گیر شیخ کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہو گیا۔ اس نے شیخ کو بالکل آزاد کر دیا تھا اور اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ اگر وہ گھر جانا چاہتے ہیں تو گھر تشریف لے جائیں اور اگر لشکر کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو لشکر میں رہیں اور تبلیغِ دین کریں۔ شیخ نے گھر کے بجائے لشکر میں رہنے کو ترجیح دی، لشکر کی نقل و حرکت ہر وقت جاری رہتی تھی اور سارے ملک میں مختلف اوقات میں اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہوتا تھا، اس لیے اس سے تبلیغ کے زیادہ مواقع میسر آئے۔ اور لوگ زیادہ حلقہ بگوشِ ہدایت و تلقین ہوئے۔ خود بادشاہ سے گفتگو کا طویل سلسلہ جاری رہتا، وہ دیر تک ان کی مجلس میں بیٹھتا اور ان سے مستفید ہوتا۔ بادشاہ کی شیخ سے دلچسپی کی وجہ سے امرا و وزرا، ارکانِ سلطنت اور رعایا کے عام لوگوں میں شیخ کا دائرۂ اثر وسیع ہوا اور دینِ اسلام سے ان کو مزید لگاؤ پیدا ہوا۔ بادشاہ سے جس انداز کی گفتگو ہوتی، خود شیخ اس سے بہت خوش تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے صاحب زادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو ایک مکتوب میں شاہی

صحبتوں کے بارے میں مطلع کیا ہے - اس مکتوب کا اردو ترجمہ یہ ہے - فرماتے ہیں :

اللہ کی حمد اور اس کے برگزیدہ بندوں پر سلام - اس طرف کے احوال و کوائف لائق تعریف ہیں - عجیب و غریب صحبتیں گزر رہی ہیں - اللہ تعالیٰ کی عنایتِ خاص ہے کہ ان گفتگوؤں سے امورِ دینیہ اور اصولِ اسلامیہ میں کسی قسم کی سستی اور مداہنت راہ نہیں پا سکتی - اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں وہی باتیں بیان ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں - اگر ایک مجلس کا حال ضبطِ تحریر میں لایا جائے تو دفتر تیار ہو جائے - بالخصوص آج ماہِ رمضان کی سترھویں شب کی صحبت میں انبیا علیہم السلام کی بعثت، عقل کے عدم استقلال، ایمان بالآخرت، اس کے عذاب و ثواب، اثباتِ رویتِ باری تعالیٰ، حضرت خاتم النبیین کی ختمِ نبوت، ہر صدی کے مجدد، اقتدائے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، تراویح کی سنیت، تناسخ کے ابطال، جنات کے احوال اور ان کے عذاب و ثواب کے بارے میں بہت کچھ گفتگو ہوئی - وہ بہت خوشی اور دلچسپی سے سنتے رہے - اس اثنا میں ضمناً اور بھی بہت سے امور زیر بحث آئے - اقطاب و اوتاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیات کا ذکر بھی ہوا - اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ سب کچھ تسلیم کرتے رہے اور کوئی تغیر رونما نہیں ہوا - ان واقعات اور ملاقاتوں میں شاید اللہ تعالیٰ کی حکمت کے اسرار پنہاں ہوں گے - اللہ تعالیٰ کی بے انتہا حمد ہے جس نے ہم کو نعمتِ ہدایت عطا فرمائی اگر وہ ہدایت سے نہ نوازتا تو ہم کبھی ہدایت یاب نہ ہو سکتے - بلاشبہ ہمارے رب کے رسول سچے ہیں -

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید سورۂ عنکبوت تک ختم کر لیا ہے - جب رات کو اس مجلس سے اٹھتا ہوں تو تراویح میں مشغول ہو جاتا ہوں - حفظِ قرآن کی یہ دولتِ عظمیٰ، اس فترت میں جو عین حقیقت ہے، حاصل ہوئی - اول و آخر تمام حمد و ثنا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے ۳۴؎

واقعات کی ترتیب سے یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ شیخ کو رہا کرنے کے بعد جہانگیر کو ان سے بہت زیادہ عقیدت ہو گئی تھی اور وہ ان کی مالی اعانت بھی کرنے لگا تھا۔ چنانچہ وہ شیخ کی رہائی سے تین سال بعد اپنی سال گرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

بدستور ہر سال خود را بطلا و اجناس وزن فرمودہ در وجہ مستحقان مقرر فرمودم۔ از آں جملہ شیخ احمد سرہندی دو ہزار روپیہ عنایت شد [۵۵]

یعنی میں نے ہر سال کے معمول کے مطابق سونے اور اجناس میں اپنا وزن کرایا اور یہ چیزیں مستحقین میں تقسیم کر دیں۔ ان میں سے شیخ احمد سرہندی کو دو ہزار روپے عنایت کیے گئے۔

علاوہ ازیں بادشاہ نے شراب نوشی ترک کر دی تھی، خلافِ اسلام رسوم اور منہیات سے تائب ہو گیا تھا، شیخ کی صحبت میں باقاعدہ بیٹھتا اور ان سے مستفید ہوتا تھا۔ قلعہ گوالیار سے رہائی کے بعد شیخ تین سال تک شاہی لشکر میں رہے۔ اس اثنا میں ان سے خود بادشاہ نے بھی استفاضہ کیا، امرا و وزرا بھی ان کی تبلیغ سے اثر پذیر ہوئے اور شیخ نے مختلف حضرات کے نام بہت سے مکتوبات بھی تحریر کیے جو دفتر سوم میں مرقوم ہیں۔ یہ دور شیخ کی تبلیغِ دین، اشاعتِ توحید اور دعوتِ اسلام کا دور تھا۔ آگے چل کر اس کے بہت ہی اچھے نتائج برآمد ہوتے۔

حضرت مجدد کی تعلیمات

اب ہم اختصار کے ساتھ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی تعلیمات، ان کے افکار و تصورات اور اسلوبِ رشد و ہدایت کی ایک جھلک پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ان کی عظیم شخصیت کی فکری و عملی تصویر سامنے آئے گی اور پتا چلے گا کہ مختلف مسائلِ دینیہ کے بارے میں ان کا کیا نقطۂ نظر تھا، نیز معلوم ہو گا کہ ان کے دور

---

[۵۵] تزکِ جہانگیری ص ۳۷۹

ہیں ان مسائل کی وضاحت کس درجہ ضروری تھی۔

توحید

اس ضمن میں ہم سب سے پہلے چند سطور میں مجدد صاحب کے تصور توحید کی وضاحت ان ہی کے الفاظ میں کریں گے۔ وہ ایک مکتوب میں توحید کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

توحید عبارت از تخلیص قلب است از توجہ ما دون او سبحانہٗ وتعالیٰ تا زمانیکہ دل را گرفتاری بما سوی متحقق، اگرچہ اقل قلیل باشد، از ارباب توحید نیست۔ بے تحصیل ایں دولت واحد گفتن و واحد دانستن نزد ارباب اصول از فضول است[۵۶]۔

توحید کی تعریف یہ ہے کہ دل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف توجہ کے سوا ہر شی سے خالی ہو جائے۔ جب تک دل ماسوی اللہ میں گرفتار رہے، اگرچہ بہت ہی قلیل طور پر ہو، اصحاب توحید میں سے نہیں ہے۔ اس جذبے کے حصول کے بغیر توحید کا دعویٰ کرنا اور توحید کا دم بھرنا ارباب اصول کے نزدیک بے معنی اور بے مقصد ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ انبیا علیہم السلام کی بعثت اور دنیا میں تشریف آوری کا مقصد محض یہ ہے کہ انسان غیر اللہ کی عبادت سے دور رہے اور فقط اللہ سے وابستگی اختیار کرے۔ ترجمہ یہ ہے:

ہمارے انبیا پر صلوٰۃ وسلام ہو جو تعداد میں ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب ہو گزرے ہیں سب مخلوق کو خالق کی عبادت کی تبلیغ فرماتی اور غیر اللہ کی عبادت سے منع کیا۔ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے بندے اور عاجز انسان جانا اور ہمیشہ اللہ کی عظمت و ہیبت سے لرزاں و ترساں رہے[۵۷]۔

ایک مکتوب میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اصحاب توحید کی پہچان کیا ہے اور وہ کن اوصاف سے متصف ہوتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے

---

۵۶ مکتوبات دفتر اول۔ مکتوب نمبر ۱۱۱

۵۷ ایضاً۔ مکتوب نمبر ۱۶۷

فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے :

کامل توحید والے لوگ ان ہی امور کو مرکزِ توجہ ٹھہراتے ہیں جو اللہ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہوں، ناپسندیدہ اور غلط امور کی طرف وہ بالکل ملتفت نہیں ہوتے۔ وہ اپنے ایمان کو چند شیریں لقموں کے عوض فروخت نہیں کرتے۔ وہ خوشنما لباس اور اعلیٰ پارچات کی خاطر غلامی کی زندگی اختیار نہیں کرتے۔ وہ تختِ شاہی سے تعلقات استوار کرنے سے گریزاں رہتے ہیں، وہ اللہ کی بادشاہی میں لات وعزیٰ کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ وہ بارگاہِ خداوندی میں صرف دین خالص کے طالب ہیں۔ خبردار ہو جاؤ! خالص اطاعت وعبادت کا مستحق فقط اللہ تعالیٰ ہے : اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ۔ اللہ کا فرمان ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، اگر تو نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مانا تو تیرے اعمال اکارت جائیں گے: لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ۔

ایک ساعت کے لیے اپنے حال پر غور کرو۔ اگر یہ خالص دین تجھے میسر آ گیا تو تمھارے لیے بہت بڑی خوشخبری کا باعث ہوگا[۵۸]

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور سے قلب کو وابستہ کرنا باطنی امراض کی جڑ ہے۔ فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے :

باطنی امراض کی سردار اور اندرونی بیماریوں کی رئیس بیماری یہ ہے کہ دل کا پیوند اللہ کے سوا کسی اور کے ساتھ ہو۔ جب تک اس بیماری سے نجات حاصل نہ ہو جائے ایمان کی سلامتی محال ہے۔ کیوں کہ شرکت کو بارگاہِ رب العزت میں ہرگز دخل نہیں ہے خبردار، دین خالص صرف اللہ ہی کا حق ہے۔ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ۔ پس جب شریک کو محبتِ الٰہی کے مقابلے میں غالب کر لیا جائے تو ایمان کا کیا حال ہوگا۔ یہ کس درجہ ڈھٹائی ہے کہ غیر کی محبت کو اس انداز سے غالب کر لیا جائے کہ حق تعالیٰ کی محبت اس کے مقابلے میں مغلوب یا معدوم ہو جائے[۵۹]

---

۵۸ مکتوبات دفترِ اول۔ مکتوب نمبر ۱۷۴۔ ۵۹ ایضاً نمبر ۱۰۹

ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں کہ تمام انبیا صرف اللہ تعالیٰ ہی کو بندگی کے لائق قرار دیتے تھے اور اپنے آپ کو اس کے عاجز بندے اور بشر قرار دیتے تھے۔ اس بات کو ان کی دعوت الی اللہ کے جز کی حیثیت حاصل تھی۔ فرماتے ہیں:

دوسرا دعوتی کلمہ جو انبیا علیہم السلام کا مخصوص کلمہ ہے، یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دیگر بنی نوع انسان کی طرح بشر جانتے ہیں اور عبادت و بندگی کے لائق صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو گردانتے ہیں۔ بنی نوع انسان کو اسی کی اطاعت و بندگی کی طرف دعوت دیتے ہیں اور خدا وند تعالیٰ کو حلول و اتحاد سے پاک و منزہ ٹھہراتے ہیں [۶۰]۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس علوِ شان اور عظمت کے باوجود بشر اور اللہ کے عبادت گزار تھے۔ الفاظ یہ ہیں:

اے برادر! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باآں علوِ شان بشر بود، و بداغِ حدوث و امکان متسم۔ بشر از خالقِ بشر جل سلطانہٗ چہ دریابد و ممکن از واجب تعالیٰ شانہٗ چہ فرا گیرد، و حادث قدیم را جلّت عظمتہٗ چہ طور احاطہ نماید [۶۱]۔

اے برادر! حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس علوِ شان کے بشر تھے اور حدوث و امکان کے وصف سے متسم۔ بھلا بشر، خالقِ بشر کی حقیقت و کنہ کو کس طرح پا سکتا ہے؟ اور ممکن، واجب کا احاطہ کیوں کر کر سکتا ہے؟ اور حادث قدیم کو اپنے دائرۂ ادراک و معرفت میں کیسے لا سکتا ہے؟

شرک کی سخت تردید

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

انبیا علیہم السلام کے متفقہ کلماتِ دعوت یہ ہیں کہ ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے اور اللہ بلند و پاک کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ بعض مخلوق بعض مخلوق کو ارباب من دون اللہ نہ بنائے [۶۲]۔

۶۰۔ مکتوب دفتر اول۔ مکتوب نمبر ۶۳۔ ۶۱۔ ایضاً، مکتوب نمبر ۱۷۳۔

۶۲۔ ''

ایک اور مکتوب میں خالص علمی زبان میں شرک کی سخت تردید کرتے ہیں۔ ان کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

ممکن کو واجب ثابت کرنا اور واجب کے خیر و کمال کو ممکن سے وابستہ کردینا، درحقیقت ممکن کو حق جل سلطانہٗ کی بادشاہت اور اس کے اختیارات میں، شریک بنانا ہے۔ اور اسی طرح ممکن کو واجب تعالیٰ شانہٗ کا عین کہنا اور ممکن کے صفات و افعال کو واجب تعالیٰ کے صفات و افعال کا عین جاننا، واجب تعالیٰ کی جناب میں سوئے ادب ہے اور اس کے اسما و صفات میں الحاد ہے [۶۳]

ایک مکتوب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود بابرکات کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ دائرۂ امکان میں ہے، دائرۂ وجوب میں نہیں ہے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم با علوِ شان و بآں جاہ وجلال ہمیشہ ممکن است، و ہرگز از امکان نخواہد برآمد و بوجوب نخواہد پیوست، و مستلزم تحقیق است بالوہیت۔ تعالی اللہ ان یکون لہ ند و شریک، دع ما ادعتہ النصاریٰ فی نبیّہم [۶۴]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس قدر علوِ شان اور جاہ وجلال کے ہمیشہ ممکن ہی ہیں اور ہرگز دائرۂ امکان سے نکل کر وجوب کے ساتھ پیوست نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ یہ امر وجوب کے ساتھ متحقق ہونے کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمسر و شریک سے برتر و اعلیٰ ہے، جو دعویٰ نصاریٰ نے اپنے نبی کے حق میں کیا ہے، وہ اہلِ اسلام کو چھوڑ دینا چاہیے۔

غیر اللہ سے استمداد

غیر اللہ سے استمداد، دفع امراض و اسقام کی غرض سے اللہ کے سوا دوسروں

---

[۶۳] مکتوبات دفتر دوم۔ مکتوب اول۔

[۶۴] مکتوبات دفتر سوم۔ مکتوب نمبر ۱۲۲

سے مدد مانگنے اور طلب حاجات کے لیے ان کے دروازے پر دستک دینے کو شیخ مجدد الف ثانی شرک سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

استمداد از اصنام وطاغوت در دفع امراض و اسقام کہ در جہلائے اہلِ اسلام شائع گشتہ است، عین شرک وضلال است وطلب حوائج از سنگہائے تراشیدہ وناتراشیدہ نفس کفر و انکار از واجب الوجود تعالیٰ وتقدس قال اللہ تبارک وتعالیٰ شکایتاً عن حال بعض اہل الکتاب — یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ ط وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا[۶۵] — اکثر زنان بواسطہ کمال جہل کہ دارند باین استمداد ممنوع مبتلا اند وطلب رفع بلیہ ازیں اسمائے بے مسمیٰ می نمایند و بادائے مراسم شرک واہلِ شرک گرفتار اند[۶۶]

ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ امراض و اسقام کو رفع کرنے کی غرض سے بتوں سے اور طاغوت سے استمداد کرنا جس کا جاہل مسلمانوں میں عام رواج ہوگیا ہے، عین شرک وگمراہی ہے۔ تراشیدہ وناتراشیدہ پتھروں سے اپنی ضرورتیں اور حاجتیں طلب کرنا اللہ تعالیٰ کا صاف اور عین کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض گمراہوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنا معاملہ طاغوت کے پاس لے جائیں۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس سے انکار کر دیں اور شیطان ان کو ضلالت میں مبتلا کر کے سیدھی راہ سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے — زیادہ تر عورتیں کمال جہالت کی وجہ سے استمداد کے اس ممنوع عمل میں مبتلا ہیں اور رفعِ بلیات کے لیے مراسمِ شرک اور عملِ اہلِ شرک میں گرفتار ہیں۔

۶۵۔ یہ سورہ النساء کی آیت نمبر ۶۰ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے جھگڑے قضیے سرکش اور شریر (طاقتوں) کے آگے لے جائیں، حالانکہ انھیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اس سے انکار کریں، اصل بات یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے، انھیں اس طرح گمراہ کر دے کہ سیدھی راہ سے بہت دور جا پڑیں۔

۶۶۔ مکتوبات دفتر سوم مکتوب نمبر ۴۱۔

نذر و نیاز کا شرکیہ انداز

مشائخ اور بزرگانِ دین کے ناموں کی نذریں ماننا اور ان کی قبروں پر جانور ذبح کرنا اعمالِ شرکیہ میں داخل ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

حیوانات را کہ نذر مشائخ می کنند، بر سر قبرہائے ایشاں رفتہ، آں حیوانات را ذبح می کنند، در روایاتِ فقہیہ ایں عمل را نیز داخلِ شرک ساختہ اند، دریں باب مبالغہ نمودہ، و ایں ذبح را از جنس ذبائح جن انگاشتہ اند کہ ممنوعِ شرعیست و داخل دائرۂ شرک۔ ازیں عمل نیز اجتناب باید نمود کہ شائبۂ شرک دارد۔ و وجوہ نذر بسیار است۔ چہ درکار است کہ نذر ذبح حیوانے کنند و ارتکاب ذبح آں نمائندہ بذبائح جن ملحق سازند و تشبیہ بعبدہ جن پیدا کنند[۶۷]

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

حیوانات اور جانوروں کو کہ مشائخ اور بزرگوں کے لیے ان کی نذر مانتے ہیں، اور ان کی قبروں پر لے جا کر ان جانوروں کو ذبح کرتے ہیں، فقہی روایات میں اس عمل کو شرک میں شمار کیا گیا ہے اور اس میں فقہا نے بڑا سخت رویہ اختیار کیا ہے۔ ایسے جانوروں کے ذبح کرنے کو بھی ان ہی ذبیحوں میں گردانا گیا ہے جو جنات کے نام پر اور ان سے طمع و خوف کی بنا پر مشرکین ذبح کیا کرتے تھے۔ یہ سب شرعاً ممنوع ہے اور شرک کی ذیل میں آتا ہے۔ اس عمل سے بھی اجتناب ضروری ہے، کیوں کہ اس میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ نذر کی جائز اور مشروع صورتیں بہت ہیں۔ کیا ضرور ہے کہ جانور کے ذبح کرنے ہی کی نذر مانی جائے اور اس عمل کے ارتکاب سے جنات کے نام کے ذبیحوں میں شمولیت کر کے جنات کی پوجا کرنے والوں سے مشابہت پیدا کی جائے۔

نجات کا ذریعہ اتباعِ شریعت ہے

نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ اور انسان کس طرح فلاح و بہبود سے ہم کنار ہو سکتا ہے؟

---

[۶۷] مکتوبات دفتر سوم۔ مکتوب نمبر ۱۴۱

حضرت مجدد نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور مختلف مکاتیب میں اس مسئلے کو واضح کیا ہے۔ صاف لفظوں میں لکھتے ہیں کہ نجات صرف اور صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ نجات کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس ضمن میں ایک مکتوب کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

طریق نجات و راہ رستگاری ہمیں متابعت شریعت است، علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام، در اعتقاد و عمل۔ استاد و پیر برائے آں غرض می گیرند کہ دلالت بشریعت نمایند و ببرکت ایشاں تیسر و سہولت در اعتقاد و عمل شریعت پیدا شود، نہ آں کہ مریداں ہرچہ دانند کنند، و ہرچہ خواہند خورند، و پیراں سپر اینہا گردند و از عذاب نگہدارند کہ ایں معنی تمنائے محض است، آں جا بے اذن کسے شفاعت نتواند کرد، تا عمل مرتضیٰ نبود شفاعت او نہ کنند، و مرتضیٰ وقتے شود کہ بمقتضائے شریعت عامل شود[۶۵]

اب ذیل میں ان الفاظ کا ترجمہ دیکھیے:

نجات کا ذریعہ اور فلاح و کامرانی کا راستہ فقط یہ ہے کہ اعتقادی اور عملی طور پر صاحب شریعت (حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع کی جائے۔ استاد و مرشد اس واسطے پکڑتے ہیں کہ وہ شریعت کی طرف رہنمائی کریں اور ان کی برکت سے شریعت کے مطابق عقیدہ اور عمل کی استواری میں آسانی و سہولت پیدا ہو۔ نہ یہ کہ مرید جو کچھ چاہیں کریں اور جو چاہیں کھائیں، اور پیران کو عذاب سے بچانے کی ڈھال بن جائیں۔ یاد رہے، یہ خیال ایک غلط اور بے ہودہ آرزو ہے۔ وہاں اذن کے بغیر کوئی شفاعت نہ کر سکے گا، اور جب تک عمل پسندیدہ نہ ہوں گے، کوئی سفارش نہ کرے گا۔ اور عمل پسندیدہ تبھی ہوں گے جب شریعت کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

اعتقادی مداہنت قابل معافی نہیں

عمل و عقیدہ کے بارے میں حضرت مجدد کا وہی نقطہ نظر ہے، جو سلف صالحین

۶۵۔ مکتوبات دفتر سوم۔ مکتوب نمبر ۴۱

کا تھا۔ ان کے نزدیک عمل میں مداہنت بارگاہِ الٰہی میں قابلِ عفو ہو سکتی ہے لیکن عقیدے کی مداہنت معاف نہیں ہو سکتی۔ عقیدے کی مداہنت ان کے نزدیک شرک کے مترادف ہے۔

مداہنت و مساہلت در عمل امید مغفرت دارد۔ اما مداہنتِ اعتقادی گنجائشِ مغفرت ندارد۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ [۶۹]

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

یعنی عمل میں مداہنت و غفلت کا ارتکاب ہو جائے تو مغفرت و عفو کی امید ہے۔ لیکن عقیدے کی مداہنت میں مغفرت کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ کا فرمان ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا جائے تو وہ نہیں بخشے گا۔ اس کے سوا جس کو چاہے گا بخش دے گا۔

ادلۂ احکامِ شرعیہ

ادلۂ احکامِ شرعیہ کے بارے میں مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ صرف قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ان کے بعد قیاس اور اجماعِ امت کو بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

احکامِ شرعیہ کے اثبات میں صرف کتاب و سنت ہی معتبر و مستند ہیں۔ پھر قیاس اور اجماعِ امت بھی مثبتِ احکام ہیں۔ ان چار ادلۂ شرعیہ کے بعد کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے احکامِ شرعیہ کا اثبات ہو سکے۔ اولیائے کرام کے الہام سے کسی چیز کی حلت اور حرمت ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ اربابِ باطن کا کشف کسی چیز کو فرض یا سنت ثابت کر سکتا ہے [۷۰]

ایک مکتوب میں فرماتے ہیں صرف کتاب و سنت سے استدلال کرنا چاہیے جو شخص قرآن و سنت کو نظر انداز کر دے، اس سے کسی قسم کی گفتگو اور جھگڑا نہ

---

[۶۹] مکتوبات دفتر دوم۔ مکتوب نمبر ۶۷

[۷۰] ایضاً مکتوب نمبر ۵۵

کیا جائے ۔[۱۷۵]

اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا فعل شنیع ہے

ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا فعل شنیع ہے اور اس سے روکنا ضروری ہے :

بعضے از خلفا را مریدانِ ایشاں سجدہ می کنند ... شناعتِ ایں فعل اظہر من الشمس است ، منع شاں بکنید و تاکید در منع بنماید ۔[۱۷۶]

بعض خلیفوں کو ان کے مرید سجدہ کرتے ہیں ... اس فعل کی شناعت و مکروہیت سورج سے زیادہ روشن ہے ۔ انھیں روکنا چاہیے اور پوری سختی اور تاکید سے منع کرنا چاہیے ۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں ۔ ترجمہ :

اے برادر ! سجدہ زمین پر پیشانی رکھنے کا نام ہے ۔ یہ عمل انتہائی تذلل ، پستی ، انکساری ، عاجزی اور فروتنی کو متضمن ہے ۔ تواضع کی یہ قسم صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے ، شریعت نے غیر اللہ کے لیے اسے جائز نہیں ٹھہرایا ۔[۱۷۷]

غیر اللہ کو "مالکِ دو جہان" کہنا کلمۂ شرک ہے

ایک شخص نے اپنے مکتوب میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کو "خدیو نشائتین" سے مخاطب کیا ۔ "خدیو نشائتین" کے معنی مالکِ دو جہان کے ہیں ۔ حضرت مجدد کو اپنے لیے یہ کلمہ نہایت ناگوار گزرا اور اسے کلمۂ شرکیہ سے تعبیر فرمایا اور جوابی مکتوب میں تنبیہ فرمائی کہ یہ لفظ فقط اللہ کے لیے مخصوص ہے ، غیر اللہ کے لیے اسے ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہیے ۔ اگرچہ وہ کتنی بھی بڑی شخصیت ہو ۔ بندہ بہرحال مملوک ہے ، اس کے لیے کسی صورت میں بھی شرعی اعتبار سے اس لفظ کے استعمال کی اجازت نہیں دی جا سکتی ۔ اندازِ بیان کس درجہ زوردار ، منطقیانہ اور مدلل ہے ۔ ان کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں :

سعادت آثار ! فقرہ در صحیفۂ گرامی اندراج یافتہ بود کہ "خدیو نشائتین" ۔ ایں نعنیت

---

۱۷۵ مکتوبات دفتر سوم ۔ مکتوب نمبر ۲۴

۱۷۶ مکتوبات دفتر اول ، مکتوب نمبر ۲۹

۱۷۷ " دفتر دوم " ۹۲

کہ مخصوص بحضرت واجب الوجود است جل سلطانہٗ۔ عَبۡدٌ مَّمۡلُوۡكٌ لَّا يَقۡدِرُ عَلٰى شَيۡءٍ راچہ رسد کہ بوجہ از وجوہ بخداوندِ خود جل سلطانہٗ مشارکت جوید و در راہ خداوندی پوید علی الخصوص در نشأۂ اخرویہ کہ مالکیت و ملکیت چہ بطریق حقیقت وچہ بطریق مجاز مخصوص بحضرت مَالِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ است حضرت حق سبحانہٗ وتعالی در روز قیامت ندا دہد کہ لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ وخود را در جواب آں فرماید۔ لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ عباد را دراں روز غیر از ہول و دہشت متحقق نیست وجز حسرت و ندامت متصور نہ[۴۷]

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

اے سعادت مند عزیز! آپ کے مکتوب گرامی کے ایک فقرے میں "خدیو نشأتین" مرقوم تھا (جس کے معنی دونوں جہان کے بادشاہ کے ہیں) یہ وہ نعت اور تعریف ہے جو صرف حضرت واجب الوجود اللہ جل شانہٗ کے لیے مخصوص ہے۔ بندۂ مملوک کو جو کسی شی پر قادر نہیں، کیا لائق ہے کہ خدا تعالی کے ساتھ شرک کرے اور اختیارات خداوندی میں دخل انداز ہو۔ بالخصوص عالم آخرت میں کہ مالکیت و ملکیت، کیا حقیقی اور کیا مجازی حضرت مالکِ یوم الدین کے لیے مخصوص ہے۔ حضرتِ حق سبحانہٗ وتعالی قیامت کے دن پکارے گا۔ لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ (آج کس کی بادشاہی ہے) اللہ تعالی خود ہی اس کے جواب میں ارشاد فرمائے گا۔ لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ (صرف اللہ واحد قہار کے لیے بادشاہی ہے) اس روز بندوں پر خوف و دہشت کے سوا اور کسی چیز کا غلبہ نہ ہوگا اور حسرت و ندامت کے علاوہ اور کوئی شی تصوّر میں نہ آئے گی۔

زبان سے نماز کی نیت کے لفظ کہنا بدعت ہے

بعض لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوتے وقت زبان سے نیت کے الفاظ کہتے ہیں۔ حضرت مجدّد اس کی سخت تکبیر کرتے اور اسے بدعت قرار دیتے ہیں۔ یہ بدعت عوام میں تو رائج ہے ہی، بعض علما بھی اسے مستحسن گردانتے ہیں۔ حضرت مجدد ایک مکتوب میں اس کو بدعت سے تعبیر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔

---

[۴۷] مکتوبات دفتر اول۔ مکتوب نمبر ۴۷۔

ان کے نزدیک ارادۂ قلب ہی اصل شئ ہے۔ زبان سے الفاظ ادا کرنا قطعاً خلافِ سنت ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

وہمچنیں است آنچہ علما در نیتِ نماز مستحسن داشتہ اند کہ باوجود ارادۂ قلب بزبان نیز باید گفت۔ وحال آن کہ ازاں سرور علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ ثابت نہ شدہ است، نہ بروایت صحیح ونہ بروایتِ ضعیف، ونہ از اصحابِ کرام وتابعین عظام کہ بزبان نیت کردہ باشند بلکہ چوں اقامت می گفتند تکبیرِ تحریمہ می فرمودند۔ پس نیت بزبان بدعت باشد وایں بدعت را حسنہ گفتہ اند، وایں فقیر می داند کہ ایں بدعت چہ جائے رفعِ سنت کہ رفعِ فرض می نماید، چہ در تجویزِ آں اکثر مردم بزبان اکتفا می نمایند واز غفلت قلبی باک ندارند۔ پس دریں ضمن فرضے از فرائضِ نماز کہ نیت قلبی باشد متروک می گردد وبفسادِ نماز می رساند[۷۵]

اب ذیل میں ان الفاظ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

اسی طرح وہ امر ہے جسے علما نے نماز کی نیت کے بارے میں مستحسن سمجھا ہے کہ باوجود ارادۂ قلبی کے زبان سے نیت کے الفاظ کہنا چاہیے۔ حالانکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی صحیح یا ضعیف روایت سے ثابت نہیں، نہ صحابہ کرام اور نہ تابعین عظام سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ انھوں نے زبان سے نیت کی ہو۔ بلکہ جب وہ اقامت (قد قامت الصلوٰۃ) کہتے تھے تو صرف تکبیر تحریمہ ہی کہتے تھے۔ سو زبان سے نیت کرنا بدعت ہے بعض لوگ اس کو بدعتِ حسنہ کہتے ہیں۔ اور یہ فقیر جانتا ہے کہ یہ وہ بدعت ہے جو رفعِ سنت تو رہا ایک طرف سرے سے فرض ہی کو رفع کر دیتی ہے۔ کیونکہ اس میں اکثر لوگ محض زبانی الفاظ پر اکتفا کرتے ہیں اور دل کی غفلت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سے فرائضِ نماز میں کا ایک فرض جو نیتِ قلب ہے، متروک ہو جاتا ہے اور یہ معاملے کو نماز کے فاسد ہونے تک پہنچا دیتا ہے۔

بدعت کو بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ میں تقسیم کرنا غلط ہے

شیخ مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے بدعت کی شدید مخالفت کی ہے اور اس سے انکار کرتے ہیں کہ بدعت دو اقسام پر منقسم ہے۔ ایک بدعتِ حسنہ ہے اور ایک بدعتِ سیئہ۔!

---

[۷۵] مکتوبات۔ دفتر اول مکتوب ۱۸۶

ان کے نزدیک بدعت کی ایک ہی تعریف اور ایک ہی قسم ہے اور وہ یہ ہے کہ دین کی ان حدود میں جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے متعین کر دی ہیں، اور ان احکام میں جو کتاب وسنت میں منقول ہیں، کسی ایسی نئی چیز کو داخل کر لینا جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ بدعت کو بس بدعت ہی کہنا چاہیے۔ اس کو بدعتِ حسنہ اور بدعت سیئہ کے خانوں میں تقسیم کرنا قطعی طور سے غلط ہے۔ یہ بات انھوں نے متعدد مقامات پر نہایت تفصیل سے بیان کی ہے۔

فاتحہ خلف الامام کے بارے میں

حضرت مجدد کے طریقِ عمل اور اسلوبِ کلام سے عیاں ہے کہ وہ ظاہراً اور باطناً ہر لحاظ سے کتاب وسنت کے قائل تھے۔ اس کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہ کرتے تھے۔ مختلف فیہ مسائل میں وہ تشدد کے قائل نہ تھے۔ لیکن ان کا عمل ہمیشہ حدیث وسنت کے مطابق رہا۔ فاتحہ خلف الامام کے بھی قائل تھے۔ زبدۃ المقامات ان کے حالات میں اولین تذکرہ ہے اور انتہائی مستند ہے۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی اس کے مصنف ہیں جو ان کے مشہور خلیفہ تھے۔ اس کتاب کے بارے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ مجدد صاحب کی وفات کے تین سال بعد ۱۰۳۷ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب میں فاتحہ خلف الامام سے متعلق مجدد صاحب کے مسلک کی خواجہ محمد ہاشم کشمی ان الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں:

این حقیر چوں می دید کہ دائم حضرت ایشاں بنفس نفیس امامت می کردند۔ روزے در خاطر گزشت کہ آیا علم آں چہ باشد؟ بدیں خاطر بملازمت مشرف شد۔ تقریب جمع مذاہب درمیان آوردہ۔ فرمودند شافعیہ و مالکیہ رحمہم اللہ برآنند کہ جز بقرأت فاتحہ نماز درست نیست لہذا خلف امام فاتحہ می خوانند و احادیثِ صحیحہ نیز دلالت برین نماید۔ اما امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ فاتحہ امام را فاتحہ ماموم گفتند۔ ماموم را فاتحہ خلف امام تجویز نمی نماید، و جمہور فقہائے حنفیہ برینند۔ مگر بعضے روایاتِ مرجوحہ از حنفیہ بر جواز فاتحہ خلف امام آمد۔ چوں

---

۵۷۶ اس کے لیے دیکھیے مکتوبات دفتر دوم مکتوب ۲۳، ۵۴ ۔ دفتر اول مکتوب ۱۸۴، ۲۶۰

مہما امکن بر جمع مذاہب می کوشم، دریں صورت جمع را دراں دیدہ ایم کہ خود امامت کنم۔[۷۷]

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

اس حقیر نے جب یہ دیکھا کہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرائضِ امامت خود انجام دیتے ہیں تو ایک روز دل میں خیال گزرا کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا سوال پوچھا۔ جواب میں فرمایا، شافعیہ اور مالکیہ رحہم اللہ کے نزدیک سورہ فاتحہ کے بغیر نماز درست نہیں ہے، لہٰذا وہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے ہیں اور صحیح احادیث بھی اس پہ دلالت کناں ہیں۔ لیکن ہمارے امام، امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ امام کی فاتحہ کو مقتدی کی فاتحہ قرار دیتے ہیں اور امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے، اور جمہور فقہائے حنفیہ بھی اسی پہ عامل ہیں۔ مگر احناف سے بعض مرجوحہ روایات فاتحہ خلف الامام کے جواز کے متعلق بھی موجود ہیں۔۔ تاہم جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم ممکن حد تک، تمام مذاہب فقہیہ میں عملی تطابق کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے اس معاملے میں ہمارے نزدیک جمع و تطابق کی یہی صورت ہے کہ خود فریضہ امامت انجام دیں۔

حضرتِ مجدد کے ان الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ فقہی اعتبار سے حنفی المسلک تھے، مگر اختلافی مسائل میں قولاً و عملاً تشدد کے روادار نہ تھے اور مسئلے کے اسی پہلو کو ترجیح دیتے تھے جو کتاب و سنت سے ہم آہنگ ہو۔

تصنیفات

حضرت مجدد الف ثانی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ذیل میں ان کی تصنیفات کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا جاتا ہے:

۱۔ اثبات النبوۃ: معلوم ہوتا ہے، یہ ان کی سب سے قدیم تصنیف ہے جسے ایک علمی رسالے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ رسالہ مسئلہ نبوت سے متعلق ابوالفضل سے ایک بحث کے نتیجے میں معرضِ تحریر میں لایا گیا تھا۔ تمہید کے علاوہ یہ رسالہ دو بحثوں

---

[۷۷] زبدۃ المقامات ص ۱۹۷، ۱۹۸

پر محتوی ہے۔ ایک بحث میں نبوّت کے معنی و مطلب کی تحقیق کی گئی ہے اور دوسری میں معجزے کے بارے میں ضروری امور ضبطِ کتابت میں لائے گئے ہیں۔ بعدازاں ایک مقالے میں بعثت، حقیقتِ نبوّت، خاتم النبیین اور اثباتِ نبوّت کا بیان ہے اور اس ضمن میں فلاسفہ کے نقطۂ فکر کی تردید ہے۔ کتاب کے آغاز میں بتایا ہے کہ اکبر کے عہد میں مذہبی حالت کیا رُخ اختیار کر گئی تھی اور اس باب میں وہ حدِّ اعتدال سے کتنا آگے بڑھ گیا تھا۔

۲۔ رسالہ ردِّ روافض: یہ رسالہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے شیعہ کی تردید و مخالفت میں ہے۔ اس کی وجہِ تصنیف کے بارے میں شیخ محمد اکرام مرحوم لکھتے ہیں:

غالباً سفرِ لاہور کی یادگار ہے۔ یہ رسالہ اصل میں اس رسالے کا جواب ہے، جو علمائے شیعہ نے علمائے ماوراء النہر کو اس وقت بھیجا، جب عبداللہ خاں ازبک نے ۹۹۷ھ (۱۵۸۸ء، ۱۵۸۹ء) میں مشہد کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ لیکن اس کی تصنیف کی فوری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں کئی شیعہ، علمائے مشہد کے مضامین دہراتے اور امراء و سلاطین کی مجلسوں میں انھیں بڑے فخر سے بیان کرتے۔

حضرت مجدد ان کی تردید کرتے، لیکن انھیں خیال ہوا کہ اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ سپردِ قلم ہونا چاہیے۔ تاکہ عوام الناس میں بھی غلط فہمیوں کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ وہ اس رسالے کے آغاز میں تحریر فرماتے ہیں:

بعضے از طلبۂ شیعہ کہ متردد ایں حدود بودند، بایں مقدمات افتخار و مباہات می نمودند ودر مجالسِ امراء و سلاطین ایں مغالطات شہرت می دارند۔ و ایں حقیر در ہر مجلس و معرکہ مشافہ بمقدمات معقولہ و منقولہ ردِّ آنہا می کرد، و غلطیہائے صریحہ ایشاں را اطلاع می داد۔ اما حمیتِ اسلام و رگِ فاروقیم بایں قدر رد و الزام کفایت نمی کرد و شورش سینۂ بے کینہ تشفی نیافت و بخاطر فاتر قرار یافت کہ اظہارِ مفاسد ایشاں تا زمانے کہ در قیدِ کتابت نہ آید..... نفع عام نہ بخشد۔

اس رسالے میں شیعوں کی نسبت وہی نقطۂ نظر ہے، جس سے مکتوباتِ امام ربانی اور

مکتوباتِ خواجہ محمد معصوم کے پڑھنے والے واقف ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ کافر ہیں اور واجب القتل۔

یہ رسالہ (اثبات النبوۃ اور رسالہ تہلیلیہ کے برعکس جو عربی زبان میں ہیں) فارسی میں لکھا گیا، لیکن اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں کثرت سے روایات و احادیث دی ہیں جو عربی میں ہیں۔ [۵۷۵]

۳۔ رسالہ تہلیلیہ: یہ بیس بائیس صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے جس کا تاریخی نام "معارف لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہے۔ اس میں کلمۂ طیبہ کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ بحث کا آغاز "لا" سے کیا ہے۔ اس کے بعد لفظ اللہ کی حقیقت اور اس کے اشتقاق نحوی کے متعلق علما و مفسرین کے اقوال کی روشنی میں بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں لفظ اللہ کے لطائف، وحدانیت الٰہی کے دلائل اور کلمۂ طیبہ کے فضائل بیان کیے ہیں۔ اس رسالے میں تصوف کا انداز نمایاں ہے۔

۴۔ رسالہ معارف لدنیہ: اس میں حضرت مجدد نے ثابت کیا ہے کہ شریعت اور طریقت میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ پھر ان صوفیا کی مخالفت و مذمت کی گئی ہے جو شریعت کے خلاف باتیں کرتے اور احکام شرعی کو غلط انداز سے ہدفِ تاویل ٹھہراتے ہیں۔ اس قسم کے ناقص علم اور خام فکر صوفیا پر اظہارِ تعجب کرتے ہوئے اور ان پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وعجب است از بعضے درویشان خام ناتمام کہ کشفِ خیالی خود را اعتبار نمودہ بانکار و مخالفت ایں شریعتِ باہرہ اقدام می نمایند۔ وحال آنکہ موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام بایں کلیمی و قرب اگر زندہ می بود، غیر از متابعتِ ایں شریعت امرِ دگر نمی نمود۔

یعنی بعض خام اور ناقص صوفیا پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالی کشف کو قابلِ اعتبار گردانتے اور شریعتِ مقدسہ محمدیہ سے انکار کرتے ہیں۔ حالاں کہ شریعت محمدی کی صداقت کا یہ عالم ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ سے قرب کے باوصف اور کلیم اللہ ہونے کے باوجود شریعتِ محمدی کے اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ پاتے۔

---

۵۷۵ رودِ کوثر ص ۲۴۳، ۲۴۴

۵۔ رسالہ مبدا و معاد: یہ رسالہ بعض صوفیانہ مسائل اور عبارات پر مشتمل ہے، جو حضرت مجدد کے خلیفہ خواجہ محمد صدیق بدخشی نے ان کی بیاض سے جمع کیے۔ بعض مندرجات حضرت مجدد کی روحانی زندگی سے متعلق ہیں۔

۶۔ تعلیقات بر شرح رباعیات خواجہ باقی باللہ: یہ رسالہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی رباعیات کی خود نوشت شرح پر مجدد صاحب کے اضافوں کو محتوی ہے۔ یہ رباعیات وجود باری تعالیٰ اور قدم باری تعالیٰ ایسے دقیق مسئلے سے متعلق ہیں، مجدد صاحب نے حضرت خواجہ کے نقطۂ نظر کی روشنی میں اپنے اسلوبِ خاص میں اس کی وضاحت کی ہے۔

۷۔ تعلیقات عوارف: یہ کتاب ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔

۸۔ ارشاد المریدین: یہ کتاب بھی طبع نہیں ہوئی۔

۹۔ مکتوباتِ امام ربانی: حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات جو مکتوبات امام ربانی کے نام سے موسوم ہیں، بہت شہرت کے حامل ہیں۔ سر زمینِ برصغیر میں جو قدر و منزلت اہلِ علم میں ان مکتوبات کو حاصل ہوئی، وہ تصوف کی اور کسی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔ ان کی ہمہ گیر مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ حضرت مجدد کی زندگی ہی میں ان کی نقلیں مرتب و مدوّن ہو کر ہندوستان کے مختلف شہروں اور اس سے باہر دیگر ممالک میں پھیل گئی تھیں، ان مکتوبات کی تین جلدیں ہیں اور ہر جلد دفتر کے نام سے موسوم ہے۔

دفتر اول: یہ دفتر دُرُّ المعرفت کے نام سے موسوم ہے اور ۳۱۳ مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ ان کو حضرت مجدد کے مرید خاص خواجہ یار محمد بدخشی نے جمع کیا۔ یہ دفتر حضرت کی زندگی ہی میں مرتب ہو گیا تھا۔ حضرت مجدد کو جب ان مکتوبات کی تعداد بتائی گئی تو فرمایا، حضرات صحابۂ بدر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تعداد بھی ۳۱۳ ہے۔ لہٰذا تبرکاً و تیمناً اس دفتر کو اسی مبارک عدد پر ختم کر دیا جائے۔ یہ دفتر ۱۰۲۵ھ میں یعنی قلعہ گوالیار میں محبوس ہونے سے تین سال پہلے جمع ہوا، اور سب مکتوبات سے

مفصل ہے۔ اس میں بیس[۲۰] خطوط وہ ہیں جو انھوں نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ کو لکھے۔ کئی خطوط شیخ فرید اور جہاں گیر کے دوسرے امرا کے نام ہیں، جن میں ان کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ نئے بادشاہ (جہاں گیر) کے عہد میں ترویج دین کی کوشش کریں۔ کچھ خطوط مختلف سوالوں کے جواب میں ہیں یا بعض علمی اور دینی مسائل کے بارے میں ہیں۔

دفتر دوم: اس دفتر کا نام نور الخلائق ہے اور یہ تاریخی نام ہے جو ۱۰۲۸ھ بنتا ہے اور یہی اس کی جمع و تدوین کا سال ہے۔ اس میں ۹۹ مکتوبات ہیں۔ انھیں حضرت مجدد کے مرید خواجہ عبدالحی ابن خواجہ چاکر حصاری نے خواجہ محمد معصوم کے ایما سے جمع کیا۔ اللہ تعالٰی کے اسمائے حسنٰی کی تعداد بھی ۹۹ ہے، لہٰذا اس دفتر کو تبرکاً اسی عدد پر ختم کیا گیا۔ ان خطوط میں بعض بڑے مفصل اور طویل ہیں۔ ایک خط جو خواجہ محمد تقی کے نام ہے بیس سے زیادہ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں اہلِ سنت اور شیعہ مسلک سے متعلق مدلل بحث اور اپنے نقطہ نگاہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایک خط خان جہاں کے نام ہے، جس میں عقائد اسلام تفصیل سے معرضِ تحریر میں لائے گئے۔

دفتر سوم: اس دفتر کا نام معرفت الحقایق ہے۔ پہلے یہ ۱۱۴ مکتوبات کا مجموعہ تھا۔ ان مکتوبات کے جامع حضرت مجدد کے مرید خواجہ محمد ہاشم کشمی برہان پوری ہیں۔ یہ مکتوبات ۱۰۳۱ھ میں حضرت مجدد کی وفات سے تین سال پیشتر جمع کیے گئے۔ قرآن مجید کی سورتوں کی نسبت سے یہ ۱۱۴ مکتوبات ہیں۔ پھر دفتر چہارم شروع ہوا، لیکن اس میں چودہ مکاتیب لکھے گئے تھے کہ حضرت کا انتقال ہو گیا۔ لہٰذا ان چودہ مکاتیب کو بھی شاملِ دفتر کیا گیا۔ اس حساب سے یہ ۱۲۸ مکتوبات ہونا چاہئیں تھے، مگر مطبوعہ نسخوں میں ۱۲۴ مکتوبات ہیں۔ چار مکتوب اس میں شامل نہیں۔ یہ اس زمانے کے مکتوب ہیں جب حضرت مجدد قلعہ گوالیار میں محبوس تھے یا لشکر شاہی کے ہمراہ تھے۔ ان میں ایک مکتوب بادشاہ جہاں گیر کے نام ہے، اس میں دعا کے اسرار اور علما و صلحا کی تعریف کی گئی ہے۔ ایک مکتوب ایک نیک خاتون کے نام ہے، اس میں وہ شرائط بیان کی گئی ہیں جو عورتوں کی بیعت کے سلسلے میں اسلام نے مقرر کی

ہیں اور مروّجہ بدعات کی تفصیلات بتائی گئی ہیں، جن میں ہندوستان کی بہت سی عورتیں مبتلا تھیں اور یہ وہ بدعات ہیں جو اب بھی مسلمان معاشرے میں موجود ہیں۔ مثلاً مرض چیچک اور بعض دیگر امراض کی صورت میں سیتلا دیوی کی منت ماننا، بزرگوں کی قبروں پر جانا، وہاں نذر ونیاز دینا اور جانور ذبح کرنا، پیروں کے نام کے روزے رکھنا، مختلف چیزوں کے شگون لینا، جادو ٹونا وغیرہ کو صحیح سمجھنا اور قابلِ عمل گردا ننا، ان بدعات کا دائرہ شرک تک پھیلا ہوا ہے، حضرت مجدد ان کے شدید مخالف تھے۔

مکتوبات کی علمی ہمہ گیری

مکتوباتِ امام ربانی کو علم وفضل کے دلآویز مجموعے کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں تحقیقی، فقہی، تبلیغی ہر قسم کا مواد موجود ہے۔ اسلوبِ نگارش بڑا زوردار، مؤثر اور خطیبانہ ہے۔ حضرت مجدد باطل کی تردید اور اعلائے کلمۃ اللہ میں نہایت جری ہیں۔ خلافِ شرع امور کی پورے زور اور جوش سے تردید کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ ایک مکتوب کی چند سطور سے ہوسکتا ہے جو انھوں نے ملا حسن کشمیری کے نام تحریر فرمایا۔ لکھتے ہیں:

نوشتہ بودند کہ شیخ عبدالکبیر یمنی گفتہ است کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ عالم الغیب نیست۔ بے اختیار رگِ فاروقیم درحرکت می آید وفرصتِ تاویل وتوجیہ نمی دہد۔ قائل ایں سخنان شیخ کبیر یمنی باشد یا شیخ اکبر شامی، کلام محمد علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام درکار است، نہ کلام محی الدین عربی وصدرالدین قونیوی وعبدالرزاق کاشی۔ مارا بہ نص کار است، نہ بہ فص۔ مارا فتوحاتِ مدنیہ از فتوحاتِ مکیہ مستغنی ساختہ است۔

یعنی لکھا گیا ہے کہ شیخ عبدالکبیر یمنی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب نہیں ہے۔ اس بات سے میری رگِ فاروقی بے اختیار حرکت میں آگئی اور اس نے تعبیر وتوجیہ کا کوئی موقع باقی نہ رہنے دیا۔ اس قسم کی باتیں کہنے والا شیخ کبیر یمنی ہو یا شیخ اکبر شامی، ہمارے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہمیں صرف حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے تعلق ہے۔ محی الدین عربی، صدرالدین قونیوی اور عبدالرزاق کاشی کے کلام کو ہم کوئی

اہمیت نہیں دیتے۔ ہمیں نص سے غرض ہے، نہ کہ فص (فصوص الحکم) سے ہم کو فتوحات مدنیہ (حدیث) نے فتوحات مکیہ (کتاب) سے قطعی بے نیاز کر دیا ہے۔

اندازہ کیجیے یہ الفاظ حقیقت و صداقت، جذبہ و جوش اور تاثیر و خطابت کے لحاظ سے کتنے زوردار ہیں۔

تجدیدِ دین

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تجدیدِ دین کا کیا مطلب ہے اور اسلام میں مجدد کا تصور کیا ہے؟ ابو داؤد میں ایک حدیث ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

ان اللہ یبعث لھٰذہ الامۃ علیٰ رأس کل مائۃ من یجدد لھا امر دینھا۔[۷۹]

اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر صدی میں ایسا شخص پیدا کرے گا جو دین کی تجدید کرے گا۔

یعنی امت محمدیہ میں اللہ تعالیٰ ہر صدی میں ایسا شخص پیدا کرتا رہے گا جو لوگوں کو مختلف برائیوں کے ارتکاب سے روکنے، بدعات و محدثات سے دامن کشاں رہنے اور نیکی کے پھیلانے کی تلقین کرے گا۔ کہا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل اکابرِ دین اپنے زمانے کے مجدد و مصلح تھے:

عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱ھ) پہلی صدی ہجری کے، امام شافعی یعنی محمد بن ادریس (۲۰۴ھ) دوسری صدی کے، ابن شریح (۳۰۶ھ) تیسری صدی کے، امام باقلانی احمد بن طیب (۴۰۳ھ) یا امام اسفرائنی احمد بن محمد (۴۰۶ھ) چوتھی صدی کے، امام غزالی (۵۰۵ھ) پانچویں صدی کے، امام فخرالدین رازی (۶۰۶ھ) چھٹی صدی کے، ابن دقیق العید (۷۰۲ھ) ساتویں صدی کے، امام بلقینی سراج الدین (۸۰۵ھ) آٹھویں کے، جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) نویں صدی ہجری کے مجدد تھے۔ شیخ احمد سرہندی فاروقی کو دسویں صدی ہجری کے مجدد (مجدد الف ثانی) کہا جاتا ہے۔

---

[۷۹] ابو داؤد۔ آخر کتاب المہدی اول کتاب الملاحم۔ باب ما یذکر فی قرن المائۃ۔

تجدیدِ دین کے بارے میں علمائے کرام نے مختلف کتابوں میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ زمانے کے حالات کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر دور، ہر ملک اور ہر علاقے میں ایسے مصلحین پیدا کرتا ہے، جو اس دور کی گمراہیوں کی نشان دہی کرتے اور لوگوں کو ان سے روکتے ہیں، ان کی تعداد ایک یا ایک سے زائد ہو سکتی ہے اور ان کا نہج تبلیغ اور طریق تجدید وقت و ماحول کے مطابق الگ الگ ہوتا ہے — یہ مجددین اور مصلحین صدی کے شروع یا آخر ہی میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ جب گمراہیوں کا زور بڑھ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے حالات کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کے سامان فراہم کر دیتا ہے۔ اس قسم کے اونچے کردار کے حامل حضرات صدی کے شروع میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور صدی کے وسط میں بھی۔ یعنی جب وقت کا تقاضا انھیں آواز دیتا ہے، وہ میدانِ عمل میں اتر آتے اور فرائضِ تبلیغ انجام دینے پہ کمربستہ ہو جاتے ہیں۔[۵۸]

وفات

حضرت مجدد الف ثانی نے تریسٹھ (۶۳) سال عمر پا کر بروز سہ شنبہ ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ کو سرہند میں وفات پائی۔ نمازِ جنازہ آپ کے صاحب زادۂ گرامی خواجہ محمد سعیدؒ نے پڑھائی، جو زبدۃ المقامات کے مصنف خواجہ محمد ہاشم کشمی کے بقول "افقہ فقہائے وقت" تھے — زبدۃ المقامات میں مرقوم ہے کہ خواجہ محمد سعیدؒ نے اپنے والدِ گرامی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی نمازِ جنازہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کی، — جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں:

حضرت مخدوم زادۂ بزرگ خواجہ محمد سعید دامت برکاتہٗ نمازِ جنازہ پیر و پدر بزرگوار خود رضی اللہ عنہ نمودند و بعد از نماز برائے دعا توقف نفرمودند کہ مقتضی سنت چنیں نیست و در کتبِ فقہِ معتبرہ مرقوم است کہ بعد از نماز جنازہ ایستادہ دعا کردن مکروہ است، ہرچند

۵۸۔ تفصیل کے لیے دیکھیے عون المعبود شرح ابوداؤد، ج ۴ ص ۱۷۸ تا ۱۸۲۔

کہ عمل بعضے امام دریں ایّام چنیں ست۔[۵۸۱]

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے :

حضرت مخدوم زادہ خواجہ محمد سعیدؒ نے اپنے مرشد و پدرِ بزرگوار رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھائی، اور نماز کے بعد دعا کے لیے نہیں ٹھہرے، کیوں کہ یہ دعا خلافِ سنت ہے، اور فقہ کی مستند کتابوں میں لکھا ہے کہ نماز جنازہ کے بعد کھڑے ہو کر دعا کرنا مکروہ ہے۔ تاہم بعض امام ان دنوں بھی اس (خلافِ سنت) فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔

۱۴۱۔ شیخ اسد اللہ ہرگامی

شیخ اسد اللہ بن اسماعیل بن خضر علوی حسینی ہرگامی، ۹۹۴ھ کو ہرگام میں پیدا ہوئے جو اعمالِ خیر آباد میں ایک خاصا بڑا گاؤں تھا۔ ان کے والد مولانا مفتی اسماعیل ہرگامی مشہور عالم تھے، ان ہی سے تعلیم پائی، علم فقہ بھی ان ہی سے حاصل کیا۔ حنفی المسلک تھے، نیک اور متدین عالم دین تھے۔ اس دور کے علما نے صالحین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تصوّف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ تمام عمر درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں صرف کر دی۔ ۱۰۶۷ھ کو ہرگام میں فوت ہوئے اور جلالی پور نامی ایک قریہ میں دفن کیے گئے۔[۵۸۲]

۱۴۲۔ مفتی اسماعیل ہرگامی

مفتی اسماعیل بن خضر علوی حسینی ہرگامی، ۹۴۵ھ کو ہرگام میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی اور اپنے والد شیخ خضر ہرگامی سے علم حاصل کیا، جو اس عہد کے علمائے دین میں سے تھے۔ دیگر اساتذہ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ حتیٰ کہ دیارِ ہند

---

[۵۸۱] زبدۃ المقامات، ص ۲۹۴

[۵۸۲] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷

کے بہت بڑے عالم، شیخ، فقیہ، اصولی اور علوم عربیہ کے ماہر گردانے گئے۔ ان کے بیٹے شیخ اسد اللہ ہرگامی نے شیخ عبدالسمیع بن عبدالرحمٰن عباسی لاہرپوری سے اخذِ طریقت کیا۔ مفتی اسماعیل ہرگامی بھی شیخ عبدالسمیع سے مستفیض ہوئے۔ شیخ عبدالسمیع ان کے بھانجے ہوتے تھے اور اس زمانے کے معروف صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ ان کے علاوہ شیخ عبدالقدوس بن عبدالسلام جون پوری سے بھی استفادہ کیا۔ عمر بھر اپنے گاؤں ہرگام کی مسندِ افتا پر فائز رہے اور درس و افادہ اور ذکرِ الٰہی میں زندگی بسر کر دی۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۰۳۰ھ کو وفات پائی اور اس نواح کے ایک قریہ اسمٰعیل پور میں مدفون ہوئے۔[۵۸۳]

۴۳۔ شیخ اسماعیل بن محمود سندھی

شیخ اسماعیل بن محمود شطاری سندھی، ان کی کنیت ابوالفرج اور لقب سراج الدین تھا۔ ابوالفرج سراج الدین برہان پوری کے نام سے معروف تھے۔ بہت بڑے صوفی، صالح عالمِ دین اور فقیہ نامدار تھے۔ صغر سنی ہی میں مشہور صاحبِ طریقت و فنون شیخ عیسیٰ بن قاسم شطّاری سے لزومِ اختیار کر لیا تھا اور اس میں کامل دلچسپی رکھتے تھے۔ شیخ اسماعیل نے ۱۰۳۷ھ کو برہان پور میں فارسی زبان میں ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام مخزن الدعوات رکھا۔ یہ کتاب اس مواد پر مشتمل ہے جو انھیں اپنے شیخ سے حاصل ہوا۔ کتاب دعوتی انداز کی ہے۔[۵۸۴]

۴۴۔ شیخ اسماعیل لاہوری

شیخ اسماعیل بن فتح اللہ بن عبداللہ بن فیروز لاہوری، جلال الدین اکبر کے

---

۵۸۳ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۷۔

۵۸۴ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۷

عہد میں پیدا ہوئے۔ کھوکھر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ پانچ سال کی عمر کو پہنچے تو مرضِ طاعون میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے والد فتح اللہ نے اسی حالت میں ان کو شیخ عبدالکریم لاہوری کے سپرد کر دیا۔ بڑے ہوئے تو حصولِ علم میں لگ گئے اور تمام درسی کتابیں مکمل کر لیں۔ یہاں تک کہ عالمِ کبیر اور محدثِ وقت مانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد لاہور سے دس میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے ایک گاؤں کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا اور وہاں درس و افادہ میں مشغول ہو گئے تھے۔ طویل مدت تک وہاں مقیم رہے، پھر لاہور منتقل ہو گئے۔

لاہور کے اس عالمِ دین کا حلقۂ درس بڑا وسیع تھا، ان کے تلامذہ میں شیخ عبدالحمید لاہوری، شیخ تیمور لاہوری، شیخ جان محمد لاہوری اور خلقِ کثیر شامل ہے۔ ۵ / شوال ۱۰۸۵ھ کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے[۸۵]

۴۵۔ شیخ اسماعیل محدّث بیجاپوری

شیخ اسماعیل محدث بیجاپوری، شیخ شمس الدین محمد ملتانی بدری کی اولاد سے تھے اور اپنے عہد کے عالمِ کبیر تھے۔ حدیث اور فقہ میں شہرت رکھتے تھے اور بڑے فاضل تھے۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ کے دورِ حکومت کے بزرگ تھے اور اس کے زمانے میں بیجاپور کے منصب درس و تدریس پر فائز تھے۔ ان کی وفات بھی بیجاپور میں ہوئی اور دفن بھی اسی شہر میں کیے گئے[۸۶]

۴۶۔ شیخ افضل محمد اکبر آبادی

شیخ افضل محمد بن یوسف بن عبداللہ تمیمی انصاری اکبر آبادی، فقہ و اصول

---

[۸۵] خزینۃ الاصفیا — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۰

[۸۶] روضۃ الاولیا — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۷۳

اور علوم عربیہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ ان کے والد شیخ یوسف بھی نامور علما میں سے تھے، شیخ افضل محمد نے کتبِ فقہ ان ہی سے پڑھیں اور علم طریقت بھی ان ہی سے حاصل کیا۔ بعض کتبِ درسیہ اپنے عم محترم جلال الدین سے پڑھیں، ان کی وفات کے بعد مفتی ابوالفتح بن عبدالغفور تھانیسری، قاضی جلال الدین ملتانی اور ملا مبارک ناگوری کی خدمت میں گئے اور ان سے حصولِ علم کیا۔ قاضی عیاض کی شفا، شیخ جعفر حسینی سے پڑھی۔ بعدازاں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ نہایت قانع عفیف متوکل علی اللہ اور مستغنی المزاج عالم دین تھے۔ ۲۱ صفر ۱۰۰۳ھ کو اکبرآباد (آگرہ) میں انتقال کیا اور وہیں تدفین ہوئی۔ [۵۸۷]

۷۴۔ قاضی اللہ داد بلگرامی [۵۸۸]

قاضی اللہ داد حنفی بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ قاسم [۵۸۹] بن محمد بن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہم کی اولاد سے تھے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم کے لیے مختلف اساتذہ کی خدمت میں گئے۔ کتبِ درسیہ شیخ عبدالرحمن عباسی لاہرپوری سے پڑھیں۔ جب فقہ اور اصول وغیرہ میں مہارت پیدا ہو گئی، تو واپس بلگرام تشریف لے گئے اور مسندِ تدریس کو زینت بخشی۔ ان کا شمار معروف فقہائے وقت اور مشہور فضلائے عصر میں ہوتا تھا۔ شیوخِ فرشوریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ فرشوری خاندان بلگرام اور اس کے گرد و نواح میں پھیلا ہوا تھا اور اس کے افراد

---

۵۸۷ اذکارِ ابرار ص ۲۲۴۔ ۲۲۶۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳، ۴، ۷۔

۵۸۸ عربی اور فارسی تذکرہ نگاروں نے اسے الہداد لکھا ہے لیکن ہم اسے اللہ داد لکھیں گے، کیوں کہ اصل لفظ اللہ داد ہی ہے۔

۵۸۹ حضرت قاسم رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو بکر صدیق کے پوتے تھے۔ مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ میں سے تھے اور مشہور تابعی تھے۔ ۱۰۷ھ میں فوت ہوئے۔

عہدِ قدیم سے مختلف مناصبِ شرعیہ اور عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ اپنی علمی برتری اور تدین وتقویٰ کی وجہ سے شہر بلگرام اور دیگر علاقوں میں دودمانِ فرشوری کو نہایت احترام وتکریم کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بلگرام میں یہ حضرات محلہ سید دائرہ میں سکونت پذیر تھے۔ ان میں قاضی اللہ داد بلگرامی معقولات ومنقولات میں خاص شہرت کے حامل تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے یہ عالم وفقیہ بلگرام کی مسندِ تدریس پر بھی فائز تھے اور عدل وقضا اور افتا کا منصب بھی ان کے پاس تھا۔ تہذیب المنطق پر ان کی تعلیقات وحواشی ہیں۔[۹۰]

۴۸۔ مولانا اللہ داد سلطان پوری

مولانا اللہ داد سلطان پوری، درحقیقت علاقۂ سندھ کے ایک قریۂ بنودہ سے تعلق رکھتے تھے۔ (مشرقی) پنجاب کے ایک مقام سلطان پور میں پیدا ہوئے اور وہاں کے مشہور عالمِ دین مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری سے تحصیلِ علم کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سلطان پور ہی میں درس وافتا کی مسند آراستہ کی۔ منقول ہے کہ تصنیف وتالیف کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے فقیہ، شیخ اور معروف عالمِ دین تھے۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں خاصہ عرصہ پنجاب کی مسندِ صدارت پر بھی متمکن رہے۔ بعد ازاں الہ آباد میں قاضی مقرر کر دیے گئے تھے۔

مولانا اللہ داد سلطان پوری ملا عبدالقادر بدایونی کے معاصر تھے، وہ منتخب التواریخ میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شرافت اور حسب ونسب میں نہایت ممتاز اور سربرآوردہ ہیں۔ ابتدا میں علم کے غرور اور جوانی کی ترنگ میں انتہائی متکبر

---

۹۰ مآثر الکرام ص ۲۱۸، ۲۱۹۔
۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۸۲، ۸۳۔

مغرور تھے، لیکن اب دنیا کا اچھا خاصہ تجربہ ہو چکا ہے اور غرور و تکبر، فقر و انکساری میں بدل گیا ہے۔ کچھ عرصہ پنجاب کی صدارت کے عہدہ پر فائز رہے ہے۔اب کافی عرصے سے الٰہ آباد کے نئے شہر کی قضاءت کے منصب پر مامور ہیں، لیکن بادشاہ کی خدمت ہی میں رہتے ہیں۔ الٰہ آباد میں جو معمولی سی معاش ملی ہے، اسی پہ قانع ہیں۔ دنیا داروں کے دروازوں پہ دستک نہیں دیتے۔ بڑے نیک اور عبادت گزار ہیں۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے لیکن ان کی تصنیفات میں سے نام صرف کشف الغمہ و منہاج الدین کا لکھا ہے۔ ۱۰۰۶ھ کو فوت ہوئے۔[۹۱]

۴۹- شیخ امین بن احمد نہروالی

شیخ امین بن احمد نہروالی گجراتی رفیع القدر عالم اور جلیل القدر محدث تھے۔ وسعتِ علم و فضل میں یگانۂ روزگار تھے۔ صاحب مجمع البحار شیخ محمد بن طاہر پٹنی کے شاگرد تھے۔ اخذ حدیث ان ہی سے کیا تھا۔ گلزارِ ابرار کے مصنف شیخ محمد غوثی مانڈوی لکھتے ہیں کہ ۹۸۳ھ کو مانڈو گئے، وہاں ایک سال قیام پذیر رہے۔ بعدازاں اجین تشریف لے گئے۔ وہاں مختلف شیوخ سے ملے، جن میں شیخ راجی محمد قادری، شیخ عبدالغفور اور شیخ جمال الدین احمد شامل ہیں۔ اجین میں ان کا قیام علمی اعتبار سے بہت مفید رہا۔ اس شہر میں انھوں نے درس و افادہ کا سلسلہ جاری کیا اور نہایت قناعت و عفاف اور زہد و عبادت کے ساتھ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان سے تشنگانِ علوم کی بہت بڑی تعداد نے استفادہ کیا۔ اُجین سے وہ قاضی عبدالعزیز بن عبدالکریم بن راجی محمد اجینی گجراتی کی ملاقات کے لیے برہان پور

---

[۹۱] منتخب التواریخ ص — تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶ — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۸۶۔

گئے، وہیں یکم ربیع الاول ۱۰۱۷ھ کو وفات پائی - تدفین بھی وہیں ہوئی۔[۹۲]

ب

۵۰- شیخ بابو بن شیخ جیو گجراتی

شیخ بابو بن شیخ جیو حسینی بخاری پٹنی گجراتی، ارضِ گجرات کے مشہور شہر پٹن میں پیدا ہوئے اور اساتذۂ عصر سے علم حاصل کیا۔ تحصیل کے بعد درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے استفادہ کیا۔ عالم و فقیہ، زاہد و عابد، صاحب فضل و کمال اور علاقۂ گجرات کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔ ان کے درس و تدریس کا غلغلہ عرصہ تک سرزمینِ گجرات میں بلند ہوتا رہا اور تشنگانِ علوم ان کے چشمۂ علم سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ انھوں نے ۱۰۰۶ھ میں وفات پائی۔[۱]

۵۱- شیخ بایزید انصاری سہارن پوری

شیخ بایزید بن بدیع الدین بن رفیع الدین انصاری سہارن پوری، سہارن پور میں پیدا ہوئے، وہیں اپنے والد شیخ بدیع الدین کی خدمت میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کیں۔ پھر عازمِ سرہند ہوئے، وہاں شیخ محمد معصوم سرہندی سے اخذِ طریقت بھی کیا اور دیگر علوم کی بھی تحصیل کی، طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہے، "تا آنکہ علوم ظاہری اور معرفت و تصوف میں حصۂ وافر حاصل کیا۔ شیخ محمد معصوم نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا تھا۔ سرہند سے واپس سہارن پور گئے اور دعوت و ارشاد اور درس و تدریس کو مشغلہ قرار دے لیا۔ جلیل القدر عالم، فقیہ، متدین عفیف النفس متوکل علی اللہ، کامیاب مدرس، صحیح الفکر، مصلحِ وقت تھے۔ ان سے بہت سے

---

۹۲ اذکار ابرار ص ۴۸۳، ۴۸۴ —— نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۸۳۔

۱ اذکار ابرار ص ۴۴۱، ۴۴۲ —— نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۸۷، ۸۸۔

نامور علما نے استفادہ کیا۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ کس مہینے کی کس تاریخ کو وفات پائی۔ البتہ تذکروں میں مذکور ہے کہ سوموار کے دن ۱۰۰۰ھ کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ جائے وفات سہارن پور ہے۔[۵۱]

۵۲- شیخ بایزید بلگرامی

شیخ بایزید بن کمال الدین بن عبدالدائم عثمانی بلگرامی حنفی المسلک تھے۔ جید عالم دین، فقہ اور اصولِ فقہ کے ماہر تھے۔ اصول بزدوی پر چوں کہ گہری نظر رکھتے تھے، لہذا بزدوی دان (یعنی عالم بزدوی) کے عرف سے معروف تھے تمام عمر درس وافادہ میں صرف کر دی۔ ان کے عصر اور شہر میں ان کے پایہ کا کوئی عالم نہ تھا۔ تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا، البتہ ۱۰۶۶ھ کے بعد زندہ تھے۔[۵۲]

۵۳- شیخ بدرالدین سرہندی

شیخ بدرالدین بن ابراہیم سرہندی مسلکاً حنفی تھے۔ مشرقی پنجاب کے مشہور شہر سرہند میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اور ان کے فرزندِ گرامی شیخ محمد صادق سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی قابلِ ذکر تصنیف حضرات القدس ہے۔ اس میں اپنی تعلیم کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ میں نے شرحِ المواقف، تفسیر بیضاوی، عضدیہ مع حاشیہ سید شریف جرجانی مجدد الف ثانی سے

---

۵۲ مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں انھیں شیخ بایزید برہان پوری لکھا ہے۔ الفاظ یہ ہیں: "شیخ بایزید برہان پوری عالم متورع وفاضل متشرع بود خرقہ خلافت از شیخ محمد معصوم سرہندی قدس سرہ داشت" (ص ۲۶۲) — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۸۸ — فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۷۔

۵۳ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۸۸، ۸۹ بحوالہ شرائف عثمانی۔

پڑھیں اور شرح عقائد مع حاشیہ خیالی، تحریر اقلیدس اور شرح المطالع مع سید شریف شیخ محمد صادق سے پڑھیں۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ میں ستّرہ۱۷ سال شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی خدمت میں رہا۔ اس اثنا میں ان سے اخذِ طریقت کیا اور بہت سے فیوض حاصل کیے۔

شیخ بدرالدین کی تصنیف حضرات القدس دو جلدوں میں ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی تصنیفات کا بھی ذکر کیا ہے، جن میں ایک سنوات الاتقیا ہے، جو مشائخ کے حالات وسوانح پر مشتمل ہے۔ ایک الروائح ہے جو اصطلاحات صوفیہ کی شرح اور بزرگانِ نقشبندیہ و قادریہ کے اشغال و اذکار سے متعلق ہے۔ دوسری تصنیفات کرامات الاولیا، مجمع الاولیا، ترجمہ فتوح الغیب از شیخ عبدالقادر جیلانی، ترجمہ بہجۃ الاسرار ترجمہ روضۃ النواظر فی ترجمہ شیخ عبدالقادر، یہ ترجمہ انھوں نے داراشکوہ کے کہنے سے کیا۔ ترجمہ عرائس البیان تفسیر روزبہان البقلی ہیں۔[۵۴]

۵۴۔ قاضی بدرالدین صدیقی بدایونی

قاضی بدرالدین صدیقی بدایونی، شیخِ وقت اور عالم و فقیہ تھے۔ ان کا شمار علوم عربیہ اور فقہ اور اصولِ فقہ کے جید علما میں ہوتا تھا۔ شاہ جہان کے عہد میں بدایوں کی مسندِ قضا پر فائز ہوئے اور عمر بھر اس پر فائز رہے۔ تبحرِ علمی میں ضرب المثل تھے۔ ۱۰۶۰ھ کو وفات پائی۔ قاضی علی محمد بدایونی نے "قد خسف بدری" سے تاریخِ وفات نکالی۔[۵۵]

۵۵۔ شیخ برہان الدین برہان پوری

شیخ برہان الدین برہان پوری علاقہ خاندیس کے ایک قریہ میں پیدا ہوئے جس کا نام

---

۵۴ حضرات القدس۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۲۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۹۰
۵۵ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۹۰۔

"معمولی" تھا۔ پرورش بھی برہان پور ہیں ہوئی۔ والد کی طرف سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور والدہ کی طرف سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ والدہ کا اسم گرامی فاطمہ تھا۔ نیکی اور زہد و تقویٰ کے ماحول میں تربیت پائی، کھانے پینے اور لباس کے معاملے میں اعتدال و اقتصاد کا عمدہ نمونہ تھے۔ اس دَور کے بزرگ شیخ عیسیٰ بن قاسم شطاری کے زاویہ میں فروکش تھے اور فقرا اور اہل اللہ کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ علم و فضل کی مختلف شاخوں پر عبور رکھتے تھے لیکن تصوّف و طریقت اور ارشاد و تلقین کو شب و روز کا معمول قرار دے لیا تھا۔ امرا و سلاطین سے میل جول اور تعلقات قائم کرنے سے گریزاں رہتے، بلکہ اہلِ دولت اور اربابِ حکومت میں سے کوئی ان کے پاس آتا تو عام طور پر ملنے سے انکار کر دیتے۔

خافی خاں منتخب اللباب میں لکھتا ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالم گیر جب اپنے بڑے بھائی دارا شکوہ سے لڑائی کے لیے آگرہ کی طرف روانہ ہوا تو ہیئت بدل کر اچانک شیخ برہان الدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کو ہیئت بدلنے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ شیخ ملوک و سلاطین سے ملنا پسند نہ کرتے تھے۔ شیخ نے پوچھا: "آپ کا نام کیا ہے"؟ کہا: "اورنگ زیب"۔ شیخ خاموش ہو گئے، اور بادشاہ کی طرف بالکل عنانِ توجہ مبذول نہ فرمائی۔ بادشاہ نے اپنی طرف سے شیخ کا یہ عدم التفات دیکھا تو اٹھ کر چلا گیا۔ دوسرے روز پھر آیا، شیخ نے فرمایا: "اگر تمھیں یہ خانقاہ پسند آگئی ہے تو میں اسے تیرے لیے خالی کر دیتا ہوں اور اپنے لیے کوئی اور جگہ تلاش کر لیتا ہوں۔"

شیخ کی یہ بات سن کر اورنگ زیب باہر نکل گیا اور ایک خادم جس کو شیخ اچھا سمجھتے تھے بادشاہ کے پیچھے گیا اور اسے اشارے سے سمجھایا کہ "جب شیخ نماز کے لیے اپنے حجرے سے باہر نکلیں تو حاضر خدمت ہو کر یہ عرض کرو کہ میں دعا کے لیے حاضر ہوا ہوں اور فاتحۂ رخصت کا طالب ہوں۔" چنانچہ نماز کے وقت بادشاہ حاضر ہوا اور عرض گزار ہوا کہ "میرا بھائی دارا شکوہ احکام شریعت اور دینِ اسلام سے رو گرداں ہو گیا ہے اور میں اس سے لڑائی کی غرض سے نکلا

ہوں اور دعائے خیر اور فاتحۂ رخصت کا طلب گار ہوں"۔

بادشاہ کی یہ عرض سن کر شیخ نے فرمایا:

از فاتحۂ ما فقیرانِ کم اعتبار چہ می شود؟ شما کہ بادشاہید بنیت عدالت و رعیت پروری فاتحہ بخوانید، ما ہم دست برمیداریم۔

ہم ادنیٰ درجے کے فقیر لوگ ہیں، ہمارے فاتحہ پڑھنے سے کیا ہونا ہے۔ آپ بادشاہ ہیں جو عدل و انصاف اور رعیت پروری کی غرض سے نکلے ہیں۔ آپ فاتحہ پڑھیں، ہم بھی آپ کے پیچھے ہاتھ اٹھا دیں گے۔

نظام الدین برہان پوری نے شیخ کے اس فرمان کو عالم گیر کے لیے کامیابی کی خوشخبری سے تعبیر کیا اور کہا یہ آپ کے لیے فتح کی نوید ہے۔

عاقل خاں رازی (مؤلفِ واقعات عالم گیری) شیخ کے معتقد و مرید تھے، انھوں نے ان کے ملفوظات، ثمرات الحیات کے نام سے جمع کیے ہیں۔ ایک اور بزرگ نے اُن کے ملفوظات و ارشادات کا مجموعہ مرتب کیا ہے جس کا نام روائح الانفاس ہے۔

شیخ برہان الدین برہان پوری تصنیفی ذوق بھی رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں شرح اسماء اللہ الحسنیٰ اور شرح اٰمنتُ باللہِ شامل ہیں ـــــ اس عالم و فقیہ نے اسّی سال سے زائد عمر پاکر ۱شعبان ۱۰۸۳ھ کو برہان پور میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے[۵۶]

منتخب اللباب کے مصنف خافی خان کے بقول شیخ برہان الدین کا انتقال عالم گیر کے بیسویں سالِ جلوس میں ہوا۔ اس حساب سے سن ہجری ۱۰۸۹ بنتا ہے۔

۵۶۔ شیخ بلال لاہوری

شیخ بلال بن عبداللہ حنفی قادری لاہوری، اپنے عصر کے علمائے مشاہیر میں سے تھے۔

---

[۵۶] منتخب اللباب ج ۲ ص ۵۵۳ تا ۵۵۵ ـ مرآۃ العالم (قلمی ورق ۳۵۴ ب ـ تاریخ برہان پور ۱۴۰ تا ۱۴۲ ـ مآثر الامراء ج ۲ ص ـ "معارف" (اعظم گڑھ) مئی ۱۹۵۱ ـ احوال و آثار عبداللہ خویشگی ص ۴۹، ۵۰ ـ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۳۴ تا ۵۴ ـ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۹۱، ۹۲۔

معروف فقیہ اور بدرجۂ غایت زاہد و عابد تھے۔ تصوّف و طریقت میں شیخ شمس الدین لاہوری سے فیض یافتہ تھے۔ ارشاد و تلقین کی مسند پر فائز تھے۔ ان کی نیکی اور عبادت و زہد کی اثر پذیری کا یہ عالم تھا کہ بادشاہِ ہند شاہ جہان ایک سے زیادہ مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لاہور کے اس فقیہ نام دار نے ستّر برس عمر پا کر ۲۸ شعبان ۱۰۴۶ھ کو لاہور میں انتقال کیا[۵۷]

۵۷۔ شیخ بہلول دہلوی

شیخ بہلول دہلوی دراصل شکارپور کے رہنے والے تھے، وہاں سے دہلی آئے اور مفتی جمال الدین دہلوی سے اخذِ علم کیا۔ پھر گجرات گئے، وہاں کے مشہور اساتذہ شیخ عبداللہ بن سعداللہ اور شیخ رحمت اللہ بن قاضی عبداللہ سے علمِ حدیث کی تحصیل کی اور طویل عرصہ ان کی صحبت میں رہے۔ گجرات سے پھر عازمِ دہلی ہوئے اور شیخ قمیص بن ابوالحیات سادھوروی سے کسبِ فیض کیا اور بعد ازاں درس و افادہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ عالمِ کبیر، محدثِ وقت اور مشہور فقیہ تھے۔ تفسیر اور حدیث پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ زہد و تعبد اور صلاحِ عمل میں ضرب المثل تھے۔

منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے ان کے علم و فضل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علمِ حدیث میں بہت اشتغال اور مہارت رکھتے تھے، درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے، ذوقِ معرفت و طریقت میں بے مثل تھے اور دنیا اور اہلِ دنیا سے بے نیاز تھے۔ چوں کہ مستقل طور پر دہلی کو اپنا مسکن قرار دے لیا تھا۔ لہٰذا دہلوی مشہور ہوئے۔

اس عالمِ دین اور گیارھویں صدی ہجری کے ہندی فقیہ نے ۴ ارجب ۱۰۰۷ھ کو دہلی میں وفات پائی[۵۸]

---

[۵۷] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۹۳، ۹۴ ــــ عملِ صالح، ص ۳، ص ۳۶۶، ۳۶۷

[۵۸] منتخب التواریخ ــــ تذکرۂ علمائے ہند ص ۳۳، ۳۴ ــ نزہۃ الخواطر ج ...

پ

۵۸- شیخ پیر محمد سلونی

شیخ پیر محمد کا سلسلہ نسب یہ ہے : پیر محمد بن عبدالغنی بن ابوالفتح بن اللہ داد بن منّ اللہ بن بہاء الدین عمری جون پوری سلونی ۔ شیخ پیر محمد سلونی مشہور مشائخ ہند میں سے تھے۔ ۹۹۶ھ کو سلون میں پیدا ہوئے۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم کی غرض سے مانک پور کا سفر کیا اور اس کے لیے اپنی تمام مساعی وقف کر دیں۔ یہاں تک کہ بحث و اشتغال میں اونچے درجے کو پہنچے۔ قیام مانک پور کے زمانے میں ایک روز اپنے مدرسے کو جا رہے تھے کہ راستے میں شیخ عبدالکریم بن سلطان مانک پوری سے ملاقات ہوئی۔ شیخ عبدالکریم نے پوچھا "کون سی کتابیں پڑھتے ہو؟" کہا "ہدایۃ الفقہ اور تفسیر بیضاوی"! شیخ نے فرمایا "میرے پاس آجاؤ، جو چاہو گے میں تمھیں پڑھاؤں گا۔" لیکن پیر محمد سلونی چوں کہ شیخ کے مرتبۂ علم اور مذہب و مشرب سے واقف نہ تھے، لہٰذا ان کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور سیدھے مدرسے چلے گئے۔ لیکن استاذ کی خدمت میں پہنچے اور درس کے لیے ان کے حضور دوزانو ہو کر بیٹھے تو نہ شاگرد پڑھنے پر قادر ہو سکا اور نہ استاذ پڑھانے پر۔! استاذ کو اس غیر متوقع صورت حال سے بڑا تعجب ہوا اور شاگرد سے اس کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے وہ واقعہ بیان کیا جو ان کے اور شیخ عبدالکریم کے درمیان پیش آیا تھا۔ اب استاد نے شاگرد کو ساتھ لیا، شیخ عبدالکریم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے معذرت و عفو کی درخواست کی۔ بعد ازاں پیر محمد سلونی، چھ مہینے شیخ عبدالکریم سے وابستہ رہے۔ ان سے باقاعدہ ہدایہ اور بیضاوی کا درس لیا اور طریقت و سلوک سے متمتع ہوئے۔ تصوف و طریقت کی منزلیں طے کر چکے تو شیخ نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے واپس سلون بھیج دیا۔

شیخ پیر محمد اس زمانے کی نہایت مؤثر شخصیت تھے۔ اور دعوت و ارشاد

میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے وعظ و نصیحت اور توجہِ خاص سے بے شمار غیر مسلم حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اس دور میں ہندو ؤں کا ایک گروہ، جو سناسیوں کے نام سے مشہور تھا، ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھوم رہا تھا، شیخ پیر محمد سے بھی ان کی گفت گو ہوئی۔ شیخ نے ان سے کہا: "تم کس کی عبادت کرتے ہو؟" انھوں نے جواب دیا۔ "ہم بتوں کی پوجا کرتے اور ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔" یہ سن کر شیخ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور اس کی اچھائیاں بیان کیں، جس سے متاثر ہو کر وہ لوگ مسلمان ہو گئے۔

بہر حال شیخ پیر محمد سلونی نے عمر بھر تلقین و ارشاد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا اور سید علاء الدین سندھیلوی اور سید بدر الدین بریلوی ایسے بہت سے مشائخ نے ان سے استفادہ کیا۔

بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالم گیر کو ان کی نیکی اور صالحیت کا علم ہوا، تو اس نے دو گاؤں بطور جاگیر عطا کیے جو بطور وراثت ان کی اولاد و اعقاب میں منتقل ہوتے رہے۔

اس رفیع المرتبت عالمِ دین نے ۲۲ محرم ۱۰۹۹ھ کو سلون میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔[۱]

۵۹۔ شیخ پیر محمد لکھنوی

شیخ پیر محمد بن اولیا جون پوری، ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، جس کا نام اٹاواں تھا اور اعمالِ منڈیاہوں میں جون پور کے قریب ایک پُر رونق اور بڑا گاؤں تھا۔ شیخ پیر محمد کی تاریخ ولادت ۲۶ رمضان ۱۰۲۷ھ ہے۔ شیخ کم سنی

---

[۱] خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۴۸۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۹۵، ۹۶ — فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۸۱

ہی میں باپ کے سایہ سے محروم ہو گئے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد چچا کی گود میں تربیت پائی۔ بچپن کی حدود سے باہر قدم رکھا تو حصولِ علم کے لیے مانک پور کا قصد کیا اور وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ وہیں شیخ عبداللہ سیاح دکنی سے ملاقات ہوئی، ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ پھر لکھنو چلے گئے اور کتب درسیہ قاضی عبدالقادر عمری لکھنوی سے پڑھیں۔ بعد ازاں شیخ عبداللہ سیاح دکنی سے ملاقات ہوئی، انھوں نے تاکید کی اور حکم دیا کہ طریقت وسلوک کی راہوں پر گام زن ہونے سے پہلے تکمیل علم اور فنی کتابوں پر عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ شیخ پیر محمد مزید تعلیم کے لیے دہلی گئے اور علامہ حیدر کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر باقاعدہ تمام مروّجہ کتبِ درسیہ کی تکمیل کی علاوہ ازیں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، قنوج اور اجمیر کے اساتذہ کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ دہلی میں شیخ عبداللہ سیّاح سے پھر ملاقات ہوئی تو انھوں نے تمام طرقِ تصوّف اور سلاسلِ طریقت کی اجازت مرحمت فرمائی۔

شیخ پیر محمد لکھنوی وہ عالمِ دین ہیں جو فضل وکمال اور صلاح وتقویٰ میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان سے خلقِ کثیر نے استفادہ کیا، اپنے دَور میں درس و تدریس کے ماہر اور سر برآوردہ بزرگ تھے۔

شیخ پیر محمد لکھنوی، صاحبِ قلم بھی تھے اور تصنیف وتالیف میں ایک خاص مقام کے حامل تھے۔ ان کی تصنیفاتِ جلیلہ میں صدرالدین شیرازی کی شرح الهدایہ پر سراج الحکمۃ کے نام سے حاشیہ اور ہدایۃ الفقہ پر حواشی شامل ہیں۔ نیز فقہی مسائل سے متعلق فتاویٰ بھی ان کے سلسلۂ تصانیف کی ایک کڑی ہیں۔ پھر سلوک وتصوّف اور احکامِ طریقت کے بارے میں بھی ان کی کتابوں کا پتا چلتا ہے۔

دیارِ ہند کے اس عالم وفقیہ نے ۱۴ جمادی الاخریٰ ۱۰۸۵ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی اور دریائے گومتی کے کنارے دفن کیے گئے۔ بعض مورخین نے ان کی تاریخ

وفات قرآن مجید کے الفاظ لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون سے نکالی ہے[۲]

۶۰۔ شیخ پیر محمد جلبندی

شیخ پیر محمد جبیندی، مشرقی پنجاب کی ایک سابق ریاست جبیند کے باشندے تھے۔ عالم و فقیہ اور متدین بزرگ تھے۔ دیوبند کے ایک صاحبِ علم بزرگ کے شاگرد تھے۔ عرصہ تک ان کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل کیا تھا اور علم و معرفت فراوانی سے بہرہ اندوز تھے۔ درس وتدریس ان کا اصل مشغلہ تھا۔ سلطان اورنگ زیب عالمگیر ان کی بہت تکریم کرتا تھا اور ان کے علم وفضل پر اس کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ تصحیح و تحقیق کی غرض سے اپنے ہاتھ سے کتابیں لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجتا تھا[۳]

۶۱۔ شیخ تاج الدین گجراتی

شیخ تاج الدین کا نسب نامہ یہ ہے: تاج الدین بن اسماعیل بن محمود بن ابراہیم بن اسماعیل بن یعقوب بن شہاب الدین قادری بہاری ثم پٹنی گجراتی، قاضی ابوصالح نصر بن عبدالرزاق بن شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد سے تھے۔ اپنے والد شیخ اسماعیل کی

۲؎ مخزنِ برکت (سوانح حیاتِ شیخ پیر محمد لکھنوی) ــــ خزینۃ الاصفیاء ج ۱، ص ۴۸۲، ۴۸۳ ــــ تذکرہ علمائے ہند ص ۳۴، ۳۵ ــــ مرآۃ العالم ورق ۳۵۹ ب ــــ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۹۶، ۹۷ ــــ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۷۲ تا ۷۵۔ احوال و آثار عبداللہ خویشگی ص ۳۹ تا ۴۱۔

۳؎ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۹۷، ۹۸ ــــ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۸۶۔

سے اخذِ طریقت کیا اور گجرات کو روانہ ہوئے، وہاں مستقل طور سے پٹن شہر میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ لہٰذا پٹنی گجراتی کہلائے۔ بہت بڑے عالم اور محدث تھے۔ حدیث اور فقہ میں عبورِ کامل رکھتے تھے۔ نہایت نیک اور متقی تھے۔ کتبِ حدیث پر عبور کا یہ عالم تھا کہ صحاح ستہ کے حافظ تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے ـــ جمال، احمد، اسحاق اور ابراہیم ـــ سب سے چھوٹے ابراہیم پٹنی تھے۔ وہی علم و فضل کے اعتبار باپ کے قائم مقام ہوئے۔

شیخ تاج الدین گجراتی پٹنی نے ۱۱ جمادی الاولیٰ ۷۰۰ھ کو پٹن میں وفات پائی۔[1]

۶۲- شیخ تاج الدین دہلوی

شیخ تاج الدین بن زکریا بن عیسیٰ دہلوی حنفی المسلک تھے اور صوفی کے عرف سے معروف تھے۔ منطق، فلسفہ اور تصوّف کے فاضل و ماہر تھے۔ اپنے والد شیخ زکریا اور شیخ عبدالملک بن عبدالغفور پانی پتی کے شاگرد تھے۔ عرصہ تک شیخ عبدالملک کی خدمت میں رہے، جن کا لقب امان اللہ تھا، یہاں تک کہ علوم و معارف سے پوری طرح بہرہ مند ہو گئے۔ بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر کے دربار میں آئے تو اس نے ان کو اپنے خاص مشیروں اور ندیموں میں شامل کر لیا۔

منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ اکبر کے دل میں الحاد و زندقہ کی تخم ریزی شیخ تاج الدین نے بھی کی۔ یہ تاج العارفین کے لقب سے معروف تھے۔ توحید اور تصوّف کے سلسلے میں ابن العربی سے بہت متاثر تھے۔ ابن العربی کی تصانیف سے زیادہ تر ایسی باتیں بیان کرتے، جن سے آزاد خیالی کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ قرآن کی آیات اور احادیث نبوی کی ایسی ایسی تاویلات کیں کہ بادشاہ حیران رہ گیا۔ بادشاہ کے حضور انھوں نے سجدہ ریز ہونے کی تجویز پیش کی۔

---

[1] اذکار ابرار ص ۲۴۴ ـــ مرآت احمدی ص ـــ نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۹۸۔

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ تاج الدین رات رات بھر اہل تصوّف کے شطحیات اور مزعومات بادشاہ کے سامنے بیان کرتا رہتا۔ وہ شرعی پابندیوں کا قائل نہیں تھا اور گمراہ صوفیا کی طرح وحدت الوجود کا پکا حامی تھا۔ اس کی باتوں کا نتیجہ بجز الحاد اور اباحت کے کچھ نہ تھا۔ اس نے وحدت الوجود کے غیر اسلامی نظریے اور ابن العربی کی فصوص الحکم کے اس طرح کے دیگر مسائل اچھی طرح بادشاہ کے ذہن نشین کر دیے۔ مثلاً "ترجیح رجا علی الخوف" اور "ایمانِ فرعون"۔ اکبر کے ذہنی فتور اور احکامِ شریعت سے اس کی بے زاری میں تصوّف کے ان نظریات کو بہت دخل ہے —— تاج الدین کی باتوں کے نتیجے میں اکبر کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ کافر دوزخ کی آگ میں ڈالے تو ضرور جائیں گے مگر یہ عذاب ان کے لیے دائمی نہیں عارضی ہوگا۔ شیخ تاج الدین نے یہ مسئلہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کی تاویلیں کر کے اچھی طرح اس کے ذہن میں بٹھا دیا تھا۔ اور جب اس نے بادشاہ کو تصوّف کے اس چکر میں بُری طرح ڈال دیا تو اپنی تعلیم و تلقین کا آخری اور اہم نکتہ جو سب سے زیادہ خطرناک اور ضرر رساں تھا، بیان کیا، اور وہ تھا "انسان کامل" کا تصوّر۔!

شیخ تاج الدین دہلوی نے اکبر کے سامنے "انسان کامل" کا ایک تصوّر پیش کیا، اور پھر اس انسانِ کامل کو خلیفۂ وقت سے تعبیر کر کے خود اکبر کو اس کا مصداق قرار دیا۔ انسان کامل کے بعد عینِ واجب (ذاتِ خداوندی) کا درجہ باقی تھا۔ اب شیخ کی کمندِ تحقیق، انسان کامل کی منزل کو عبور کر کے عینِ واجب تک جا پہنچی۔ حوالی موالی نے بھی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر باتیں کیں اور خرافات و اختراعات کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا چنانچہ بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا اور اس کا نام "زمین بوس" رکھا گیا۔ بادشاہ کے ادب و احترام کو اتنا بڑھایا گیا کہ اسے فرض عین اور چہرہ شاہی کو "کعبہ مرادات" و "قبلہ حاجات" قرار دیا گیا کسی نے زبان ہلائی تو جواب میں ہندوستان کے بعض مشائخ کے حضور، ان کے بعض مریدوں کے طرزِ عمل کو پیش کر کے، اس کا منہ بند

کر دیا گیا۔

شیخ تاج الدین دہلوی کا نام ان اولین لوگوں میں شامل ہے، جنھوں نے اکبر کو الحاد کی راہ پر لگایا اور اسے اسلام سے برگشتہ کرکے بے دینی اور زندیقیت کی خطرناک وادی میں ڈالنے کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے تاج الدین کی طرف سے نظرِ کرم پھیر لی اور توجہ ہٹا لی تھی اور اس کے نزدیک یہ مطرود و مقہور قرار پا گئے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے شرح اللوائح اور نزہۃ الارواح کی شرح شامل ہیں۔[۵۲]

۶۳۔ شیخ تاج الدین صدیقی جھونسوی

شیخ تاج الدین بن منہاج الدین صدیقی جھونسوی الہ آبادی، عالم و فاضل، علم نحو کے ماہر اور فقیہ تھے۔ ان کے اسلاف درحقیقت دہلی کے رہنے والے تھے، وہاں سے شیخ پورہ منتقل ہو گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شیخ تاج الدین نے بعض ابتدائی کتابیں اپنے عم محترم شیخ نصیر الدین جھونسوی سے پڑھیں، پھر جون پور گئے۔ وہاں شیخ نور اللہ بن طٰہٰ انصاری جون پوری کا سلسلۂ درس جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے، ان سے منار الاصول تک کتب درسیہ پڑھیں۔ حصولِ طب کی طرف رجحان ہوا تو حاجی محمد مداری سے طب کی کتابیں پڑھیں اور اس میں اس درجہ مہارت پیدا کی کہ اس موضوع میں صاحبِ تصنیف ہوئے۔ علمِ حیوانات و نباتات سے متعلق کچھ رسائل لکھے اور اس ضمن میں ایک بہترین و مفید کتاب تاج المجربات کے نام سے تالیف کی، جو نو اجزا پر مشتمل ہے۔ وہ اونچے درجے کے معالج اور طبیب تھے۔

منقول ہے کہ اگرچہ وہ کتبِ درسیہ کی تکمیل نہ کر پائے، لیکن اللہ نے ان کو

---

۵۲ منتخب التواریخ ص ۳۱۹ — تذکرہ علمائے ہند ص ۳۵، ۲۶۳ — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۹۸، ۹۹ — رودِ کوثر ص ۹۲۔

ہر علم اور ہر مروجہ فن میں ملکہ راسخہ عطا فرمایا تھا۔ نہایت ذہین، تیز فکر، نقاد اور صاحب مطالعہ تھے۔ مسلسل مطالعہ سے مشکل علوم ان کے لیے آسان ہو گئے تھے اور پیچیدہ مسائل کو سلجھانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر علمی میدان میں ان کی تگ و تاز کے نقوش نمایاں نظر آتے ہیں اور فقہ، سلوک، تصوف، طب اور نحو میں ان کی تصنیفات کا پتا چلتا ہے۔ علم نحو میں تو انھیں بالخصوص درک حاصل تھا اور اس موضوع سے متعلق وہ مرجع اہل علم تھے۔ شیخ تاج الدین کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ مختلف سلاسلِ سلوک سے تعلق رکھتے تھے۔ سلسلۂ سہروردیہ اور سلسلۂ چشتیہ کا حصول اس دور کے مشہور مشائخ سے کیا تھا، اشغال و اذکار سے بہرہ ور تھے اور ارشاد و تلقین کی مسند پر فائز تھے۔ مگر سماع وغیرہ سے گریز کرتے تھے۔ اور ان چیزوں کو سلوک و تصوف کے خلاف قرار دیتے تھے۔

گیارھویں صدی ہجری کے اس ہندی عالمِ دین نے جمعرات کے روز ۱۵ / ذی الحجہ ۱۰۳۰ھ کو وفات پائی۔[۳]

ث

۶۴۔ قاضی ثناء الدین مچھلی شہری

قاضی ثناء الدین جعفری مچھلی شہری، شیخ عصر اور فقیہ وقت تھے۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ مچھلی شہر میں ان کی وفات کے بعد کثیر تعداد میں ان کے اعقاب و اخلاف نمایاں حیثیت سے ابھرے اور اس خاندان میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔[۱]

۶۵۔ قاضی ثناء اللہ جون پوری

قاضی ثناء اللہ جون پوری کا سلسلۂ نسب یہ ہے: ثناء اللہ بن ہدایت اللہ

---

۳ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۰۲، ۱۰۳ بحوالہ گنج ارشدی ۱ ایضاً ص ۱۰۴

بن محمد منعم بن ابوالحسن بن محمد بن قاضی خواجگی عمری جون پوری۔ جون پور میں پیدا ہوئے، اور وہیں پرورش پائی۔ شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ گیارھویں صدی ہجری کے فقہائے ہند میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ شہر جون پور کے منصب قضا پر متعین تھے۔ ۷ شوال ۱۰۷۳ھ کو جون پور میں وفات پائی۔[۵۲]

ج

۶۶۔ مولانا جان محمد لاہوری

مولانا جان محمد صوفی لاہوری، شیخ اسماعیل مدرس لاہوری کے شاگرد تھے۔ حنفی المسلک تھے۔ شیخ صالح اور جید عالم تھے۔ فقہ، اصول اور علوم عربیہ میں ماہر تھے۔ مسجد قصاب میں ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا، جو اس زمانے میں شہر سے باہر واقع تھی۔ تدین، پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔ کسی کے احتیاج سے سخت گریزاں تھے۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۰۸۲ھ کو لاہور میں وفات پائی اور اسی شہر میں دفن ہوئے۔[۱]

۶۷۔ شیخ جعفر بن جلال الدین گجراتی

شیخ جعفر بن جلال الدین بن محمد حسینی بخاری احمد آبادی گجراتی کو بدر عالم کہا جاتا ہے۔ ۱۲ شعبان ۱۰۲۳ھ کو پیدا ہوئے اور علم و طریقت کی گود میں پرورش پائی۔ اپنے والد شیخ جلال الدین بخاری گجراتی (متوفی ۱۰۵۷ھ) اور دیگر علمائے عصر سے اخذ علم کیا۔

---

[۵۲] تجلی نور ج ۲ ص ۱۰۴۔ تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۷۵۲ ـــ "تاریخ شیراز ہند جون پور" میں قاضی ثناء اللہ جون پوری کی تاریخ وفات ۷ شوال ہی مرقوم ہے، مگر سن وفات ۱۰۷۳ھ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے ان کا سن وفات ۱۰۷۳ھ ــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۰۴۔

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۰۵۔

بلاشبہ ان کے والد (شیخ جلال الدین) بھی جیّد عالم دین تھے، لیکن شیخ جعفر، تفسیر، حدیث، تصوّف اور دیگر علوم و فنون میں والد سے زیادہ عالم اور صاحبِ فضل تھے۔ اپنے دادا (شیخ محمد) کی وفات کے بعد والد کی زندگی ہی میں مسندِ ارشاد و تدریس پر متمکن ہو گئے تھے۔ شیخ جلال الدین گجراتی، شاہ جہان کے عہد میں منصبِ صدارت پر فائز تھے۔ ان کی وفات کے بعد بادشاہ نے اس منصب کے لیے ان کے اس بیٹے (شیخ جعفر) سے درخواست کی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔

کتابت میں نہایت تیز تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ پورے قرآن مجید کی کتابت فلکی گھڑی کے حساب سے چونتیس ساعت میں کر لیتے تھے۔ خطِ نستعلیق اور نسخ کے ماہر تھے۔

ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب روضات ہے جو سادات کے حالات پر مشتمل ہے اور چوبیس جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں تفسیر اور حدیث کے موضوع سے متعلق بھی رسائل موجود ہیں۔ ایک دیوان بھی ہے جو ان کے کلام کو محیط ہے۔

شیخ جعفر گجراتی علوم و معارف، احوال و سوانح، مشائخ و اسلاف کی اصطلاحات اور فنونِ متعارفہ میں اپنے والد سے بہت آگے تھے۔ درس و تدریس اور افادۂ طلبا میں ان کی مساعی ہمیشہ جاری رہیں۔ بہت اچھے شاعر بھی تھے اور صفا تخلص کرتے تھے۔ ان کے چند اشعار یہ ہیں:

رازِ ما در زمانہ افتاد است　　　بزم ہا را فسانہ افتاد است
می کند یار آنچہ می خواہد　　　دورِ گردون بہانہ افتاد است
اے صفا میانِ ماہ رخاں　　　شاہدِ ما یگانہ افتاد است

جز من کہ گرفتہ ام دو زلفش　　　کس در شبِ تار مار نہ گرفت

بادشاہ کے حضور آئے، گوناگوں شاہی عنایات، نقد انعام، خلعت اور ہاتھی سے سرفراز ہوئے۔

یہ ہندی عالم دین ۹ ذی الحجہ ۱۰۸۵ھ کو اس عالم فانی سے، راہئ ملکِ بقا ہوئے۔ احمد آباد میں مدفون ہیں [۲]

۶۸۔ شیخ جعفر بن علی گجراتی

شیخ جعفر کا سلسلہ نسب یہ ہے: جعفر بن علی بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ عیدروس شافعی حضرمی ثم ہندی گجراتی ــــ شیخ جعفر بن علی فقہی مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے اور جعفر صادق کے نام سے مشہور تھے۔ ۹۹۷ھ کو شہر تریم میں پیدا ہوئے۔ ان کے تمام آباؤ اجداد ذی علم بزرگ تھے، لہٰذا کہنا چاہیے کہ شیخ جعفر نے علم و فضل کی گود اور نیکی اور تقویٰ کے ماحول میں پرورش پائی۔ عرصہ تک والدِ گرامی شیخ علی کی صحبت و ملازمت میں رہے اور ان سے مختلف فنون پر مشتمل کتابوں کی تکمیل کی۔ ان سے تجوید کے ساتھ قرآنِ مجید بھی حفظ کیا اور تبلیغ و ارشاد کے میدان میں اترنے کے لیے جن منزلوں سے گزرنا ضروری ہے وہ بھی ان ہی کی خدمت میں طے کیں ــ بعد ازاں شیخ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن شہاب الدین، شیخ زین الدین بن حسین بافضل، ابوبکر شلی باعلوی اور اپنے چچا زاد بھائی شیخ عبدالرحمن سقاف بن محمد عیدروس سے کسبِ علم کیا اور تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، علوم عربیہ، حساب و ریاضی، فرائض و میراث اور ہیئت و فلکیات میں مہارت حاصل کی۔ بڑی شان دار زندگی بسر کرتے اور ٹھاٹھ سے رہتے تھے، مرفہ الحال اور خوش پوش عالم دین تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی فہم و فراست عطا کی تھی اور خوب صورتی کی نعمت سے نوازا تھا۔ بلند اخلاق اور عمدہ کردار کے حامل تھے۔ عوام و خواص میں مقبول اور علم و فضل میں مشہور تھے۔ نظم و نثر میں کامل اور انشا پردازی میں فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ تھے۔ حج کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے اور حرمین شریفین

---

[۲] مرآتِ احمدی ص ــــ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۶۰، ۶۱ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۰۶ ــــ تذکرہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۴۔

کے علمائے کرام سے اخذِ علم کیا۔ واپسی میں اپنے آبائی شہر تریم کا قصد کیا تو شہرت کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ اثنائے سفر میں جس شہر اور قریے سے گزر ہوتا، لوگ انتہائی عزت و تکریم سے پیش آتے۔ تریم کے قریب پہنچے تو انسانوں کا ایک ہجوم خیر مقدم اور استقبال کے لیے اُمڈ آیا تھا۔

عرصہ تک تریم میں قیام پذیر رہے، پھر دل میں علومِ عقلیہ اور علمِ تصوف کے حصول کا جذبہ موج زن ہوا، تو ہندوستان کے لیے رختِ سفر باندھا، اس لیے کہ ہندی علما جہاں علوم نقلیہ یعنی تفسیر و حدیث اور فقہ کے سلسلے میں عالمِ اسلام کے حلقہ اہل علم میں شہرت رکھتے تھے وہاں علوم عقلیہ اور تصوف وغیرہ میں بھی درجۂ کمال پر فائز تھے۔ دیارِ ہند میں وارد ہوئے تو سب سے پہلے سورت کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ وہاں ان کے چچا شریف محمد سکونت پذیر تھے۔ اور اس نواح میں ان کے علم و فضل کا شہرہ اور درس و تدریس کا غلغلہ بلند تھا۔ ان کے چشمۂ علم سے خوب سیراب ہوئے۔ پھر سرزمینِ دکن کا قصد کیا۔ وہاں کے حکمران عنبر سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کے علم و فضل کی فراوانی سے بے حد متاثر ہوا اور اپنے ندیموں اور مشیروں میں شامل کر لیا۔ دربارِ دکن سے بہت سے علما و فضلا منسلک تھے۔ ان میں علمی بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بعض مسائل میں بادشاہ کے سامنے شیخ جعفر سے بھی ان علما کی بحث ہوئی تو شیخ کا پلہ بھاری رہا اور سب نے ان کی فراست اور علمی فوقیت کو تسلیم کیا۔ بادشاہ نے شیخ کو دکن کی مسندِ تدریس پر متمکن کر دیا۔ لیکن ہندوستان کے اصحاب علم میں اس زمانے میں فارسی کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور شیخ اس سے ناآشنا تھے، چنانچہ شیخ نے اس کمی کو محسوس کیا اور فارسی سیکھنے کی طرف عنانِ توجہ مرتکز فرمائی، اور تھوڑی ہی مدت میں اس میں مہارتِ تامہ حاصل کر لی۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ شیخ جعفر نے فارسی میں بھی واقفیت بہم پہنچالی ہے تو بعض حضرات نے ان سے فرمائش کی کہ اپنے جدِ امجد شیخ عبداللہ کی کتاب "العقد النبوی" کا فارسی میں ترجمہ کر دیں۔ شیخ نے ان کی فرمائش قبول کی اور نہایت بہترین انداز سے کتاب کو

فارسی کے قالب میں ڈھال دیا۔

علاقہ دکن میں شیخ جعفر کو اپنے علم و فضل کی وجہ سے بڑے ہی احترام و اکرام کا مستحق سمجھا جاتا اور وہاں کے حکمران عنبر کی وفات تک ان کو بے حد لائق تعظیم گردانا جاتا تھا۔ عنبر کے بعد اس کے بیٹے فتح خاں نے زمام اقتدار ہاتھ میں لی تو اس نے شیخ کے اجلال و توقیر میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک دکن کی یہ حکومت قائم رہی اور اس سرزمین پر ان کا پرچم اقتدار لہراتا رہا، شیخ کے عظمت و وقار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، لیکن جب یہ حکومت ختم ہو گئی اور اس کے ارباب بست و کشاد منتشر ہو گئے تو شیخ اپنے عم محترم شیخ محمد عیدروس کے پاس سورت منتقل ہو گئے۔ سورت میں ان کے علم و فضل کی شہرت پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور اہل علم ان سے بہت متاثر تھے۔ وہاں گئے تو ہر حلقے میں ان کی پذیرائی ہوئی اور مال و دولت سے بھی سرفراز کیے گئے۔ سورت میں انھوں نے مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی تھی۔

شیخ کو تصوف و طریقت سے بھی لگاؤ تھا۔ کہتے ہیں مختلف فنون میں ان کی تصانیف بھی تھیں اور ایک دیوان بھی تھا۔ جو ان کے مجموعۂ اشعار پر مشتمل تھا۔

ان کی ملاقات مغل حکمران شاہ جہان سے ہوئی تو وہ ان کی گوناگوں صلاحیتوں اور علمی قابلیت سے بہت متاثر ہوا۔ سرزمین گجرات کے علاقہ بھڑوچ میں اس نے ان کو کئی گاؤں بھی عطا کیے۔ شیخ جعفر نے شاہ جہان کے بیٹے دارا شکوہ کے کہنے پر اس کی کتاب سفینۃ الاولیا کا، جو فارسی زبان میں ہے، عربی میں ترجمہ کیا۔

اس شافعی المسلک عالم و فقیہ نے ۱۰۶۴ھ میں وفات پائی۔[۳]

۶۹- شیخ جعفر حسینی پٹنوی

شیخ جعفر پٹنوی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: جعفر بن ابوالحسن بن باقی بن مبارز

۳؎ المشرع الروی از شلی ص — حدیقۃ احمدیہ ص — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۰۷، ۱۰۸

بن ابراہیم حسینی پٹنوی - اصلاً پٹنہ کے رہنے والے تھے - فقہ و اصول اور علوم عربیہ میں بدِ طولیٰ رکھتے تھے - سلوک و طریقت سے بھی لگاؤ تھا - اس سلسلے میں رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید بن مصطفیٰ عثمانی جون پوری سے استفاضہ کیا - طویل عرصہ تک ان کی خدمت رہے - یہاں تک کہ کہولت کی منزل سے بھی آگے نکل گئے - اس عمر میں شیخ محمد رشید ممدوح نے انھیں نکاح کرنے کا حکم دیا اور اپنے شہر (پٹنہ) لوٹ جانے کو کہا - نیز فرمایا کہ عبادات و معاملات میں اتباعِ سنت کا خاص طور سے خیال رکھا جائے - چنانچہ واپس پٹنہ چلے گئے اور عمر بھر درس و افادہ میں مصروف رہے -

اس عالم دین اور نامور فقیہ نے جمعرات ۳ رمضان المبارک ۱۰۷۵ھ کو وفات پائی اور پٹنہ کے قریب، شہر لعیت آباد میں دفن کیے گئے [۴۲]

۷۰- شیخ جعفر بن عزیز اللہ جون پوری

شیخ جعفر بن عزیز اللہ جون پوری کا لقب نور الدین تھا - سہ شنبہ کے روز ۸ رجب ۱۰۴۲ھ کو جون پور میں پیدا ہوئے - اکثر کتب درسیہ شیخ محمد رشید جون پوری (صاحب رشیدیہ) سے پڑھیں - دیگر علما و شیوخ سے بھی اخذ علم کیا - تصوف و سلوک میں بھی مہارت پیدا کی، اس ضمن میں اپنے عم محترم شیخ نور محمد مداری سے فیض حاصل کیا اور سلسلۂ مداریہ سے منسلک ہو گئے - درس و تدریس کی مسند بھی آراستہ کی اور ان کے چشمۂ علم سے شیخ محمد افضل عباسی الٰہ آبادی، شیخ محمد کاظم عباسی سید پوری، شیخ محمد ماہ دیوگامی اور علما و فضلا کی بہت بڑی جماعت نے اپنی علمی تشنگی بجھائی -

شیخ جعفر جون پوری، زاہد و عابد، عفیف و قانع، حلیم و متواضع اور عالم باعمل تھے -

---

[۴۲] تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۲۰۶۵۱-۶۵ — اس کتاب میں ان کی تاریخ وفات ۳ رمضان ۱۰۵۱ھ مرقوم ہے، جو صحیح نہیں - ان کی تاریخ وفات ۳ رمضان ۱۰۷۵ھ ہے — نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۱۰۹، ۱۱۰ بحوالہ گنج ارشادی -

کھانے پینے اور لباس میں کسی قسم کے تکلف اور تصنع کے عادی نہ تھے۔ دنیا اور دنیا داروں سے انھیں کوئی رغبت اور لگاؤ نہ تھا۔ اربابِ اقتدار اور اصحابِ مال و دولت کے دروازے پر کبھی دستک نہیں دی۔ شب و روز درس و تدریس اور وظائف و اوراد میں مصروف رہتے۔ پورے بتیس ۳۲ سال ہنگامہ تدریس بپا کیے رکھا۔ تصنیف و تالیف کے ذوق سے بھی بہرہ ور تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالباقی صدیقی جون پوری (متوفی قریباً ۱۰۸۲ھ) نے فنِ مناظرہ کی کتاب شریفیہ پر دو شرحیں سپردِ قلم کیں۔ ایک آداب الباقیہ شرح الشریفیہ اور دوسری ابحاث الباقیہ شرح الشریفیہ۔ ابحاث الباقیہ انھوں نے اپنے استاذ شیخ محمود جون پوری کے حکم سے سپردِ قلم کی تھی۔ اور شیخ جعفر کے استاذ شیخ محمد رشید جون پوری (متوفی ۱۰۸۳ھ) کی کتاب رشیدیہ کے جواب میں لکھی تھی۔ رشیدیہ فنِ مناظرہ کی مشہور کتاب ہے۔ شیخ جعفر نور الدین جون پوری نے شیخ عبدالباقی جون پوری کی ابحاث الباقیہ کے جواب میں نور الانوار کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے استاذ کی تصنیف رشیدیہ کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان کے علم و فضل کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

شیخ جعفر جون پوری ملقب بہ نور الدین نے سہ شنبہ ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۰۹۳ھ کو نمازِ ظہر کے بعد جون پور میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ بعض مورخین نے ان کی تاریخِ وفات "بہارِ علم گزشت" سے نکالی ہے اور بعض نے "صد حیف ملاذِ علم رفت" سے۔[۵]

۱۷۔ شیخ جلال الدین گجراتی

شیخ جلال الدین بن محمد بن جلال الدین حسینی بخاری گجراتی، مقصود عالم کے نام سے

---

[۵] نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۰۹، ۱۱۰۔ تاریخ شیراز ہند جون پور (ص ۲۴۷، ۲۲۵) میں بھی حضرت "نور الدین مداری" کے عنوان کے تحت (خشگرف دائم ص ۱۸۱ کے حوالے سے) شیخ جعفر کا ذکر کیا گیا ہے۔ تاریخ ہائے ولادت و وفات صحیح درج نہیں کی گئیں۔

معروف تھے۔ ۱۵ جمادی الاخری ۱۰۰۳ھ کو علاقہ گجرات میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور مولانا حسین بستانی سے حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ بعد ازاں شیخ عبدالعزیز کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، جو ان کے والد کے شاگردوں میں سے تھے۔ پھر اپنے والدِ گرامی شیخ محمد بن جلال الدین گجراتی سے طریقت و سلوک کی تعلیم حاصل کی اور طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہے۔ جب علوم ظاہری اور تصوف و طریقت کی منزلیں طے کر چکے تو شاہ جہان بادشاہ نے انھیں اکبر آباد (آگرہ) میں بلایا، اور ۷ شعبان ۱۰۵۲ھ کو صدارت کا عہدہ عطا کیا۔ شاہ جہان ایک دین پرور بادشاہ تھا اور ان کے فضل و کرم کا بہت معترف تھا۔ وہ عام طور پر کہا کرتا تھا کہ اس دور میں شیخ جلال الدین گجراتی کا وجود انتہائی غنیمت ہے۔ اس نے ان کو آٹھ ہزاری منصب سے سرفراز کیا جو اس دور کا بہت بڑا سرکاری اعزاز تھا۔

شیخ جلال الدین گجراتی نے ۲۰ ربیع الثانی ۱۰۵۷ھ کو لاہور میں وفات پائی۔ اور ان کی میت احمد آباد لے جائی گئی، وہاں اپنے والد شیخ محمد جلال الدین حسینی گجراتی کے قریب دفن کیے گئے۔[۶]

۷۲۔ علامہ جمال اولیا کوروی

علامہ جمال اولیا بن مخدوم جہانیاں بن بہاء الدین بن سالار عالم کوروی ۹۰۲ھ کو شہر کورہ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ علم فقہ کی تعلیم اپنے والد گرامی شیخ مخدوم سے حاصل کی۔ بعد ازاں اودھ گئے، وہاں قاضی ضیاء الدین عثمانی نیوتی سے اخذِ علم کیا، اور مدت تک ان کی صحبت و رفاقت میں رہے۔ تصوف کے مختلف سلسلوں میں ان سے مستفیض ہوئے۔ پھر اپنے شہر کورہ آکر درس و تدریس میں

۶۔ مرآۃ احمدی ص — خزینۃ الاصفیاء ج ص — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۱۱، ۱۱۲ — تذکرۂ علمائے ہند، ص ۲۱۶۔

مشغول ہوگئے۔ شیخِ وقت اور عالمِ کبیر تھے۔ صوفی المشرب اور حنفی المسلک تھے۔ فقہ، اصولِ فقہ اور علومِ عربیہ کے ماہر تھے۔ بہت سے علما و طلبا نے ان سے کسبِ علم کیا۔ سید محمد بن ابو سعید کالپوی (متوفی ۲۶ شعبان ۱۰۷۱ھ) بھی ان کے تلامذہ میں سے ہیں، سید محمد کالپوی نے ان سے متعدد کتبِ درسیہ پڑھیں، جن میں مطول اور بیضاوی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مشہور مدرس شیخ لطف اللہ کوروی صاحب رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری، شیخ یٰسین بنارسی اور خلقِ کثیر نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مدت تک ہنگامۂ تدریس بھی بپا کیے رکھا اور غلغلۂ تصوف و طریقت بھی۔!

شیخ جمال اولیا ان حضرات میں سے ہیں جنھوں نے وسیع حلقۂ درس قائم رکھنے کے باوجود زہد و عبادت، اور خدمتِ خلق کو اپنا معمول ٹھہرایا۔ برصغیر پاک و ہند کے اس نامور عالم و فقیہ نے چھہتر سال عمر پاکر ۲۸ یا ۲۹ رمضان ۱۰۴۷ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ [۷۵]

۷۳۔ شیخ جمال الدین کشمیری

شیخ جمال الدین بن موسیٰ شہید کشمیری، سرزمین کشمیر میں پیدا ہوئے اور شیخ فتح اللہ حقانی کشمیری کی صحبت اختیار کی۔ سالہا سال تک ان کی خدمت میں رہنے کا شرف حاصل کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی فضلِ خاص سے ان کا شمار علمائے ربانیین اور فضلائے عصر میں ہونے لگا۔ پختہ ذہن اور راسخ فکر علما میں سے تھے اور اللہ نے ان پر علم و معرفت کے دروازے وا کر دیے تھے۔ فراوانی علم کے باوجود نہایت نیک، متقی، منکسر المزاج اور متواضع تھے۔ لباس و طعام میں کسی قسم کے تکلف کے عادی نہ تھے۔ بوریا نشین اور سادہ مزاج عالمِ دین تھے۔ صدرِ مجلس بننے اور آگے بڑھنے سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ پوری زندگی درس و تدریس، رشد و ہدایت، لوگوں کو اسلام کی

---

[۷۵] نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۱۲، ۱۱۳

سیدھی راہ پر لگانے اور شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین میں صرف کر دی۔ مشہور عالم و مدرس شیخ کمال الدین کے بھائی تھے اور یہ دونوں بھائی علم و فضل کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ ان کے اوصافِ حمیدہ سے متاثر ہو کر شیخ فتح اللہ حقانی کشمیری نے اپنی دونوں بیٹیاں ان دونوں بھائیوں — جمال الدین اور کمال الدین — کے عقد میں دے دی تھیں۔ شیخ جمال الدین کشمیری سے بے شمار علما نے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا۔[۵۵]

سرزمین کشمیر کے گیارھویں صدی ہجری کے اس عالمِ دین کی تاریخ ولادت و تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

۷۴۔ مولانا جمال الدین لاہوری

مولانا جمال الدین لاہوری قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد شیخ اسماعیل بن ابدال شریف حسنی اوچی، شیخ اسحاق بن کاکو لاہوری اور شیخ سعد اللہ کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ عہدِ اکبری کے عالمِ کبیر، علامۂ وقت، شیخ عصر اور اپنے زمانے اور علاقے کے مشہور مدرس تھے۔ لاہور کے محلہ تلا میں فروکش تھے۔ ان کے درس و افادہ کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ تدریس میں اس عہد کا کوئی عالم ان کا حریف اور مدمقابل نہ تھا۔ تمام مروجہ علوم و فنون میں یگانۂ روزگار تھے۔ آدھی عمر نشرِ علوم میں صرف ہوئی۔ لاہور میں اپنے وقت کے جلیل القدر عالم تھے۔ مختلف علاقوں اور شہروں سے تشنگانِ علوم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی علمی تشنگی کا سامان فراہم کرتے تھے۔ خوش گفتار اور بلند اخلاق بزرگ تھے۔ اندازِ گفتگو اور حسنِ بیان میں بے مثال اور ظرافت و ملاحت میں عدیم النظیر تھے۔ عوام و

---

۵۵ تذکرہ علمائے ہند ص ۴۳ — حدائق الحنفیہ ص ۴۲۶ — نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۱۱۴ — تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۱۸، ۱۱۹ — روضۃ الابرار

خواص میں بڑی عزت و تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے فیضی نے سواطع الالہام کے نام سے بے نقط تفسیر لکھی تو ان سے بہت مدد لی، انھوں نے اس تفسیر کی بڑی اصلاح کی اور اس کی عبارتوں کو مربوط بنایا۔ [۹]

۷۵۔ مولانا جمال الدین برہان پوری

مولانا جمال الدین حنفی برہان پوری مشہور شیخ جلیل القدر عالم اور اپنے دور کے محدث تھے۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہے۔ برہان پور میں شیخ ابراہیم شطاری کی مسجد میں ان کا سلسلۂ درس و تدریس جاری تھا۔

شیخ طاہر بن یوسف سندھی (متوفی ۱۰۰۴ھ) برہان پور تشریف لائے تو ان سے حدیث کا درس لیا۔ پوری صحیح بخاری ان ہی سے پڑھی۔ برہان پور میں وفات پائی اور ابراہیم بن عمر سندھی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ [۱۰]

۷۶۔ شیخ جمیل الدین سہارن پوری

شیخ جمیل الدین بن رفیع الدین بن عبدالستار انصاری سہارن پوری، سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ اپنے برادرِ کبیر شیخ بدیع الدین سہارن پوری مرید و تلمیذ مجدد الف ثانی (متوفی ۱۰۴۲ھ) سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں اخذِ طریقت ان ہی سے کیا اور مدت تک ان کی صحبت و ملازمت میں رہے، یہاں تک کہ درجۂ کمال کو پہنچے۔

ان کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے اصحابِ فضل و صلاح ہندی علما میں

۹۔ منتخب التواریخ (اردو ترجمہ) ص ۶۲۰ — مرآۃ العالم ص — تذکرہ علمائے ہند ص ۴۳ — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۱۶ — فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۰۸ — —

۱۰۔ اذکار ابرار ص ۳۹۹ — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۱۶، ۱۱۷

ہوتا تھا۔ ۱۰۵۵ھ میں وفات پائی [۱]

۷۷۔ مُلّا جوہر نانت کشمیری

ملا جوہر کنائی، کشمیر کی نانت برادری سے تعلق رکھتے تھے، سرزمینِ کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ سلطان قطب الدین کشمیری کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حج کی توفیق عطا فرمائی۔ مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد حجاز کے فحول واجلا علمائے کرام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور محشی مشکوٰۃ ملا علی قاری حنفی ہروی مکی اور شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی شافعی مکی سے کتبِ حدیث کا درس لیا اور بطریقِ معنعن سند و اجازۂ حدیث سے سرفراز ہوئے۔ دیارِ حرمین سے معاودت کے بعد انزوا و عابدگی کی زندگی اختیار کر لی اور ہمہ تن اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ اسنرزاقِ حلال کی غرض سے اُون کاتنے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا اور دو شالے تیار کر کے فروخت کرتے تھے، اس ذریعے سے جو آمدنی ہوتی وہی گذر اوقات کا اصل ذریعہ تھی۔ ساتھ ہی علوم دینیہ کے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس عالمِ دین نے کشمیر اور اس کے گرد و نواح میں علومِ اسلامیہ کی بڑی ترویج کی اور ان کے حلقۂ درس سے متعدد علمائے کرام نے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ میں شیخ حیدر بن فیروز چرخی، شیخ محمد ٹوپی گر محشی شرح جامی اور بہت سے حضرات شامل ہیں۔

ملا جوہر نانت، دیارِ کشمیر کے بہت بڑے محدث، نامور فقیہ، متوکل علی اللہ، عابد و زاہد اور مشہور عالم تھے۔ ۱۰۲۶ھ کو کشمیر میں وفات پائی اور مقبرہ شیخ حسین خباز کے مشرقی جانب دفن کیے گئے۔

تذکرہ علمائے ہند فارسی (ص ۴۴) اور اس کے تتبع میں اردو ترجمہ (ص ۱۵۴)

---

[۱] مرآۃ جہاں نما ص ——— نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۱۸

میں، انھیں جوہر ناتھ لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ حدائق الحنفیہ (ص ۴۰۳) میں جوہر نات مرقوم ہے، جو غلط ہے۔

دراصل یہ لفظ "نانت" ہے، جو کشمیر کی ایک برادری ہے۔ چنانچہ تاریخ کشمیر اعظمی میں درج ذیل الفاظ میں ان کے حالات مندرج ہیں:

ملا جوہر کنائی از نجبہائے ایں شہر بود۔ دراصل از قوم نانت است۔ اکثر عمر صرف تحصیل علم نمودہ۔ شاگرد و مدرس مدرسہ سلطان قطب الدین کہ متصل مسجد صراف کدل بر کنار شرقی جوئے مار بود۔ او آخر عمر راہ حرمین محترمین گرفت، بعد ادائے حج اسلام تحصیل سند و اجازت حدیث از فحول و اکابر علما و محدثین مکہ معظمہ کردہ، و خدمت مولانا علی قاری را دریافت بلکہ بصحبت حضرت شیخ ابن حجر مکی ہم رسید، و اجازت بسند معنعن حاصل ساخت۔ چوں بہ کشمیر معاودت فرمود گوشۂ انزوا اختیار کرد و بعبادت و عزلت اشتغال نمود، و بجہت قوت حلال کسب پشم ہیشہ گرفت، و بسیار بہ قناعت می گزرانید، و توکل و انزوا را بدرجۂ اکمل رسانید؛ و درس علوم دینیہ ہم می گفت، در واقعہ وبائے عامہ در سال ہزار و بیست و شش رحلت فرمود، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔ بعض اولاد امجادش بکمالات صوری و معنوی فائز شدند۔ مزار ایشاں طرف شرقی مقبرہ حضرت اخوند ملا حسین خباز بہ کمال بے تکلفی واقعست۔[۱۲]

اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

ملا جوہر کنائی، اس شہر (کشمیر) کے شرفا و نجبا میں سے تھے، دراصل نانت برادری کے فرد تھے۔ عمر کا زیادہ تر حصہ تحصیلِ علم میں گزارا، مدرسۂ سلطان قطب الدین کے، جو کہ مسجد صراف کدل کے متصل، دریائے مار کے شرقی کنارے واقع تھا، شاگرد اور مدرس تھے۔ آخر عمر میں، حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے۔ مناسک حج ادا کرنے کے بعد، مکہ معظمہ کے فحول اور اکابر علما و محدثین سے سند و اجازۂ حدیث حاصل کیا اور ملا علی قاری سے ملے۔ بلکہ شیخ ابن حجر مکی کی خدمت میں بھی حاضری دی اور بہ سند معنعن اجازہ حاصل کیا! واپس

۱۲۔ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

کشمیر تشریف لائے تو گوشہ علیحدگی اختیار کرلیا اور عبادت و عزلت نشینی کو شعار ٹھہرالیا۔ رزقِ حلال کے لیے پشم کاتنے کا پیشہ اختیار کرلیا تھا۔ نہایت قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے گوشہ نشینی اور توکل علی اللہ میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی علوم دینیہ کے درس و تدریس کا سلسلہ بھی باقاعدہ جاری تھا۔ ۱۰۲۶ھ کو رحلت فرمائی، جب کہ پورے علاقے میں عام وبا پھیلی ہوئی تھی، رحمۃ اللہ علیہ۔ ان کی اولاد میں سے بعض حضرات صوری و معنوی اعتبار سے مرتبہ بلند پر فائز ہیں۔ ملا جوہر نانت قبرستان ملا حسین خباز کے مشرقی جانب میں مدفون ہیں۔ ان کی قبر سادگی اور بے تکلفی کا نمونہ ہے۔

سرزمین کشمیر میں جن علمائے عظام نے اسلام کی تبلیغ اور دین کی ترویج کے لیے زندگیاں وقف کردیں۔ ان میں ملا جوہر نانت کا اسم گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے بے شمار لوگوں کو دین کی تعلیم دی اور مدت تک درس و تدریس کے ذریعے قال اللہ و قال الرسول کی دلنواز صدا بلند کرتے رہے[۱۳۱]

۷۸- امیر جوہر احمد نگری

جوہر دکنی احمد نگری، دیار ہند کے مشاہیر اور کبار امرا میں سے تھے۔ شافعی المسلک تھے اور حسن سیرت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ بہت ہی نیچے درجے سے ترقی کرکے امارت کے بلند منصب تک پہنچے تھے۔ قصہ یہ ہے کہ جوہر چھوٹی عمر ہی میں سرزمین ہند میں آگئے تھے۔ ان کو اور ان کے بھائی کو دکن کے حکمران برہان نظام شاہ نے خرید لیا تھا۔ اس نے جوہر میں قابلیت و حشامت کے آثار دیکھے تو قرآن مجید کے ایک معلم کے سپرد کردیا، جس سے انھوں نے قرآن پڑھا اور حفظ کیا۔ بعدازاں شاہ سواری، تیر اندازی اور شمشیر زنی وغیرہ میں مہارت پیدا کی۔ ملک عنبر نے ان کی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر انھیں

۱۳۱ھ تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۰۳، ۱۰۴ — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۱۹ — حدائق الحنفیہ ص ۴۰۳ — تذکرہ علمائے ہند ص ۴۴ — ادبی دنیا کشمیر نمبر ص

اپنی بیٹی کی ملکیت میں دے دیا تھا۔ اب انھوں نے ارتقا و تقدم کی منزلیں طے کرنا شروع کیں اور رفتہ رفتہ دو سو اسپ سواروں کے امیر مقرر ہو گئے۔

یہ وہ شافعی المسلک امیر تھے، جنھوں نے اہلِ علم کی ایک جماعت سے سماع علم کیا۔ بہت سی درسی و دینی کتابیں پڑھیں۔ متعدد مشائخ کی مصاحبت اختیار کی۔ امام شیخ عبداللہ عیدروس سے منسلک رہے اور ان سے خرقہ طریقت و تصوف زیب تن کیا۔ ان کے علم و فضل کی وسعت پذیری کا اندازہ شلی کے اس بیان سے ہو سکتا ہے کہ جب امیر جوہر سفرِ ہند پر روانہ ہوئے، میں ان کے ساتھ تھا، میں نے دیکھا کہ وہ بہت بڑے فاضل ہیں اور علم کے مختلف گوشوں پر انھیں عبور حاصل ہے۔ انھوں نے مجھ سے حدیث، فقہ اور نحو کی کتابیں پڑھیں۔ وہ گلستانِ علم کے ہر گوشے سے آشنا تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ، عبادت میں بھی بہت آگے نکلے ہوئے تھے۔ ہر وقت تلاوتِ قرآن، ذکرِ الٰہی اور وظائف و اوراد میں مصروف رہتے۔ دقیق اور مشکل موضوع پر مشتمل کتابوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ ملوک و سلاطین کی تاریخ اور سیرتِ خلفا پر انھیں دسترس حاصل تھی۔ راسخ العقیدہ، مصلح، خوش مزاج، شجاع با اثر اور عمدہ کردار کے حامل تھے۔ سیاست دان، ذی فہم، رعایا کے مسائل سے آگاہ، جنگ جو اور مجاہد تھے۔ اہلِ کفر کے ساتھ انھوں نے باقاعدہ جنگیں لڑیں۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ بدلی اور وقت میں انقلاب و تغیر کی ایسی لہر چلی کہ وہ مملکت کے معاملات سے دور ہو گئے اور بیجاپور چلے گئے۔ اس مجاہد عالم و فقیہ نے بیجاپور ہی میں ۱۰۵۶ھ کو وفات پائی۔[۱۴۱]

ح

۷۹۔ مولانا حاجی محمد کشمیری

مولانا حاجی محمد کشمیری اصلاً ہمدان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اسلاف میں

---

[۱۴۱] خلاصۃ الاثر ص ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۱۹، ۱۲۰

سے کوئی بزرگ شیخ علی ہمدانی (متوفی ۶ ذی الحجہ ۷۸۶ھ) کے ساتھ ہمدان سے کشمیر آئے، اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ حاجی محمد کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو دل میں طلب علم کا جذبہ موجزن ہوا۔ حصول علم کی غرض سے عازم دہلی ہوئے اور وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ طبیعت تصوف وطریقت کی طرف مائل ہوئی تو اس دور کے شیخ کبیر خواجہ باقی باللہ دہلوی (متوفی ۱۴ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۴ھ) کی خدمت میں حاضری دی اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ جب حدیث، فقہ اور طریقت میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے تو دہلی سے واپس کشمیر تشریف لے گئے، وہاں درس وافادہ کی مسند آراستہ کی اور قال اللہ وقال الرسول کا روح پرور غلغلہ بلند کیا۔

مولانا حاجی محمد کشمیری اس درجہ پاک باز بزرگ تھے کہ کبھی دنیا داروں کے دروازے پر دستک نہیں دی اور اپنا دامن دنیا طلبی کے میل سے آلودہ نہیں کیا۔

مولانا حاجی محمد کشمیری حنفی المسلک تھے، درس وتدریس اور تصوف وطریقت کے ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے شرح حصن حصین، شرح شمائل ترمذی، فضائل قرآن کے موضوع پر ایک کتاب، مصباح الشریعۃ اور شرح الاوراد قابلِ ذکر ہیں۔

سرزمینِ کشمیر کے اس جید عالم وفقیہ اور نامور صاحبِ سلوک بزرگ نے جمعرات کے روز ۲۹ صفر ۱۰۰۶ھ کو وفات پائی۔ "نوزدہم بود ز شہرِ صفر" مادۂ تاریخِ وفات ہے۔[1]

۸۰۔ مولانا حبیب اللہ سندھی

مولانا حبیب اللہ سندھی اپنے عہد کے شیخ اور فاضل بزرگ تھے اور اُس دَور

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۰۶ — محبوب الالباب ص — تاریخ کشمیر اعظمی ص — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۲۵، ۱۲۶

کے فحول علمائے احناف میں گردانے جاتے تھے۔ اعمالِ بھکر میں ہنکور نام کا ایک قریہ تھا۔ اس قریہ میں شیخ عباس بن جلال سندھی کا ایک مشہور مدرسہ تھا، مولانا حبیب اللہ سندھی اس مدرسے کی مسندِ تدریس پہ فائز تھے۔ خاصی مدت تک اس مدرسے میں ان کا ہنگامۂ درس جاری رہا اور بے شمار علماء و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ مولانا حبیب اللہ سندھی گیارھویں صدی ہجری کے نہایت متقی، سراپا خلوص، عبادت گزار، علوم و فنون میں ماہر اور اپنے اقران و معاصرین میں برگزیدہ شخص تھے۔[۲]

۸۱۔ مفتی حسام الدین دہلوی

مفتی حسام الدین کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔ حسام الدین بن سلطان بن ہاشم بن رکن الدین بن مفتی جمال الدین حنفی دہلوی، معروف عالم اور اپنے دور کے مشہور فقہا میں سے تھے۔ شاہ جہان کے عہد میں، دہلی کے منصبِ افتا پر متعین تھے۔ اپنے علم و فضل کی وجہ سے عوام و خواص میں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔[۳]

۸۲۔ سید حسن بلگرامی

سید حسن بن نوح بن محمود حسینی واسطی بلگرامی، شیخِ وقت، نامور عالم اور معروف فقیہ تھے۔ فقہ کی معروف کتاب قدوری پر حاشیہ سپردِ قلم کیا تھا۔ ۱۰۰۸ھ تک زندہ تھے۔ ان کی وفات ۹ شعبان کو ہوئی۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس سن میں ہوئی۔[۴]

۸۳۔ سید حسین بلگرامی

سید حسین بلگرامی بھی سید نوح بن محمود حسینی واسطی کے بیٹے تھے۔ سید حسن

۲؎ اذکارِ ابرار ص ۳۰۶ بضمن یادِ مخدوم عباس۔ نزہتہ الخواطر، ج ۵ ص ۱۲۸۔
۳؎ شمسِ التواریخ ص — نزہتہ الخواطر، ج ۵ ص ۱۲۸۔
ص ۱۳۲

بلگرامی کے بھائی تھے جلیل القدر عالم اور فقیہ تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے نامور فقہا میں ہوتا تھا۔ بغیر کسی معقول وجہ کے گھر کی چار دیواری سے باہر نہ نکلتے تھے۔ اصل مشغلہ کتابت اور عبادت تھا اور اس میں بہت مشہور تھے۔ تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ ۱۰۰۸ھ تک زندہ تھے[۵]

۸۴- شیخ حسین ہروی

شیخ حسین بن باقر گیارھویں صدی ہجری کے فاضل ہندی عالم تھے اور حدیث و سیرت میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے شمائل ترمذی کی دو شرحیں جلال الدین اکبر کے دو بیٹوں کے لیے قلم بند کیں۔ پہلی شرح فارسی نثر کی صورت میں شاہزادہ سلیم کے لیے لکھی۔ دوسری شرح بصورت نظم شاہزادہ مراد کے لیے تصنیف کی۔ یہ نہایت عمدہ اور بہترین شرحیں ہیں[۶]

۸۵- مولانا حسین خباز کشمیری

مولانا حسین خباز کشمیری، سرزمین کشمیر میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما اور تربیت پائی۔ شیخ محمد قادری سے اخذ علم کیا اور عرصہ تک ان کی خدمت میں رہنے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے، پھر دہلی کا عزم کیا اور شیخ عبدالشہید احراری سے مستفیض ہوئے اور ایک مدت تک ان کی ملازمت و مصاحبت اختیار کیے رکھی۔ بعد ازاں شیخ باقی باللہ کی خدمت میں حاضری دی، ان سے استفاضہ کیا اور طویل عرصہ ان کی صحبت و رفاقت میں گزارا۔ پھر مراجعت فرمائے کشمیر ہوئے اور بقیہ عمر عبادت الٰہی اور علما و طلبا کے افادہ میں صرف کر دی۔

۵۔ مآثر الکرام ص ۲۱۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۳۴

۶۔ منتخب التواریخ ص ۔ " " "

مولانا حسین خباز ارضِ کشمیر کے نامور شیخ، اونچے درجے کے عالم دین، معروف فقیہ اور مشہور صاحب فضل و صلاح بزرگ تھے۔ بعض کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ۱۰۵۲ھ کو کشمیر میں فوت ہوئے۔[ے]

۸۶- قاضی حسین سترکھی

قاضی حسین بن ابوالحسن سترکھی معقولات و منقولات کے بہت بڑے ماہر تھے اور شیخ عبدالرزاق بن خاصۃ الصالح امیٹھوی (متوفی ۱۰۰۵ھ) کے شاگرد تھے۔ ان سے طویل عرصہ تک فیض حاصل کرتے رہے، شیخ عبدالرزاق نے ان کے علم و فضل اور صالحیت سے متاثر ہو کر اپنی ایک بیٹی ان کے عقد میں دے دی تھی۔ قاضی حسین سترکھی سے شیخ جعفر بن نظام الدین عثمانی امیٹھوی (متوفی ۱۰۴۵ھ) نے علم حاصل کیا۔[ش]

۸۷- مولانا حمید الدین سندھی

مولانا حمید الدین بن عبداللہ بن ابراہیم حنفی عمری سندھی۔ سندھ کے ایک مشہور شہر بدربیہ میں پیدا ہوئے اور عمر کا کچھ حصہ وہیں گزارا۔ تحصیل علم بھی اسی شہر اور اسی نواح کے علمائے کرام سے کی۔ پھر ہجرت کر کے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور اسی ارضِ مقدس میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ حرمین شریفین میں وہاں کے جید اور مشہور اساتذہ سے علمِ حدیث حاصل کیا، جن میں شیخ ابوالحسن شافعی بکری، شیخ احمد بن حجر تیمی مکی، مدینہ منورہ کے خطیب شیخ نورالدین علی بن عراق، شیخ نجم الدین محمد بن احمد

ے تاریخِ کشمیر اعظمی ص ۱۳۲، ۱۳۳ — خزینۃ الاصفیا، ج ص —
نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۳۵، ۱۳۶

ش نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۳۶، ۱۳۷

غیطی مصری، شیخ محمد سالم طبلاوی، شیخ محمد علقمی شافعی مصری اور شیخ عبدالقادر حنفی مصری خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

مولانا حمید الدین اپنے دَور کے شیخ، امام، عالم کبیر اور محدث تھے۔ انھوں نے مکہ مکرمہ میں مسندِ علم و فضل آراستہ کی اور بے شمار علما و طلبا نے ان کے چشمۂ علم سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ ان کے درس و تدریس کا حلقہ بہت وسیع تھا جس میں عرب و عجم کے مشہور اصحابِ علم مستفید ہوئے، ان حضراتِ علمائے عظام میں شیخ محمد بن احمد عجل ابو الوفا یمنی، شیخ عبدالرحمٰن بن عیسیٰ عمری مرشدی مفتی حرم مکہ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اسمائے گرامی بالخصوص لائق تذکرہ ہیں۔

عبدالقادر حضرمی نے النور السافر فی اخبار القرن العاشر میں ان کے بھائی شیخ رحمت اللہ سندھی مہاجر مکی کے حالات کے ضمن میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ رحمت اللہ سندھی کے ایک بھائی حمید الدین سندھی تھے، جو علم و صلاح سے متصف، حسنِ اخلاق کے حامل، متواضع، ذی فضل، عقل و خرد سے مالامال فہم و فراست کے مالک، نجابت و شرافت کے پیکر اور جلیل القدر انسان تھے۔ اللہ نے ان کو بے حد عزت و جاہ اور عظمت و وجاہت سے نوازا تھا۔ وہ نو سال مکہ مکرمہ میں سکونت پذیر رہے اور بالآخر نوے (۹۰) سال عمر پاکر ۱۰۰۹ھ کو اسی ارضِ مقدس میں وفات پائی اور اپنے عظیم القدر بھائی شیخ رحمت اللہ کے قریب قبرستان معلّٰی میں مدفون ہوئے۔

خلاصۃ الاثر میں محمد بن فضل اللہ محبی رقم طراز ہیں کہ شیخ حمید الدین سندھی، صاحبِ معارف و فنون تھے۔ اصلاً اقلیم سندھ کے باشندے تھے اور وہیں وقار و عظمت کے جلو میں نشو و نما پائی تھی، نہایت مشہور اور رفیع المنزلت عالم دین تھے۔ بعد کو حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے، وہاں بہت سے علما و افاضل کی صحبت میں رہنے کی سعادت حاصل کی، جن میں خود ان کے بھائی شیخ رحمت اللہ سندھی اور حافظ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد شیخ عبدالرحمٰن ابوالفضل زین الدین شامل ہیں۔

شیخ حمید الدین بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے، مکہ مکرمہ میں بڑی تکریم و احترام کے حامل تھے، متقی، خوش اخلاق، حسن سیرت سے بہرہ ور، خوفِ خدا رکھنے والے اور بلند مرتبہ عالم دین تھے۔ نو سال مکہ مکرمہ میں مقیم رہنے کے بعد ۱۰۰۹ھ کو اسی پاک سرزمین میں سفرِ آخرت کو روانہ ہوئے[۹۵]

۸۸۔ مولانا حیدر کشمیری

مولانا حیدر کشمیری، خواجہ فیروز کشمیری کے فرزند تھے۔ نہایت ذہین، سریع الفہم اور قوی الحفظ تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ ابتدائی کتابیں معروف کشمیری عالم شیخ نصیب الدین سے پڑھیں۔ پھر مولانا جوہرِ زمانت محدث کشمیری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے علوم مروجہ کی بہت سی کتابوں کی تحصیل کی اور علم و فضل کی دولت سے بہرہ ور ہوئے۔ جب ارضِ کشمیر کے مشاہیر علما سے فیض یاب ہو چکے تو دہلی کا قصد کیا، وہاں محدثِ شہر شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ تدریس جاری تھا، اس میں شریک ہو گئے اور شیخ ممدوح سے اخذِ علم کیا۔ بعد ازاں اپنے وطن کشمیر کو معاودت فرمائی اور نہایت دلجمعی اور مستقل مزاجی سے تدریس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ ان کا حلقۂ درس بڑا وسیع تھا، اپنے دور کے نامور مدرس، محدث اور فقیہ تھے، تمام علوم پر گہری نظر رکھتے تھے اور طلبا سے نہایت لطف و مہربانی سے پیش آتے تھے۔ لوگوں سے منقطع اور علیحدہ ہو کر صرف تدریس کو اصل مشغلہ قرار دے لیا تھا۔ بعض فرماں روایانِ کشمیر نے مولانا حیدر سے کئی مرتبہ عہدۂ قضا قبول کرنے کی درخواست کی مگر انھوں نے اس منصب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسی پر درس و افادہ کو

---

[۹۵] النور السافر ص ... بضمن شیخ رحمت اللہ سندھی — خلاصۃ الاثر ...

تاریخ معصومی ص ۲۷۹ — تحفۃ الکرام ص ۴۴۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۲۷، ۱۳۸

ترجیح دی۔ جب ایک حکمران کی طرف سے قبول منصب کا اصرار زیادہ بڑھا تو رات کی تاریکی میں شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر جب پتا چلا کہ دوسرے عالم کو قاضی مقرر کر دیا گیا ہے تو واپس آ گئے۔

مولانا حیدر سرزمینِ کشمیر کے وہ عالم و مدرس تھے جنھوں نے تمام عمر درس و تدریس میں صرف کر دی اور بے شمار علما و طلبا کو دولتِ علم سے مالا مال کیا۔ انھوں نے ۱۰۵۷ھ کو رحلت فرمائی۔ [۱۰]

خ

۸۹- خواجہ بہاری لاہوری

خواجہ بہاری لاہوری، اپنے دور کے مفسر، محدث، فقیہ اور متدین و متقی بزرگ تھے۔ ابتدا میں تحصیلِ علم کی نیت سے اپنے وطن حاجی پور سے گودہ پور گئے جو اس زمانے میں ایک قصبہ تھا۔ وہاں شیخ جمال الاولیا کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے کچھ علوم حاصل کیے۔ اس کے بعد عازمِ لاہور ہوئے، لاہور اس عہد میں مولانا محمد فاضل بدخشی لاہوری (متوفی ۱۰۵۰ھ) کے غلغلۂ تدریس سے گونج رہا تھا۔ خواجہ بہاری بھی ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے، ان ہی سے دستارِ فضیلت حاصل کی اور ان ہی کے گھر میں سکونت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد حضرت میاں میر کے زمرۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور ان کے خلیفہ بھی مقرر ہوئے۔

خواجہ بہاری لاہوری نے ۱۰۶۰ھ کو لاہور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ [۱۱]

---

[۱۰] تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۴۳، ۱۴۴ — تذکرہ علمائے ص ۵۴ — حدائق الحنفیہ ص ۴۰۸، ۴۰۹ — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۳۹۔

[۱۱] تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۸ — حدائق الحنفیہ ص ۴۱۲ — خزینۃ الاصفیا ج ۱، ص ۱۶۸، ۱۶۹ — عملِ صالح، ج ۳، ص ۳۷۶

۹۰- قاضی خلیل الرحمان گورکھپوری

قاضی خلیل الرحمان گورکھپوری حنفی المسلک تھے، اپنے عصر کے افاضل اور کبار علما میں سے تھے۔ نہایت صالح، عفیف، متدین اور اونچے کردار کے حامل تھے۔ منصب قضا پر فائز تھے اور اس سلسلے میں انتہائی دیانت دار اور بہتر شہرت کے مالک تھے۔ گورکھپور کے والی فدائی خاں کے ہاں ان کو خاص قربت حاصل تھی۔ اور اس نے ان کی گوناگوں صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان کو اپنا ندیم و مشیر مقرر کیا تھا۔ پھر سلطانِ ہند اورنگ زیب عالم گیر سے ان کا ذکر کیا اور خاص طور پر ان کی سفارش کی۔ اورنگ زیب ان سے انتہائی تکریم سے پیش آیا اور اپنی قبولیت اور عنایات سے سرفراز کیا۔ حتیٰ کہ ان کو گورکھپور کا والی مقرر کر دیا۔ [۲ے]

۹۱- قاضی خوب اللہ جون پوری

قاضی خوب اللہ جون پوری، شیخ محمد حفیظ حسینی جون پوری کے نواسے تھے۔ جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ اپنے عصر کے جیّد اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ بڑے فاضل اور شیخِ وقت تھے۔ علوم عربیہ اور علم نحو میں بلند مرتبہ کے حامل تھے۔ علمِ حدیث میں بالخصوص درک رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اٹھارہ سو مرفوع احادیث زبانی یاد تھیں۔ الٰہ آباد میں عہدۂ قضا پر فائز تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ تمباکو نوشی کے بارے میں ان کے دو شعر قابل ملاحظہ ہیں:

تنباکو گرچہ ہست زیاں کار بسے — زو فائدہ ہیچگہ ندیداست کسے
آخر بہ ازیں چہ خوب باشد کہ ترا — خاموش کند ز ہرزہ گفتن نفسے

۲ے مرآۃ جہاں نما، ص — ان کا اصل نام عبدالرحمن تھا۔ ملاحظہ ہو فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۲۵ — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

قاضی خوب اللہ جون پوری نے ۴ شعبان ۱۱۰۰ھ کو وفات پائی۔ ۵۳

۹۲۔ مولانا خوشحال تاشقندی

مولانا خوشحال بن قاسم بن مسکین حنفی تاشقندی، شیخ اور فاضل کبیر تھے۔ اپنے عہد کے کبار فقہا میں سے تھے۔ ہندوستان آئے اور شیخ وجیہ الدین گجراتی علوی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ ان سے تفسیر و فقہ، نحو و بلاغت، منطق و حکمت اور فلسفہ وغیرہ کی تحصیل کی۔ پھر شیخ وجیہ الدین گجراتی کے فاضل تلمیذ مرزا جان شیرازی سے شرح ہدایۃ الحکمۃ، حکمۃ العین، شرح التجرید اور حاشیہ قدیمہ، شرح چغمینی اور تحریر اقلیدس وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ تحصیلِ علم کے بعد احمد آباد کی مسندِ تدریس پر فائز ہوئے اور تئیس ۲۳ سال تک علما و طلبا کو درس دینے میں مصروف رہے۔ ان کے حلقۂ درس سے بے شمار اہلِ علم نے استفادہ کیا۔ جب ۱۰۰۳ھ کو بیرم خاں کا لڑکا عبدالرحیم خان خاناں گجرات کا والی مقرر ہوا تو اس نے مولانا خوش حال تاشقندی کو ان کے علم و فضل اور فہم و فراست کی وجہ سے اپنے ندما میں شامل کر لیا اور بہت سے مال و منال اور عطایا سے نوازا۔ ۵۴

۹۳۔ قاضی خوشحال کابلی

قاضی خوشحال کابلی حنفی علامۂ وقت، شیخِ عصر اور فاضلِ دوراں تھے۔ اپنے عنفوانِ شباب میں لاہور آئے۔ اس زمانے میں شیخ محمد بن یحییٰ کا سلسلۂ درس جاری تھا۔ ان سے علومِ عربیہ اور علمِ نحو کی تحصیل کی۔ پھر عازمِ بخارا ہوئے اور وہاں کے شہرۂ آفاق عالم

---

۵۳ تجلی نور، ج ۲، ص ۱۷۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۴۱، ۱۴۲۔ تاریخ شیرازِ ہند جون پور، ص ۳۳۷، ۳۴۷۔

۵۴ مآثر رحیمی ج ۳ ص ۳۲ تا ۳۴ ۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۴۲

شیخ یوسف قراباغی سے فنونِ حکمیہ کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۰۴۱ھ کو واپس ہندوستان آئے۔ ہندوستان سے حجاز تشریف لے گئے اور حج و زیارت کی نعمت سے متمتع ہوئے۔ پھر ہندوستان آگئے اور اکبر آباد (آگرہ) گئے۔ دہلی کی مسندِ قضا پر متعین ہوئے۔ جب شاہ جہان نے قاضی محمد اسلم ہروی کو فوج کے منصب قضا سے معزول کر دیا تو قاضی خوشحال کابلی کو ان کی جگہ یہ عہدہ دیا گیا۔ پھر اورنگ زیب عالم گیر مسند آرائے سریر مملکت ہوا تو اس نے ان کو لاہور کا قاضی مقرر کر دیا جس پر یہ عمر بھر متمکن رہے۔ ان کے حسنِ سلوک اور دیانت داری سے عوام و خواص خوش تھے۔ جب موت کا پیغام آیا تو آواز آئی:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ [۵۵]

اور ان کی روح عالمِ علوی کو پرواز کر گئی [۵۶]

د

۹۴۔ مولانا دانیال جوراسی

مولانا دانیال حنفی عمری جوراسی، شیخ زین الدین کی نسل سے تھے، جو کہ شیخ نصیر الدین محمود اودھی دہلوی کے بھانجے ہوتے تھے۔ علاقہ اودھ میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت پائی اور عبدالسلام اعظمی دیوی سے تحصیل کی۔ طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہے۔ یہاں تک کہ علوم میں مہارت پیدا کر لی اور افتا و تدریس کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو گئے۔ اس کے بعد طریقت و تصوف کی منزلیں طے کیں۔ عالم کبیر،

---

۵۵ یہ سورۃ الفجر کی آیات نمبر ۲۷، ۲۸ ہیں۔ ترجمہ یہ ہے:

اے اطمینان والی روح، تو اپنے پروردگار (کے جوارِ رحمت) کی طرف چل، اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔

۵۶ مرآۃ العالم۔ فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۲۰۷، ۲۰۸۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۲۲

علامۂ وقت اور شیخِ عصر تھے۔ درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں شیخ قطب الدین محمد سہالوی اور بہت سے علمائے کرام شامل ہیں۔[1]

۹۵۔ مولانا داؤد مشکوٰتی کشمیری

مولانا داؤد مشکوٰتی کشمیری بن ملک مسعود غوری، گیارھویں صدی ہجری کے نامدار کشمیری علما میں سے تھے اور تفسیر، حدیث، فقہ اور علومِ حکمیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مشکوٰۃ کے حافظ تھے۔ اس لیے خواجہ حیدر چرخی نے انہیں داؤد مشکوٰتی کا لقب دے دیا تھا۔ خواجہ حیدر بن فیروز چرخی کشمیری کے شاگرد تھے، اور علوم دینیہ ان ہی سے حاصل کیے تھے۔ طریقت و تصوف میں وادیٔ کشمیر کے مشہور صوفیا بابا ابوالفقر نصیب الدین اور خواجہ خاوند محمود بخاری سے مستفیض تھے۔ طویل عرصہ تک ان کی خدمت میں رہے اور علم و معرفت میں ان سے بڑا استفاضہ کیا۔ تصوف و طریقت کے سلسلے کی متعدد عربی اور فارسی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں ایک کتاب اسرار الابرار ہے، جو کشمیری مشائخ و علما اور سادات و فقرا کے حالات کو محتوی ہے۔ ایک کتاب کا نام اثمار الاشجار ہے۔ ایک اور کتاب منطق الطیر ہے۔ اس عالم و فقیہ نے ۱۰۹۷ھ کو کشمیر میں وفات پائی۔[2]

۹۶۔ مُلّا درویزہ پشاوری

ملا درویزہ پشاوری جنھیں اخوند بابا درویزہ پشاوری کہا جاتا ہے، شیخ

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۴۴ بحوالہ بحر زخار۔ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۵

[2] تاریخ کشمیر اعظمی ص ۱۷۶، ۱۷۷۔ خزینۃ الاصفیا، ج ۱ ص ۶۴۵، ۶۴۶۔ تذکرہ علمائے ہند ص ۶۰۔ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۴۵، ۱۴۶۔ حدائق الحنفیہ، ص ۴۲۳، ۴۲۴۔

اور صالح عالم دین تھے۔ فقہ واصول اور علم کلام کے ماہر تھے۔ طریقت وتصوف سے بھی لگاؤ تھا اور اس ضمن میں سید علی ترمذی غواص سے مستفیض تھے، جو شیخ نظام الدین بن عبدالشکور تھانیسری (متوفی ۱۰۲۴ھ) کے تلامذہ میں سے تھے۔

ملا درویزہ پشاوری، وہ فقیہ اور اصولی تھے، جو احکام اسلام کے سخت متبع اور اس ضمن میں مجادلہ ومناظرہ میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ زنادقہ وملاحدہ کے شدید مخالف تھے۔ شیعہ سے بھی ان کے مباحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بالخصوص علیسی ملا منی اور بایزید ملحد سے (جو پیر روشن کے نام سے موسوم تھا) ان کے اکثر مباحثے ہوتے۔ دین کے درد اور اسلام کی محبت سے ان کا دل معمور تھا۔ پشاور اور اس کے گرد ونواح میں بہت مشہور تھے اور درس وتدریس کا وسیع حلقہ قائم تھا۔ تمام عمر علما وطلبا کو علمی فائدہ پہنچانے اور ان کی ذہنی وعملی تربیت میں کوشاں رہے۔

ملا درویزہ تصنیف وتالیف کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ مخزن الاسلام، ان کی مشہور کتاب ہے جو پشتو زبان میں ہے۔ اس میں اسلام کے حقائق ومعارف اور احکام شرح وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ کتاب وہ اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکے۔ اس کی تکمیل ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مولانا عبدالکریم (متوفی ۱۰۷۲ھ) نے کی۔ انہوں نے مخزن الاسلام کی شرح بھی سپرد قلم فرمائی، جسے کلمات باقیات کے نام سے موسوم کیا۔ خواجہ معین الدین خویشگی نے بھی اس کی شرح لکھی۔ اس شرح کا نام الکلمات الوافیات ہے۔

یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات علما ومشائخ نے افغانوں میں تبلیغ دین کی طرح ڈالی، ان کے علاقے میں رشد وہدایت کی بساط بچھائی اور انھیں صحیح اسلامی تعلیم سے آشنا کیا، ان میں سید علی غواص ترمذی المعروف حضرت پیر بابا اور ان کے مرید وشاگرد اخوند درویزہ پشاوری کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سید علی غواص سادات ترمذ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا مولد ومنشا قندس تھا ــــ ان کے والد مغل حکمران نصیر الدین ہمایوں

کی فوج میں ایک منصب پر فائز تھے اور اسی کے ساتھ دار دِہند ہوئے تھے۔ لیکن سید علی غواص پر فقر و درویشی کا رنگ غالب رہا ــــــــ وہ مشائخ وصوفیا سے استفاضہ کے لیے پانی پت اور اجمیر وغیرہ بھی گئے ۔ خرقہ ، خلافت ، طریقہ چشتیہ میں اجمیر کے سید سالار سے حاصل ہوا ، اور مرشد نے کوہستان کو مرکز تبلیغ ٹھہرانے کی ہدایت کی ۔ ان کے دوگگیانی عقیدت مندوں نے انھیں علاقہ افغان میں اقامت گزین ہونے پر آمادہ کیا ۔ اس وقت اس علاقے کی جو مذہبی حالت تھی ، وہ اخوند درویزہ نے اپنے مرشد سید علی غواص کی زبانی بیان کی ہے۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے ۔ فرماتے ہیں :

اس علاقے کے لوگوں کو میں نے انتہائی سادہ دل ، ہر آن دین کی طلب و تلاش میں ساعی اور خدا رسیدہ پایا ۔ دین کے معاملے میں جوان بوڑھوں سے آگے نکلے ہوئے ، عورتیں مردوں سے بڑھ کر دین پر کاربند ، بچے عالمِ طفولیت ہی میں نیکی و تدین کے متلاشی ، اور ان کے کارندے بھی احکامِ شریعت پر عامل ـــــ ان لوگوں میں قبولِ حق کی صلاحیت تو موجود تھی مگر پورے علاقے میں نہ کوئی درس کا سلسلہ تھا ، نہ کوئی مکتب و مدرسہ ۔ نہ کہیں علم تھا اور نہ علما و اتقیا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت سے بے بہرہ مشائخ اور دین سے تہی دامن پیروں نے ان لوگوں کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر ان کو غلط راہوں پر ڈال دیا ۔

افغانوں کی یہ حالت دیکھ کر سید علی خواص ترمذی نے ان کے علاقے میں قیام پذیر ہونے اور ان کی اصلاح و تربیت کا تہیہ کر لیا ۔ نیت چوں کہ نیک تھی ، اس لیے اللہ نے ان کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور اس نواح میں بڑی قبولیت حاصل کی ۔ جہاں کہیں کسی بے علم اور شریعت سے بے بہرہ پیر کی اطلاع پاتے ، وہاں پہنچتے اور اس سے باقاعدہ مباحثہ و مجادلہ کرتے ۔ تذکرۃ الابرار والاشرار میں ایسے متعدد مدعیانِ مذہب کے نام مرقوم ہیں ، جن سے ان کے مقابلے ہوئے ۔ ان کے سب سے اہم اور زوردار معرکے فرقہ روشنیہ کے پیر روشن سے ہوئے ۔ پیر روشن کا اصل نام بایزید تھا ۔ ان معرکوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی عطا فرمائی ۔

غرض سید علی غواص نے پورے جوش و خروش اور بے حد محنت سے افغان علاقوں میں صحیح اسلام کی اشاعت کا آغاز کیا، جس کے نتیجے میں خلقِ کثیر ان سے فیض یاب ہوئی۔ ان کی مساعی تبلیغ کا سب سے نمایاں اور اہم پہلو یہ ہے کہ اخوند درویزہ پشاوری اور اُن کے لڑکے شیخ عبدالکریم ان کے حلقۂ ارادت و عقیدت میں شامل ہوگئے اخوند درویزہ نے اپنی کتاب مخزن الاسلام میں سید علی غواص کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کی ان مساعی کو بہت سراہا ہے جو انھوں نے ملاحدہ اور زنادقہ کے خلاف انجام دیں۔ سید علی غواص نے ۹۹۱ھ کو وفات پائی اور یوسف زئی علاقے میں بونیر اور سوات کی سرحد پر مدفون ہوئے۔

ملا اخوند درویزہ پشاوری اس نواح کے وہ بزرگ ہیں جو سید علی غواص ترمذی کے سب سے نامور عالم دین مرید اور رہنما گرد تھے۔ افغانوں میں یہ اپنی بزرگی و علمیت کی بنا پر خاص شہرت اور احترام کے مالک ہیں اور اس نواح میں اخوند بابا یا اخون بابا کے عرف سے معروف ہیں۔ وہ علوم ظاہری میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ولی اللہ بزرگ تھے، اور بحرِ تصوف کے شناور۔ لیکن اپنی ولایت کو پردۂ تعلیم و تدریس اور ملائیت میں مستور کر رکھا تھا۔ خزینۃ الاصفیا میں ان کی اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"جمالِ ولایت خود را در پردۂ تدریس و تعلیم و ملائی پوشیدہ می داشت۔"

اخوند درویزہ کے بزرگ اصلاً علاقہ ننگرہار کے رہنے والے تھے، جسے اب جلال آباد کہا جاتا ہے اور مشرقی افغانستان میں واقع ہے۔ مغلوں اور یوسف زئی قبائل کی کشمکش میں ان کے دادا وفات پاگئے تو یہ خاندان مہمندوں کے علاقے میں منتقل ہوگیا تھا، یہیں اخوند کی پرورش ہوئی۔ ابتدا میں انھیں زہد و ریاضت سے دلچسپی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی علوم ظاہری کی تکمیل بھی کی اور مروجہ علوم کامل انہماک اور توجہ سے پڑھے۔ اخوند کے والدِ گرامی بھی

صاحب علم بزرگ تھے۔ "ادبیات سرحد" میں ان کا نام اخون گدا لکھا ہے۔ لیکن اخوند صاحب کے بیٹے مولانا عبدالکریم تو علمی اعتبار سے اپنے دادا — اخوند گدا — سے بہت آگے نکل گئے تھے۔

برصغیر کی دینی اور علمی تاریخ میں اخوند درویزہ کے تعلیمی اور تبلیغی کارناموں کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور ان کی مساعی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان کا سب سے اہم اور بڑا کارنامہ فرقہ روشنیہ کے خلاف محاذ آرائی ہے، اس میں وہ کامیاب رہے، اور ہر میدان میں اس کے قائد — پیر روشن — کو شکست دی۔ جس رفتار سے اس فرقے کے اثرات پھیل رہے تھے اس کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اخوند درویزہ اس کے خلاف نبرد آزما نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ تمام افغانوں، یا کم از کم ان کے مشرقی قبائل کو یہ غلط مذہبی نظام اپنی لپیٹ میں لے لیتا اور ان کی مذہبی حمیت اور دینی غیرت اس سے سخت مجروح ہوتی۔ اخوند درویزہ اور ان کے خاندان کے اہل علم اور ان کے عقیدت مند میدانِ عمل میں اترے اور انھوں نے علومِ اسلامی کی ترویج و اشاعت کے لیے پشتو زبان میں کتابیں لکھیں، اور ساتھ ہی ساتھ طریقۂ روشنیہ کی تقریروں، مباحثوں اور مناظروں کے ذریعے بھرپور مخالفت کی — اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بایزید کو اس کے معتقدین "پیر روشن" کے نام سے پکارتے تھے، لیکن اخوند درویزہ نے اس کو "پیر تاریک" کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے مریدوں کے ساتھ مناظرے کیے۔ اس ضمن میں خزینۃ الاصفیا میں صاف لفظوں میں مسطور ہے:

"در دفع زنادقہ و ملاحدہ و رفض بسیار می کوشید و ہر جا کہ ملحدے یا رافضی شنیدے نزد او رسیدے و با او مذاکرہ کردے و او را ملزم ساختے۔"

اخوند درویزہ کے مرشد، سید علی غواص ترمذی بھی زنادقہ و ملاحدہ کے سخت مخالف تھے۔ اب مرید نے بھی ان کے خلاف محاذ قائم کر لیا اور اس میں اس درجہ شدت اختیار کی کہ جہاں جہاں بایزید جاتا، یہ بھی اس کے تعاقب میں وہاں

پہنچتے، اس سے مباحثہ کرتے، یہاں تک کہ اس کو لاجواب کر دیتے۔ وہ مارے خجالت و شرمندگی کے خاموش ہو جاتا اور تاب سخن نہ پاتا — اس سلسلے میں اپنے مرشد کے ساتھ بھی جاتے اور تنہا بھی۔ اپنی تصنیف مخزن الاسلام میں فرماتے ہیں:

چوں حضرت پیر دستگیر ایں فقیر، شیخ المشائخ والاولیا، سیف السنت، سید علی ترمذی در میانان افغانانِ یوسف زئی در موضع بونیر بودہ، از بایزید خبر یافتہ، دفعِ دعوئ اور را برخود فرض دید...... پس ایں فقیر ہم ہمراہ برفتم، او را دعوائی خجل و شرمسار ساختم کہ سخن گفتن و دم زدن در حضور نتوانست، تا لقب او را پیر تاریک کردم، و ہذا اکبرات و مرات گاہے با حضرت پیرو باخیلہ گاہی و گاہے بہ تنہائی خود حاضر می شدم و ایں ملحد را خجل ساختم۔

لیکن پیر روشن اور اس کے فرقے کے ملحدانہ افکار کی مخالفت میں اخوند درویزہ کو وہ کامیابی نہ حاصل ہوتی تھی، جس کی وہ توقع کرتے تھے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس علاقے میں کوئی ایسی اسلامی حکومت قائم نہ تھی جو رفع شر اور ترویج خیر کا مناسب انتظام کرتی۔ دوسرے اس نواح میں علوم اسلامی کی اشاعت کا قطعی کوئی اہتمام نہ تھا۔ اخوند ممدوح فرماتے ہیں کہ افغان دین سے محبت رکھتے ہیں اور اس کے طالب و متلاشی ہیں لیکن دینی علم سے تہی دامن ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ میں اگر جاہل افغانوں میں سے کسی ایک شخص کو روکتا تو دوسرا بایزید کے پاس جا پہنچتا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر اخوند نے فیصلہ کیا کہ مسئلے کا اصل حل علومِ دینی کی نشر و اشاعت ہے، چنانچہ انھوں نے پشتو اور فارسی زبانوں میں کئی کتابیں مرتب کیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

افغاناں چو در طلبِ مولیٰ محبت تمام دارند و دین راجویان اند، اما بسببِ نادانی وجاہلی کہ از علوم دینی محروم اند، حق را از باطل نمی دانند...... پس ایں فقیر می خواہد کہ متن عقائد بہ لفظ افغانی بسیار دنا ہر کہ آں را دریابد و باور دارد ہرگز گمراہ نہ گردد۔

اس موضوع سے متعلق ان کی مشہور تصنیف مخزن الاسلام ہے، جو پشتو زبان

ہیں ہے۔اس کتاب میں انھوں نے عقائد و عبادات سے متعلق اہم اور بنیادی مسائل عربی اور فارسی کتابوں سے اخذ کر کے تحریر کیے ہیں اور اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ جو شخص سنتِ نبوی پر عامل نہ ہو اور تفسیر، حدیث اور فقہ کے علوم سے آگاہ نہ ہو، اسے ہرگز پیر یا پیشوا نہیں بنانا چاہیے۔

مخزن الاسلام کا بیشتر حصہ اخوند درویزہ کا اپنا تحریر کردہ ہے اور احکامِ شریعت کا تمام مواد ان ہی کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ ان کے صاحبزادے مولانا عبدالکریم پشاوری نے دو ابواب کا اضافہ کیا ہے، جو حقائق و معارف کے بارے ہیں۔

اخوند درویزہ کو اس امر کا پورا پورا احساس تھا کہ بایزید کی بے راہ روی اس بات کا نتیجہ ہے کہ وہ طریقت کی غلط ترجمانی کرتا ہے اور شریعت پر طریقت کو ترجیح دیتا ہے۔ان کے الفاظ یہ ہیں:

"دریں ایام ہر کہ افغانان در بلائے در آمدہ است، از پیری و مریدی در آمدہ است۔"

اس لیے مخزنِ اسلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مروجہ پیری مریدی، اور طریقِ تصوف میں اصلاح کی بے حد کوشش فرمائی، لیکن اس ضمن میں ان کی جامع اور مشہور تصنیف ارشاد الطالبین ہے، جو فارسی زبان میں ہے، اس کے آغاز میں وہ صاف الفاظ میں رقم طراز ہیں کہ اس دور کے مشائخ و صوفیا کے احوال و اقوال، قرآن و حدیث کے صریح احکام سے متصادم ہیں، مختلف قسم کے الحاد و زندقہ نے لوگوں کے ذہن و فکر پر تسلّط جما لیا ہے، سنت کے عالم اور عامل ان دیار میں اجنبی ہو کر رہ گئے ہیں اور صوفیائے عصر آئمہ دین کی روایات سے ہٹے ہوئے اور روگرداں ہیں۔اس باب میں ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

اما بعد یکے از مریدانِ کمترینہ حضرت شیخ الاسلام والمسلمین، وارث علوم انبیا والمرسلین، شیخ علی ترمذی، یعنی اضعف عباد اللہ الباری ہمی گوید کہ..... چوں انواع

اہلِ الحاد تغلب نمودہ اند، پس . . . معتقدان و معتمدان مذہب سنت وجماعت، بل عالمان و عاملان مشربِ شریعت را غریب الغربا دیدم . . . از شدتِ تعصب دینی روز بروز در سوز وگداز درآمدم۔ امّا از روئے تحقیق نظر کردم کہ سبب تفرقِ امت بہ ہفتاد و سہ گروہ چہ می باشد؟ جز امر شیخوخت مردودہ مبتدعہ چیزے دیگر نیافتم زیراکہ تمامی افعال واقوال واحوال شیوخ ایں ایام را مخالفِ قرآن وحدیث ومخالفِ روایاتِ آئمہ ومخالفِ حالاتِ شیوخِ سلف دیدم۔

اخوند درویزہ کے نزدیک امت کے اختلافات اور عوام کی گمراہی کا اصل سبب یہی "شیخوخت مردودہ مبتدعہ" یعنی مشائخ واکابر کے غلط دعوے اور مبنی بر بدعت طور طریقے ہیں اور ان کا علاج قرآن وحدیث کے اتباع اور ائمہ وشیوخِ سلف کی پیروی ہے۔ انھوں نے روحانی مطلق العنانی اور خلاف شرع تصوف کی سخت الفاظ میں تردید کی ہے۔ ان کی تصانیف میں یہ شعر جو بایزید۔۔پیر روشن۔۔ پر بظاہر صادق نظر آتا ہے، بار بار درج ہوا ہے:

خیالاتِ نادانِ خلوت گزیں ۔ بہم بر زند عاقبت کفر و دیں

بہر حال اخوند ممدوح نے جب محسوس کیا کہ افغان اگرچہ دین ومذہب کے دلدادہ ہیں مگر قلتِ علم کی بنا پر ان کی اکثریت کو جاہل صوفیا نے صراطِ مستقیم سے دور کر رکھا ہے تو انھوں نے ان میں توسیع علم کی کوشش کی اور بڑی جد و جہد کے بعد اس میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی۔ انھوں نے ان لوگوں کو خاص طور پر ہدفِ تنقید ٹھہرایا جو علم کو "حجابِ اکبر" سے تعبیر کرتے تھے اور کہا کہ اگر علم فی الواقع حجاب اکبر ہے تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا کی دعا کا حکم دیا۔

اخوند درویزہ کی تصنیفات میں سے چار کتابوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک مخزن الاسلام، دوسری ارشاد الطالبین، تیسری تلقین المریدین اور چوتھی تذکرۃ الابرار الاشرار۔۔ یہ کتابیں مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ وہ پشتو کے بہت بڑے

عر بھی تھے۔ میر احمد شاہ رضوانی مرحوم نے اپنی کتاب بہارستان میں فضیلتِ صبر کے بارے میں ان کی ایک مثنوی درج کی ہے۔

اخوند مرحوم بے شک اونچے درجے کے مصنف اور شاعر تھے، لیکن درحقیقت وہ ایک مصلح اور مبلغ اسلام تھے۔ انھوں نے صرف بایزید (یعنی پیر روشن) کا مقابلہ ہی نہیں کیا بلکہ جس جماعت اور گروہ کو بھی وہ اسلام کے بنیادی ارکان اور عقائدِ دینیہ کے مخالف پاتے اس کے خلاف محاذ قائم کر لیتے۔ ان میں "فدایان" کا گروہ بھی تھا، جو اسماعیلیوں سے تعلق رکھتا تھا اور اس گروہ سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ اب بھی نواحِ چترال میں موجود ہیں۔ اس گروہ کی اخوند مرحوم نے شدید مخالفت کی۔ ایک روایت کے مطابق اخوند کی موت کا باعث بھی یہی گروہ ہوا تھا، اس کے سردار نے ان کو تربوز کھلا دیا تھا، جس میں زہر ڈالا گیا تھا۔ اسی کی وجہ سے اخوند کی موت واقع ہو گئی تھی۔

اخوند درویزہ کے جوشِ اصلاح اور حمیت دینی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیر و مرشد شیخ علی غواص ترمذی کو بھی جن کا ان کے دل میں بے حد احترام تھا، غیر شرعی امور کے ارتکاب سے بلا جھجک ٹوک دیا تھا۔ شیخ علی غواص سلسلۂ چشتیہ سے منسلک تھے اور اس سلسلے کے رواج کے مطابق سماع کے قائل تھے۔ اخونداس پر معترض ہوئے، سماع کو خلافِ شرع قرار دیا اور مرشد کو اس سے منع فرمایا۔ شیخ علی نے کہا، میں کبھی کبھی سماع کرتا ہوں، اور اس لیے کرتا ہوں کہ اس سے مجھ پر بعض اسرار منکشف ہوتے ہیں، لیکن معترضوں کے پاسِ خاطر سے اسے ترک کرنے کو تیار ہوں، چنانچہ اخبار الاولیا میں مذکور ہے کہ اس کے بعد شیخ علی نے کبھی سماع نہیں کیا۔

اخوند عالمِ دین اور پابندِ شرع بزرگ تھے۔ بعض اوقات وہ اس درجہ یادِ خدا میں مستغرق ہو جاتے اور ذکرِ الٰہی میں ڈوب جاتے کہ کسی چیز کا انھیں کچھ پتا نہ چلتا۔ اس قسم کا ایک واقعہ رُودِ کوثر میں اخبار الاخیار کے حوالے سے مندرج

ہے کہ ایک روز ایک خاتون سر پر تیل کا بھرا ہوا مٹکا اٹھائے جا رہی تھی۔ اخوند کو شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ خاتون سے کہا، بیٹی! پانی پلاؤ تو ثواب ملے گا۔ خاتون حیا اور ادب کے جذبات سے اس قدر مرعوب ہوئی کہ کچھ نہ کہہ سکی اور مٹکا اخوند کے سامنے رکھ دیا۔ انھوں نے پینا شروع کیا تو مٹکا خالی کر دیا۔ بعد کو منہ کا ذائقہ بدلا تو پتا چلا کہ یہ پانی نہ تھا، تیل تھا۔

اخوند درویزہ نے عہدِ شاہ جہانی میں، ۱۰۴۸ھ کو وفات پائی اور پشاور میں موضع ہزار خانی کے قریب مدفون ہوئے۔

اخوند درویزہ کے صاحب زادے کا نام مولانا عبدالکریم تھا۔ یہ بھی عالم و فقیہ اور صاحبِ طریقت بزرگ تھے۔ انھیں "محققِ افغانستان" کا خطاب حاصل تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ اشعار میں یہ خود کو اخوند کریمہ کہتے ہیں۔

اخوند کریمہ نے ۱۰۷۲ھ کو انتقال کیا اور علاقہ یوسف زئی میں دفن کیے گئے۔

اخوند درویزہ کے تلامذہ اور تربیت یافتہ لوگوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ پیروی شریعت، اتباعِ سنت اور بدعات و خلافِ شرع امور کی مخالفت اور بیخ کنی میں یہ حضرات بھی اپنے استاذ و مرشد کے نقشِ قدم پر چلے۔ ان کی مساعی سے علاقۂ سرحد میں علم و فضل کی شمع روشن ہوئی اور احکامِ شریعت پر عمل کی دیواریں استوار کرنے کے اسباب پیدا ہوئے۔ ان حضرات میں مولانا چالاک، شاہ میانہ و شیخو شاہ، شاہ جہان پوری و شیخ علی وغیرہ شامل ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ "ہر کہ بہ صحبتِ او پیوست، فضیلتے از علوم دینی یافت۔" ان کی زبان پشتو تھی، لیکن فارسی اشعار بھی کہتے تھے اور ہندوستانی زبان میں بھی گفتگو کرتے تھے۔ ان کا سالِ وفات ۱۰۷۳ھ ہے اور مدفن پشاور!

اخوند درویزہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے افغانوں میں فرقہ روشنیہ اور اس کے بانی پیر روشن کا (جو میاں بایزید کے نام سے موسوم

تھا) زور ختم کیا اور روشنی کے نام سے، وہ جو تاریکی پھیلا رہا تھا، اس کے اثرات دُور کیے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ پیر روشن کے پوتے مرزا خان انصاری، جو پشتو کے صاحبِ دیوان شاعر تھے، کسی زمانے میں کہا کرتے تھے کہ میرے اشعار کی شیرینی پیر روشن خان (پیر روشن) کی برکت سے ہے، لیکن اخوند درویزہ کی تبلیغِ دین سے متاثر ہو کر مرزا خان انصاری نے فرقۂ روشنیہ کو ترک کر دیا تھا اور ان تمام باتوں سے تائب ہو گئے تھے جو انھوں نے خلافِ شرع کہی تھیں یا جن پر عمل کیا تھا۔ پشتو زبان میں علومِ اسلامی کے متعلق جو کتابیں بصورتِ نثر یا نظم لکھی گئیں وہ سب اخوند درویزہ کی تبلیغی مساعی کا نتیجہ ہیں۔[۵۳]

ر

۹۷۔ مولانا رضی الدین بھاگل پوری

مولانا رضی الدین بھاگل پوری حنفی المسلک تھے اور گیارھویں صدی ہجری کے فحول علمائے ہند میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ عالم و فقیہ اور شیخ وقت تھے۔ تمام علوم مروجہ میں درجۂ ممتاز پر فائز تھے۔ علمائے عصر میں بہت مشہور اور فاضل بزرگ تھے۔ ان کے زمانے میں فتاویٰ ہندیہ۔ جو فتاویٰ عالم گیری کے نام سے معروف ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کی سعی و کوشش سے زیرِ ترتیب تھا اور مشاہیر علمائے ہند کی ایک بڑی جماعت اس اہم خدمتِ فقہی پر مامور تھی۔ اورنگ زیب کے کانوں میں مولانا رضی الدین بھاگل پوری کی شہرتِ علمی پہنچی تو اس نے ان کو بھی اس خدمت پر متعین کر دیا۔ قاضی محمد حسین محتسب

---

۵۳ خزینۃ الاصفیاج ا ص ۱۷۱، ۲۷۴ ۔ رودِ کوثر ص ۴۱۲ تا ۴۲۱ ۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۵۹، ۶۰ ۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۴۶، ۱۴۷ ۔ ادبیاتِ سرحد ص ۱۵۳۔

اور مشہور مورخ بختاور خاں کی سفارش اور تعارف سے ان کو فتاویٰ عالم گیری کے مدوّنین کی جماعت میں رکھا گیا تھا۔ بادشاہ نے اس خدمت کے صلے میں ان کا تین روپے یومیہ وظیفہ مقرر کیا۔

مولانا رضی الدین بھاگل پوری، عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ فنون حرب میں بھی مہارت رکھتے تھے اور سیاست کی پیچیدہ گرہوں کی عقدہ کشائی میں ان کو خاص درک حاصل تھا۔ ان اوصاف کی وجہ سے بادشاہ نے ان کو ۱۰۷۹ھ میں یک صدی منصب سے نوازا اور اپنے خاص مشیروں میں شامل کیا پھر ۱۰۹۰ھ میں ان کو "خان" کے لقب سے سرفراز کیا اور اودے پور کے شاہی لشکر میں شامل فرمایا، چنانچہ انھوں نے کفارِ ہند کے خلاف شدید جنگیں لڑیں اور اپنی شجاعت و بسالت اور مجاہدانہ تگ و تاز کا ثبوت دیا۔ بعدازاں بادشاہ کی طرف سے انھیں اقطاعِ برار کا والی مقرر کیا گیا، جہاں یہ امیر حسن علی خاں کی جگہ کچھ عرصہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ مولانا رضی الدین بھاگل پوری نے ۱۰۹۶ھ کو سرزمین برار میں وفات پائی۔[۱]

۹۸۔ سید رفیع الدین بلگرامی

سید رفیع الدین بن بدرالدین بن تاج الدین حسینی واسطی بلگرامی، بلگرام میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ حصول علم کے لیے مختلف مقامات میں گئے اور اپنے دور کے اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ یہاں تک کہ فضیلت علمی میں ممتاز ٹھہرے اور فتوے و تدریس کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوئے۔ پھر بلگرام واپس آئے اور بلند مرتبہ علما میں سے گردانے گئے۔ فاضلِ عصر اور شیخِ وقت تھے۔ بلگرام کی مسندِ

---

[۱] مآثر عالم گیری ص ۹۴ — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۴۹ — برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، ص ۲۸۱، ۲۸۲۔

درس پر فائز اور منصبِ افتا پر متعین تھے۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ نہایت خوش خط تھے اور مختلف کتابوں پر شاندار حاشیے بنا کر خوب صورتی سے لکھتے تھے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں ان کا تذکرہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے مطول اور تلویح وغیرہ کتابیں دیکھیں، جن پر ان کے حواشی تحریر تھے۔ تلویح کے خاتمے پر یہ الفاظ مرقوم تھے:

قد وقع الفراغ من تسوید ھٰذہ النسخۃ الشریفۃ المسماۃ بالتلویح فی شرح التوضیح بمد دستۃ استاذی العلامۃ النافع للخاصۃ والعامۃ، اعلم العلماء اکمل الاتقیاء، حامی اھل الشرع والایمان ماحی آثار الظلم والطغیان، الحضرۃ العلیۃ الشیخ حسین بن الشیخ داؤد متع اللہ الطالبین بطول بقائہ فی افضل الایام یوم الجمعۃ الثامن عشر من شھر ربیع الاول سنۃ خمس تسعین وتسعمائۃ، مالکہ وکاتبہ رفیع الدین بن بدر الدین بن تاج الدین بن الحسین الحسینی والمامول من القارئین لھٰذہ الکتاب والمستفیدین بہ ان یذکروا الکاتب المذنب فی اوقاتھم الشریفۃ بدعاء الخیر وسلامۃ الایمان واللہ سبحانہ ھو المستعان [۲]

۹۹۔ مولانا رفیع الدین انصاری سہارن پوری

مولانا رفیع الدین بن عبدالستار بن عبدالکریم انصاری سہارن پوری، سہارن پور میں پیدا ہوئے اور وہیں نشوونما پائی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور شیخ رکن الدین گنگوہی سے تحصیل کی۔ تصوّف سے دلچسپی ہوئی تو ان ہی سے اخذِ طریقت کیا اور خرقۂ تصوّف زیبِ تن فرمایا۔ بعد ازاں عازمِ برہان پور ہوئے، وہاں

---

[۲] مآثر الکرام ص ۲۱۶، ۲۱۷ — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۴۹، ۱۵۰۔

شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی کی بساط تدریس وسلوک بچھی ہوئی تھی، ان سے علم حدیث حاصل کیا، بعض دیگر علوم بھی پڑھے اور طریقہ شطاریہ کے مطابق ان سے کسب فیض بھی کیا۔ اس کے بعد اپنے شہر سہارن پور کو مراجعت فرمائی اور مجلس ارشاد وصلاح کو رونق بخشی۔ تمام سلاسلِ تصوف سے منقطع ہو کر رشد و ہدایت کی سیدھی اور مستقیم راہ کے مطابق لوگوں کو فیض پہنچانے لگے۔

مولانا رفیع الدین انصاری سہارن پوری، اپنے دور کے نامدار محدث اور فقیہ تھے اور تمام علوم عربیہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ عمر بھر درس وافادہ میں مصروف رہے اور بے شمار علما وطلبا کو مستفید فرمایا۔ برصغیر کے اس عالم وفقیہ نے ۱۸ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ کو انتقال کیا۔ [۵۳]

۱۰۰۔ مفتی رکن الدین دہلوی

مفتی رکن الدین بن جمال الدین بن نصیر الدین بن سماء الدین دہلوی کی جائے ولادت دہلی ہے۔ اسی شہر میں تربیت پائی اور والدِ مکرم شیخ جمال الدین اور قاضی نور اللہ شستری لاہوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مسلکاً حنفی تھے اور فقہ واصول کے ماہر علما میں سے گردانے جاتے تھے۔ ۹۸۴ھ کو اپنے والد کی جگہ مسندِ افتا پر فائز ہوئے اور تمام عمر اس منصبِ بلند پر متعین رہے۔ [۵۴]

۱۰۱۔ شیخ رکن الدین سنامی گنوری

شیخ رکن الدین سنامی گنوری، شیخ مجد الدین طاہر محمد سنامی کی اولاد سے تھے۔ مولد ومنشا گنور رہے۔ حصولِ علم کی غرض سے مختلف مقامات کی خاک چھانی۔

---

۵۳ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۵۰ بحوالہ مرآۃ جہاں نما۔

۵۴ ایضاً، ج ۵ ص ۱۵۰، ۱۵۱۔

اور طویل سفر کیے۔ بہت سے علمائے وقت اور مشائخ عصر سے اخذِ علم اور کسبِ فیض کیا۔ بعد ازاں اپنے وطن واپس تشریف لے گئے اور درس و افادہ میں مصروف ہو گئے۔ تمام عمر ہنگامہ درس بپا کیے رکھا اور لاتعداد علما و طلبا کو دولت علم سے مستفید فرمایا۔

شیخ رکن الدین سنامی گنوری، نہایت نیک، متدین، عبادت گزار، قائم اللیل بزرگ تھے۔ اشراق تک مصروفِ عبادت رہتے، پھر درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے۔ زہد و تعبد میں بھی بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی کثیر الدرس اور کثیر الافادہ بھی تھے۔ اس ہندی عالم دین نے ۱۰۲۷ھ کو رحلت فرمائی[۵]

ز

۱۰۲۔ شیخ زین الدین اکبر آبادی

شیخ زین الدین اکبر آبادی کا سلسلۂ نسب یہ ہے: زین الدین بن منور بن نور اللہ بن معز الدین بن اللہ داد بن قاضی محمد شرعی اکبر آبادی۔ شیخ زین الدین کی جائے ولادت و تربیت اکبر آباد (آگرہ) ہے۔ علم و فضل کی گود میں نشوونما پائی۔ بچپن ہی میں حصول علم میں مشغول ہو گئے تھے۔ اکثر کتب درسیہ قاضی جلال الدین ملتانی سے اور بعض ملا مقیم سے پڑھیں۔ حصول علم کے بعد طبیعت ترک و تجرید اور علیحدگی و انزوا کی طرف مائل ہو گئی اور قناعت و عفت اور صلاح و تقویٰ کی زندگی بسر کرنے لگے۔ رؤسا و اغنیا سے حتّی الامکان دور رہنے اور ان کے ساتھ ملاقات سے جہاں تک ہو سکتا گریز کرتے تھے۔ اپنے دور کے جیّد عالم اور نامور فقیہ تھے۔

---

۵ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۵۱ بحوالہ اسراریہ

شیخ زین الدین اکبر آبادی نے ۷ رمضان ۱۰۰۵ھ کو اکبر آباد (آگرہ) میں وفات پائی اور اسی شہر میں اپنے زاویہ میں دفن کیے گئے۔[۱]

س

۱۰۳- حاجی سلطان تھانیسری

حاجی سلطان تھانیسری مشرقی پنجاب کے شہر تھانیسر میں پیدا ہوئے، وہیں پرورش پائی اور اپنے عصر کے اساتذہ سے حصولِ علم کیا، یہاں تک کہ فقہ، اصول اور عربی کے علومِ مروّجہ کے فاضل و شیخ اور ماہر گردانے گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حجاز تشریف لے گئے اور سعادتِ حج سے بہرہ اندوز ہوئے پھر واردِ ہند ہوئے تو ہندوستان کے بادشاہ جلال الدین اکبر سے تعارف و تقرب حاصل ہوا۔ اس نے ان کی علمی و تصنیفی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنے درباری علما میں شامل کر لیا۔ شیخ سلطان تھانیسری جس طرح علومِ عربیہ میں مہارت رکھتے تھے اسی طرح سنسکرت میں بھی انھیں عبور حاصل تھا۔ جب اکبر کو ان کے اوصافِ علمی کا پتا چلا تو انھیں مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔

مہابھارت سنسکرت زبان میں ہے۔ جو ایک ضخیم کتاب ہے اور ہندوؤں کے نزدیک مذہبی نقطہ نظر سے اسے مقدس اور مستند کتاب سمجھا جاتا ہے۔ حاجی سلطان نے چار سال میں اس کو فارسی زبان میں منتقل کر دیا — حاجی سلطان کا اس زمانے کا یہ لطیفہ منتخب التواریخ میں مرقوم ہے کہ جب یہ مہابھارت کا ترجمہ کر رہے تھے تو ایک شخص نے ان سے پوچھا:

ایں چیست کہ می نویسید۔؟

یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

---

[۱] اذکار ابرار ص ۴۱۳ — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۵۳

کہا :

حرفِ دہ ہزار سالہ را بزبانِ حال موافق می سازم۔

دس ہزار سال پہلے کی باتوں کو موجودہ زبان کے قالب میں ڈھال رہا ہوں۔

ایک دور ایسا آیا کہ ہندوؤں نے ان پر ذبیحہ گاؤ کا الزام عائد کیا، جسے اکبر نے ہندوؤں کے پاسِ خاطر سے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ بادشاہ کو یہ شکایت پہنچی تو وہ نہایت خشمگین ہوا، اکبر آباد (آگرہ) سے نکل جانے کا حکم صادر کیا اور جلاوطن کر کے سندھ کے شہر بھکر میں بھیج دیا۔ بھکر کی زمامِ ولایت بیرم خاں کے بیٹے عبدالرحیم خان خاناں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ان کے علم و فضل سے بہت متاثر تھا اور ان کی دل سے قدر کرتا تھا۔ بھکر میں وہ ان سے نہایت احترام سے پیش آیا اور ان کی طرف خصوصیت سے عنانِ توجہ مبذول کی۔ جب اس نے اسیر گڑھ کا قلعہ فتح کر لیا تو بادشاہ سے ان کی جلاوطنی ختم کرنے اور واپس بلانے کی سفارش کی۔ چنانچہ بادشاہ نے انھیں اپنے شہر تھانیسر میں سکونت پذیر ہونے کی اجازت دے دی اور تھانیسر اور کرنال کا منصب کروڑگیری عطا کیا۔ یعنی ان شہروں کے خراج کا تحصیل دار مقرر کیا۔ ۱۰۰۴ھ میں وہ اس منصب پر فائز تھے [1] یہ پتا نہیں چل سکا کہ وہ اس منصب پر کتنا عرصہ متعین رہے۔ ان کی تاریخ وفات کا علم بھی نہیں ہو سکا۔

۱۰۴۔ علامہ سلیمان کردی گجراتی

علامہ سلیمان ابو احمد کردی گجراتی، شیخ اور فاضل بزرگ تھے۔ حدیث اور فقہ کے ماہر علما میں سے تھے۔ کردستان سے ہندوستان آئے۔ یہ وہ زمانہ

---

[1] منتخب التواریخ ص — تذکرہ علمائے ہند، ص ۸۰ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۵۸، ۱۵۹۔

ہے جب کہ دہلی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی بساطِ تدریس بچھی ہوئی تھی اور علما و طلبا ان سے مستفید ہو رہے تھے۔ سلیمان کردی بھی ان کے حلقۂ درس میں داخل ہو گئے، ان سے حدیث اور فقہ کی کتابیں پڑھیں اور ان میں عبور حاصل کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد علاقہ گجرات کو اپنا مسکن قرار دیا اور وہاں درس و تدریس کی مسند آراستہ کی، جس سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔[۲]

ش

۱۰۵۔ مولانا شاکر محمد دہلوی

مولانا شاکر محمد بن وجیہ الدین (یا وجہ الدین) دہلوی گیارھویں صدی ہجری کے کبار علمائے حنفیہ میں سے تھے۔ اپنے دور کے فاضل اور شیخ تھے۔ شیخ عبدالعزیز حسن چشتی کی نسل سے تھے۔ مولد و منشا دہلی تھا اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے تلمیذ تھے۔ طویل عرصہ ان کی خدمت میں رہے اور علم و معرفت میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ پھر دہلی میں درس و تدریس کی مسند پر متمکن ہوئے۔ اس زمانے میں شہر دہلی میں علم و فضل اور تدریس و افادہ میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ شاہ جہان بادشاہ ان کی انتہائی تکریم کرتا تھا اور ان سے بے حد تعظیم سے پیش آتا تھا۔

اس ہندی عالمِ دین نے آخر شعبان ۱۰۶۳ھ کو وفات پائی۔[۱]

۱۰۶۔ ملا شاہ محمد بدخشی

ملا شاہ محمد بن ملا عبدی صوفی بدخشی سرزمین بدخشاں میں علاقہ رستاق کے ایک مقام ارکسال میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ بہت بڑے عالم و شیخ اور فقیہ تھے، اس لیے ملا کے عرف سے معروف تھے۔ یعنی لفظ "ملا" علم و فضل

۲؎ مرآۃ احمدی ص — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۵۹۔

۱؎ اسراریہ (کمال محمد سنبھلی) ص — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۶۲۔

میں کمال کی وجہ سے ان کے نام کا جزء بن گیا تھا۔ ۱۰۲۳ھ کو لاہور آئے۔ ان دنوں شیخ محمد میر لاہوری (یعنی میاں میرؒ) کا شہرۂ طریقت و تصوف عروج پر تھا۔ یہ لاہور آکر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلوک کی منزلیں طے کیں۔ جب تک میاں میر زندہ رہے، ملا شاہ محمد بدخشی نے ان سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔ ان کی وفات کے بعد عازم کشمیر ہو گئے اور کوہِ سلیمان پر مسجد اور خانقاہ تعمیر کی۔ ایک باغیچہ بھی وہاں لگایا۔ اس میں اقامت گزیں ہو گئے اور اپنے آپ کو وظائف و اوراد کے سپرد کر دیا۔ ایک روایت کے مطابق اپنے شیخ میاں میر کی زندگی ہی میں کشمیر چلے گئے تھے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ گرمیوں میں کشمیر رہیں گے اور سردیوں میں واپس لاہور آجائیں گے۔

کتب تاریخ میں مرقوم ہے کہ ہندوستان کا مغل حکمران شاہ جہان کشمیر جاتا تو بار بار ملا شاہ محمد بدخشی کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کے ملفوظات و اقوال سے استفادہ کرتا۔ شاہ جہان کا بیٹا دارا شکوہ ان کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا اور اس کی بیٹی جہاں آرا بیگم بھی ان کی عقیدت مند تھی۔ بالفاظ دیگر ہندوستان کا حکمران خاندان، ان سے کامل عقیدت رکھتا تھا اور ملک کے بعض اکابر و مشاہیر ان سے باقاعدہ استفاضہ کرتے تھے۔

ملا شاہ محمد بدخشی عارف باللہ اور صاحبِ حال بزرگ تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی جو نکاتِ تصوف پر مشتمل ہے اور نامکمل ہے۔ اس تفسیر کی بعض تعبیرات بڑی عجیب و غریب نوعیت کی ہیں۔ مثلاً قرآن مجید کی آیت:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۠ [۱] کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ اولیا سے متعلق ہے، اور اس

---

[۱] یہ سورہ بقرہ کی ساتویں آیت ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:
ان کے دلوں اور کانوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا۔ ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے اولیا کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تاکہ ان میں وساوس شیطانیہ اور افکارِ شیطانیہ داخل نہ ہو سکیں۔ ان کے کانوں پر بھی مہر ثبت کر دی ہے تاکہ غلط اور بے ہودہ باتیں ان میں راہ نہ پا سکیں۔ ان کی آنکھوں پر اپنی عظمت وکبریائی کے حسین وجمیل پردے لٹکا دیے ہیں اور ان کے لیے بہت ہی میٹھی اور پرحلاوت شراب مہیا کی گئی ہے۔

اس سالک وصوفی فقیہ اور عالم نے ۱۰۷۲ھ کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔[۳۹]

۱۰۷۔ مولانا شاہ محمد اخسیکتی

مولانا شاہ محمد اخسیکتی، عالم کبیر، شیخ وقت اور مشہور بزرگ تھے، اپنے عصر کے علمائے عرب وعجم سے تحصیل کی اور اساتذہ کی زندگی ہی میں ان کا شمار نامور ومعروف علما میں ہونے لگا۔ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد داخلِ ہند ہوئے اور گجرات (کاٹھیاواڑ) میں عرصہ تک درس وتدریس کی شمع روشن کیے رکھی۔ پھر مختلف بلادِ ہند کی سیر وسیاحت کے لیے روانہ ہوئے۔ اس اثنا میں مانڈو بھی گئے۔ وہاں قاضی جمال الدین ترکستانی کی صاحبزادی سے عقد کیا اور سات سال علما وطلبا کو درس دیتے رہے۔ اس دوران میں ان سے محمد بن حسن مانڈوی نے اصول فقہ کی کتابیں، الکشف، المنار اور تلویح پڑھیں۔ ان کے علاوہ خلقِ کثیر نے استفادہ کیا۔[۴۰]

---

[۳۹] شاہ جہان نامہ، ج ۳، ص ۳۶۴، ۳۶۵ — تذکرہ شعرائے کشمیر، ج ۱، ص ۲۲۶، ۹۴ — تحقیقاتِ چشتی ص ۲۲۴، ۲۲۵ — مفتاح التواریخ ص ۲۶۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۶۴، ۱۶۵ — فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۴۸۔

[۴۰] نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۶۵۔

۱۰۸۔ مفتی شرف الدین لاہوری

مفتی شرف الدین حنفی لاہوری، حنفی المسلک تھے اور نامور عالم و فقیہ تھے شیریں کلام، فصیح البیان اور حسن اخلاق کے مالک تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں لاہور کی مسندِ افتا پر فائز تھے جس پر پوری زندگی فائز رہے۔ ۱۰۸۷ھ کو بعہدِ عالم گیری وفات پائی ۵؎

۱۰۹۔ مولانا شمس الدین بروتوی جون پوری

مولانا شمس الدین کا سلسلۂ نسب یہ ہے: شمس الدین بن نور الدین بن عبد القادر بن زین الدین بن نظام الدین بن خیر الدین بن احمد بن جمال الدین بن تقی الدین صدیقی اودھی ثم بروتوی جون پوری۔ ان کا مولد و منشا بروتہ ہے جو اس زمانے میں اعمال جون پور میں ایک قریہ تھا۔ مولانا شمس الدین نے علما کی ایک جماعت سے تحصیل کی، اور اپنے دَور کے بہت بڑے عالم، شیخ اور فاضل ہوئے۔ ان کی شہرت علمی سے متاثر ہو کر بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر نے ان کو اپنے ایک بیٹے پرویز کا اتالیق مقرر کر دیا تھا۔ مدت تک الٰہ آباد میں سکونت پذیر رہے۔ پھر جون پور کے منصب قضا پر مامور کر دیے گئے، لہٰذا اپنے شہر ــ جون پور ــ واپس آ گئے۔ وہاں قضا کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا ــــ صاحب شمس البازغہ شیخ محمود جون پوری نے بھی ان سے بعض کتابیں پڑھیں۔ ان کے بھانجے شیخ محمد رشید جون پوری نے جو رشیدیہ کے مصنف تھے، ان سے شرح جامی، حاشیہ کافیہ مع شرح شیخ اللہ داد جون پوری مرفوعات کی بحث تک، قصیدہ بردہ، کچھ حصہ آداب الحنفیہ کا، کچھ حصہ حسامی کا، شرح وقایہ، ہدایہ اور تلویح وغیرہ کتابیں پڑھیں۔

۵؎ خزینۃ الاصفیا ص ۲۰۵۔ ــ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۶۵۔ ــ فرحۃ الناظرین (شخصیات)۔

شیخ رکن الدین بحری آبادی نے ان سے تمام کتب درسیہ کی تحصیل کی۔

مولانا شمس الدین بروتوی جون پوری نے ۱۰۴۷ھ کو وفات پائی اور جون پور میں اپنے مدرسہ کے احاطے میں دفن کیے گئے۔[۵۶]

۱۱۰۔ مولانا شہباز بھاگل پوری

مولانا شہباز بھاگل پوری کا سلسلہ نسب یہ ہے: شہباز بن محمد بن خیر الدین بن علی بن علی بن اسمٰعیل بن اسحاق بن سعدی بن یعقوب بن محمد بن مسعود بن احمد حسینی لاہوری ثم بھاگل پوری۔۔۔ شیخ کمال الدین حسینی ترمذی کی اولاد سے تھے۔ ۹۵۷ھ کو دیورہ میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں اعمالِ بہار میں ایک قریہ تھا۔ اپنے خسر شیخ محمد راہ دیوری سے علم حاصل کیا۔ پھر طبیعت مائل بہ تصوف ہوئی تو شیخ لیبین سلمانوی کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے اخذِ طریقت کیا۔ تیس سال کی عمر کو پہنچے تو دیورہ سے بھاگل پور منتقل ہو گئے۔ وہاں درس و تدریس کا مشغلہ اختیار فرمایا۔ یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور مولانا شہباز بھاگل پوری کے نام سے شہرت حاصل کی۔۔۔ بہت بڑے عالم و فاضل، فقیہ و شیخ اور عابد و زاہد تھے۔ وسعتِ علم میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ کثیر الفوائد عالمِ دین تھے۔ درس و افادہ میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے ہنگامۂ اشاعتِ علم نے ایک دنیا کو متاثر کیا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ مرض الموت میں بھی مصروفِ تدریس رہے۔ طلبا ارد گرد بیٹھے مشکوٰۃ پڑھ رہے تھے اور آپ حالتِ مرض میں نہایت انہماک و توجہ سے درس دے رہے تھے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر مشکوٰۃ کے درس سے فارغ ہوئے اور ادھر روحِ قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ جمعرات ۱۶ صفر ۱۰۵۰ھ کا واقعہ ہے۔ ایک روایت

---

[۵۶] تجلی نور، ج ۲، ص ۸۴، ۸۵ ــــ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۶۸، ۱۶۹ ــــ تاریخ شیراز ہند، جون پور، ص ۳۸، ۳۹، ۷ ــــ تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۶۷۔

کے مطابق ۱۰۶۰ھ کو وفات پائی لیکن پہلی تاریخِ وفات زیادہ قرینِ صحت اور لائق اعتنا ہے۔[۵۶]

۱۱۱۔ سید شیخ بن عبداللہ حضرمی

سید شیخ کا نسب نامہ یہ ہے۔ شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ عیدروس یمنی حضرمی۔ استاذِ وقت، عالم کبیر، محدثِ عصر، فقیہ نامدار، صوفی اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ ۹۹۳ھ کو موضع تریم میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور بعض دیگر علوم پڑھے۔ اپنے والدِ مکرم علامہ عبداللہ حضرمی کے سامنے تلمذ تہ کیا اور ان سے بہت سے علوم حاصل کیے۔ پھر دیگر علما سے استفادہ کرنے لگے۔ مشہور فقہائے عصر سے فقہ کی تحصیل کی۔ اخذِ علم کے لیے یمن، شحر، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، عدن وغیرہ مختلف بلاد و امصار کے مشاہیر اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کیا۔ کسبِ طریقت کے لیے بھی بعض مشائخ و صوفیا کے دروازے پر دستک دی۔ ۱۰۲۵ھ میں داخلِ ہند ہوئے اور بعض علما و شیوخ سے کسبِ علم اور اخذِ فیض کیا۔ پھر عازمِ دکن ہوئے، وہاں وزیر ملک عنبر اور سلطانِ دکن نظام شاہ سے ملاقات ہوئی، وہ ان کی علمی قابلیت اور فضل و کمال سے بہت متاثر ہوئے۔ وزیر اور سلطان مذکور نے انھیں بڑی عزت و تکریم اور وجاہت و عظمت سے نوازا۔ دکن میں تشنگانِ علوم کی بہت بڑی تعداد نے ان سے استفادہ کیا اور پورے ملک میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جانے لگے لیکن بعض حاسدوں کو اس سے بڑا دکھ پہنچا اور انھوں نے وزیر اور سلطان کے پاس جا جا کر شیخ کے بارے میں ایسی باتیں کہیں کہ شیخ وہاں سے نکل جانے پر مجبور ہو گئے۔

اب انھوں نے دکن سے رختِ سفر باندھا اور بیجاپور چلے گئے۔ بیجاپور

---

[۵۶] در منثور، ص ـــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۶۹

میں سلطان ابراہیم عادل شاہ داد حکمرانی دیتا تھا۔ وہ شیخ کی گفتگو اور علم و فضل سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے ان کی بے حد عزت افزائی کی اور انتہائی تعظیم سے پیش آیا۔ اپنے حدود مملکت میں ہر جگہ ان کے لیے قدر و منزلت کی فضا پیدا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جہاں گئے، تکریم و اکرام کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ سلطان ان کی اصابت رائے کا اس درجہ قائل تھا کہ ہر معاملے میں ان سے مشورہ لیتا اور ان کی رائے کے بغیر کوئی اہم قدم نہ اٹھاتا۔

سلطان ابراہیم عادل شاہ کے نزدیک شیخ کے زیادہ اکرام و اقبال کی وجہ، ان کی ایک کرامت تھی اور وہ کرامت یہ تھی کہ سلطان کی مقعد میں ایک زخم تھا، جس کی بنا پر اس کا آرام و راحت ختم ہوگیا تھا اور اٹھنے بیٹھنے میں سخت دشواری ہوتی تھی۔ اس کے علاج سے اطبا عاجز آگئے تھے۔ سید علی بن اسد اللہ گجراتی بیجاپوری المعروف بہ علی محمد (متوفی ۵ ذی القعدہ ۱۰۷۰ھ) نے کسی وجہ سے دعا کی تھی کہ اس کا زخم درست نہ ہو۔ مگر جب سید شیخ بن عبداللہ حضرمی بیجاپور آئے اور انھوں نے سلطان کو اس حالت میں دیکھا تو سیدھا بیٹھنے کا حکم دیا۔ سلطان اسی وقت بیٹھ گیا اور بالکل تندرست ہوگیا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سلطان ابراہیم شیعی المسلک تھا۔ شیخ اس کو تبلیغ کرتے رہے، حتیٰ کہ اس نے مسلک اہل سنت اختیار کر لیا۔ جب باشندگانِ ملک نے یہ دیکھا کہ سلطان کو شیخ سے عقیدت پیدا ہوگئی ہے تو وہ ان سے حسد کرنے لگے اور ان کے درپے آزار ہوگئے۔

شیخ موصوف نے بڑی عمدہ کتابیں جمع کی تھیں اور بے شمار مال و دولت اکٹھا کیا تھا، وہ اس مال سے حضر موت میں بلند و بالا عمارت تعمیر کرنا، باغات لگانا اور متعدد اوقاف قائم کرنے کے خواہاں تھے۔ مگر وقت نے ان کو مہلت نہ دی اور اس کے لیے جو رقم انھوں نے ارسال کی تھی، وہ سمندر میں غرق ہوگئی۔

شیخ موصوف سلطان ابراہیم عادل شاہ کی زندگی میں اسی کے پاس مقیم رہے،

اس کی وفات کے بعد دولت آباد تشریف لے گئے، وہاں کے وزیر فتح خان بن ملک عنبر نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو اپنے مقربین کی جماعت میں شامل کیا۔ وہ تا دمِ وفات یعنی ۱۰۴۱ھ تک نہایت احترام و اعزاز سے وہیں مقیم رہے ـــ ان کی قبر دولت آباد کے قرب و جوار میں رہے[8]

۱۱۲۔ مولانا شبیر محمد برہان پوری

مولانا شبیر محمد حسنی حسینی قادری برہان پوری شیخ اور عالم و فقیہ تھے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے ایام ولایت میں جب وہ ولایتِ دکن کے منصب پر فائز تھا، اس سے منسلک ہوئے اور سفر و حضر میں کبھی اس سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔ آخر عمر میں برہان پور میں سکونت پذیر ہو گئے تھے ـــ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے۔ ایک روایت کے مطابق یکم محرم ۱۰۹۰ھ کو اور ایک کے مطابق ۱۰۸۲ھ کو وفات پائی۔ قبر برہان پور میں ہے[9]

ص

۱۱۳۔ شیخ صبغۃ اللہ بیجاپوری

شیخ صبغۃ اللہ بن حبیب اللہ بن احمد بن خلیل بیجاپوری، بیجاپور ان کا مولد و منشا تھا۔ اپنے والدِ گرامی شیخ حبیب اللہ بیجاپوری سے اخذِ علم کیا اور اس دور کے عالم و فقیہ اور شیخ گردانے گئے۔ بعد ازاں طریقت سے لگاؤ پیدا ہوا تو کسبِ طریقت بھی والد ہی سے کیا اور طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہے، حتیٰ کہ مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ ۱۰۴۱ھ میں والد نے وفات پائی تو ان کی جگہ مسندِ مشیخت پر متمکن ہوئے

---

[8] النور السافر ـــ المشرع الروی ـــ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۷۱، ۱۷۲۔

[9] شاہ جہان نامہ، ج ۳ ص ۱۲۷ ـــ نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۷۲ ـــ تاریخ برہان پور ص ۱۴۲، ۱۴۳۔

اور عظمت و قبولیت سے نوازے گئے۔ شیخ صبغۃ اللہ نے ۲۰ رجب ۱۰۰۷ھ کو
بیجاپور میں انتقال کیا۔[1]

۱۱۴۔ مفتی صدر جہان پھانوی کیتھلی

مفتی صدر جہان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ صدر جہان بن عبد المقتدر بن شاہین بن عبد اللہ بن محمد بن سراج الدین بن تاج الدین بن علیم الدین بن کمال الدین حسینی ترمذی کیتھلی ثم پھانوی۔ موضع پھانی میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں قنوج کے قریب ایک گاؤں تھا۔ نشو و نما بھی وہیں ہوئی۔ کچھ بڑے ہوئے تو حصول علم کے لیے گھر سے نکلے۔ شیخ نظام الدین حسینی خیر آبادی اور دیگر علمائے عصر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ پھر شیخ عبد النبی گنگوہی کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور ان سے سندِ حدیث حاصل کی۔ ان ہی کی سعی و سفارش سے لشکرِ شاہی میں مسندِ افتا پر فائز ہوئے۔ پھر انھیں اکبری عہد میں ۹۹۴ھ کو حاکمِ توران کے پاس بھیجا گیا اور ہندوستان واپس آئے تو عہدۂ صدارت پر متمکن کیے گئے۔ دیارِ ہند کے فقیہ اور عالمِ دین تھے۔

ان کی وسعتِ علم کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بادشاہ ہند جلال الدین اکبر نے انھیں جہاں گیر کا اتالیق مقرر کیا اور جہاں گیر نے ان سے چالیس حدیثیں حفظ کیں۔ جب وہ خود سریر آرائے مملکت ہوا تو ان کے منصب میں اضافہ کر دیا۔ یہاں تک کہ چار ہزاری منصب کو پہنچے۔ قنوج کے نواح میں جہاں گیر نے انھیں جاگیر بھی عطا کی اور یہ اپنے عہدِ صدارت میں صرف پانچ سال کے عرصے میں اس درجہ انعام و اکرام سے نوازے گئے کہ ان سے پہلے پچاس سال کے عرصے میں کسی صدر کو یہ مقام نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک سو بیس سال تک زندہ رہے لیکن ہوش و حواس اور قوائے

---

[1] محبوب ذی المنن ص —

نزہۃ الخواطر، ج ۵، ص ۱۷۷، ۱۷۸۔

جسمانی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہر اعتبار سے بالکل صحیح سلامت تھے۔

خوش مزاج، با مذاق اور حسنِ طبع کے مالک، عالم دین تھے۔ شاعر بھی تھے لیکن بہت کم شعر کہتے تھے۔ جس زمانے میں اکبر بادشاہ دینِ حق سے منحرف اور علمائے حق سے ذہنی و فکری اعتبار سے دور ہو گیا تھا اور علماء کو جلا وطن اور دور دراز علاقوں میں چلے جانے کے احکام صادر کر رہا تھا، اس دور میں ایک روز صدر جہان نے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کسی دن مجھے بھی جلا وطن کر دیا جائے گا اور میرا شمار بھی ان لوگوں میں ہونے لگے گا جنھیں ملک بدر یا علاقہ بدر کیا جا رہا ہے۔

اس وقت نظام الدین ہروی بھی موجود تھے، انھوں نے صدر جہان کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو کہا۔ آپ نے بادشاہ کے حضور کبھی کلمۂ حق نہیں کہا۔ آپ کو بھلا کیوں جلا وطن کیا جائے گا۔

صدر جہان کے اشعار میں سے ایک شعر یہ ہے:

ہر تار زلفِ یار الٰہی بلا شود   وانگہ بہر بلا دلِ ما مبتلا شود

انھوں نے ایک سو بیس سال عمر پائی۔ ایک روایت کے مطابق ۱۰۲۰ھ کو اور ایک روایت کے مطابق ۱۰۲۷ھ کو فوت ہوئے۔ قبر موضع پہانی میں ہے۔[۲]

ض

۱۱۵۔ مولانا ضیاء الدین جون پوری

مولانا ضیاء الدین حنفی پھول پوری جون پوری تفسیر، حدیث اور دیگر علوم کے ماہر اور شیخِ وقت تھے۔ صاحب رشید یہ شیخ محمد رشید جون پوری (متوفی ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ) کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ دیگر علمائے عصر سے بھی تحصیل

---

[۲] سرو آزاد، ص — منتخب التواریخ ص ۲۶۲ — تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۲ — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۷۸، ۱۷۹

کی تھی)۔ بعد کو بحث و اشتغال کا سلسلہ ترک کر دیا تھا اور سنبھل چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شادی بھی وہیں کی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ غالباً ۱۰۰۷ھ کے بعد فوت ہوئے۔[1]

۱۱۶۔ شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی

شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی شیخ محمد غوث شطاری گوالیاری کے بیٹے تھے۔ صغر سنی ہی میں گجرات چلے گئے تھے۔ وہاں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ) کی مسندِ تدریس آراستہ تھی، ان کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ شیخ محمد بن طاہر پٹنی گجراتی (متوفی ۹۸۶ھ) کا سلسلۂ درس بھی جاری تھا، ان سے علم حدیث کی تحصیل کی اور دس سال ان کی خدمت میں رہے۔ وہیں ان کے والد شیخ محمد غوث گوالیاری (متوفی ۹۷۰ھ) نے ان کو خرقۂ خلافت بھیجا۔ والد کی وفات کے بعد ۹۷۰ھ ہی میں گوالیار کو مراجعت کی اور خاصا عرصہ وہاں مقیم رہے۔ پھر اکبر آباد (آگرہ) منتقل ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے پینتیس ۳۵ سال علم و معرفت کے نشر و ذیوع میں صرف کیے۔

منتخب التواریخ کے مصنف ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی سے ملاقات کی تھی اور اپنی کتاب (منتخب التواریخ) میں بڑے دلچسپ انداز سے اس ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے اور ان کا تعارف بھی کرایا ہے۔ لکھتے ہیں:

شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی شیخ محمد غوث کے جانشین ہیں۔ تصوف میں ان کا ایک خاص اندازِ بیان ہے جو صوفیا میں کم ہی کسی دوسرے کا ہوگا۔ ان کی مجلس میں ہمیشہ معرفت و حقیقت کے موضوع پر سلسلۂ گفتگو جاری رہتا اور مسئلۂ توحید سے متعلق باتیں ہوتیں۔ ان کے باطن کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کون سا

---

[1] تاریخ شیراز ہند جون پور، ص ۴۹۷، بحوالہ شگرف۔ ج ۲۔ ص ۹۹ —
نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۸۲، ۱۸۳

جذبہ اور داعیہ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے۔ پہلے پہل جب ان کے کمالات و فضائل کی شہرت پھیلی تو مجھے معلوم ہوا کہ اپنے باپ شیخ محمد غوث کی مسندِ فقر و ارشاد کے جانشین ہو گئے ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے تو باپ پر فضیلت رکھتے ہیں۔ شیخ ممدوح قرآن مجید کے حافظ تھے اور اس کی تفسیر و تشریح میں کسی تفسیر سے مدد لینے کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔۔۔ ۹۷۰ھ میں ان سے ملاقات کے لیے میں آگرہ گیا تو ان کے کسی واقف یا تعلق والے کو ذریعہ بنائے بغیر بے تکلفی سے جس کا میں مدت سے عادی تھا ان کے پاس پہنچ گیا اور السلام علیکم کہہ کر مصافحہ کیا۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ بزرگوں سے ملاقات کے لیے دنیوی تکلفات برتنے جائیں تو حصول مقصد میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔۔ لیکن ادھر حال یہ تھا کہ شیخ کی محفل میں تعظیم و تکریم کے خاص آداب و مراسم تھے جن کو ملحوظ رکھا جاتا تھا، لہٰذا ان کو میری یہ بے تکلفی اور سادگی پسند نہ آئی۔ یہ دیکھ کر اہل محفل نے مجھ سے پوچھا:

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا: "سہسوان سے!"

پھر سوال کیا: "کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟"

عرض کیا: "کچھ عرصہ ہوا، ہر فن کی کچھ نہ کچھ تحصیل کی تھی۔!"

اس کے بعد ملا عبد القادر لکھتے ہیں:

سہسوان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس زمانے میں شیخ ضیاء اللہ کے والد (شیخ محمد غوث) کا مرید قلیج جو کان بیگ جاگیردار وہاں مقیم تھا، اس لیے شیخ نے مجھے کوئی اہمیت نہ دی اور طنز و استہزا کرنے لگے۔ ایک مسخرے کو اشارہ کیا کہ باتوں باتوں میں مجھے ذہنی طور سے پریشان کر کے مجلس سے نکال دیا جائے لیکن میں مشائخ کی اس قسم کی اداؤں کو خوب جانتا تھا اور بارہا ایسے مواقع پیش آ چکے تھے لہٰذا میں ان کی اس نوع کی حرکتوں سے بظاہر انجان بنا رہا اور بدستور اپنی جگہ بیٹھا رہا۔۔۔
اب وہ مسخرہ زیادہ مذاق اور ہزل پر اتر آیا اور بولا۔

"کہیں سے عطر کی مہک آرہی ہے، جس سے میرا دماغ ابلنے اور جوش کھانے لگا ہے۔ اہلِ محفل ہوشیار رہیں، کسی کو میرے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔"

اس کے بعد وہ منہ سے جھاگ نکالنے لگا۔ یہ دیکھ کر شیخ کا ایک صوفی نما مصاحب مجھ سے مخاطب ہوا اور پوچھا:

"یہ اتنا عمدہ عطر کیا تم نے لگا رکھا ہے؟"

میں نے کہا: "ہاں! میں نے لگا رکھا ہے، لیکن بات کیا ہے؟"

اس نے کہا:

"یہ جو باؤلا شخص ہے، اس کو کسی زمانے میں کتے نے کاٹ کھایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب خوشبو سونگھ لیتا ہے تو اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتا ہے اور کتے کی طرح بھونکتے ہوئے لوگوں کو کاٹنے کو دوڑتا ہے، آپ ذرا ہوشیار رہیے۔"

اس سے حاضرینِ مجلس کچھ پریشان سے ہو گئے۔ شیخ بھی مجھے خوف زدہ کرنے کی غرض سے جان بوجھ کر کچھ دور ہٹ گئے اور اس طرح ان انسان نما شیطانوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ یہ حرکت دیکھ کر میں نے کہا:

"بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ اس بارگاہِ عالی پر لوگ دور دراز سے اپنی حاجت برآری کے لیے آتے ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ ایک سگ گزیدہ دیوانے کا علاج نہیں ہو سکتا۔"

انھوں نے کہا: "کیا تم اس کا علاج جانتے ہو؟"

میں نے کہا: "ہاں! جانتا ہوں۔"

پوچھا: "کیا علاج ہے؟"

میں نے جواب دیا: "اس کے سر پر ڈھیلے اور جوتے مارے جائیں تو یہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا، چنانچہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے۔ "سگِ دیوانہ را دارو کلوخ است۔" (باؤلے کتے کا علاج ڈھیلا ہے) پھر میں نے کہا۔ کلوخ ایک بوٹی کا نام بھی ہے، جو سگ گزیدہ کی ایک مؤثر دوا ہے۔"

شیخ نے جب دیکھا کہ یہ حیلہ کارگر ثابت نہیں ہوا تو کہا: "آؤ اللہ اور اس کے رسول کے ذکر میں مشغول ہو جائیں۔"

اب انھوں نے قرآن مجید کھولا اور سورۂ بقرہ کی ایک آیت کی تفسیر شروع کر دی اور ایسی باتیں کرنے لگے کہ جن کا اس آیت کے اصل مفہوم سے کوئی تعلق نہ تھا مگر ان کے جاہل شاگرد ہر الٹی سیدھی بات پر اٰمنّا وصدّقنا کے نعرے لگا رہے تھے میرا دل تو ان کی طرف سے پہلے ہی سے بھرا ہوا تھا، میں نے جان بوجھ کر شیخ کو ٹوک دیا اور پوچھا۔

"یہ مطلب جو آپ بیان کر رہے ہیں، قرآن کی کسی تفسیر میں بھی مرقوم ہے -؟"

بولے "میں تو یہ تاویل و اشارہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں، ویسے یہ مضمون بہت وسیع ہے۔"

میں نے کہا: "اچھا تو پھر بتائیے کہ یہ مطلب حقیقی ہے یا مجازی"؟

کہا: "مجازی"!

میں نے پھر سوال کیا: "ان دو (حقیقی اور مجازی) مطلبوں میں کون سا علاقہ ہے"؟

اس سوال سے میں نے ان کو علمِ بیان کی بحث میں الجھا لیا۔ اب وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے۔ جب میں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تو اپنی جگہ سے اکھڑ گئے، قرآن مجید رکھ دیا اور بولے:

"میں نے علمِ مجادلہ نہیں پڑھا ہے۔"

میں نے کہا: "آپ قرآن مجید کا ایسا مطلب بیان کر رہے ہیں، جو کسی تفسیر میں منقول نہیں ہے۔ لامحالہ آپ سے حقیقی اور مجازی مطالب کا باہمی ربط و علاقہ دریافت کیا جائے گا۔"

جب شیخ نے دیکھا کہ کسی طرح بات بنانا مشکل ہے تو گفتگو کا رُخ بدلا اور میرا حال احوال پوچھنا شروع کر دیا۔ میں نے ان ہی دنوں قصیدہ بردہ کی شرح لکھی

تھی، اس کا ایک باب ان کے سامنے رکھ دیا اور قصیدہ کے مطلع کے سلسلے میں جو نکات میرے ذہن میں محفوظ تھے، بیان کیے۔ شیخ نے بڑی تعریف کی اور خود بھی اس کے متعلق چند نکتے بتائے:

اس سے آگے ملا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ شیخ ضیاء اللہ اکبر آبادی سے پہلی ملاقات کا انداز تو یہ تھا۔ دوسری ملاقات اس وقت ہوئی، جب میں اکبر بادشاہ کے حلقۂ ملازمت میں داخل تھا اور شیخ موصوف بادشاہ کی دعوت پر تنہا عبادت خانۂ شاہی میں ٹھہرے ہوئے تھے اور حیران و پریشان تھے۔ ملا عبدالقادر بدایونی اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

جمعے کا دن تھا، بادشاہ دو آدمیوں کے ساتھ عبادت خانے میں گیا۔ اس نے میرزا غیاث الدین، علی اخوند، میرزا اخوند اور میرزا علی آصف خاں کو پہلے سے کہہ رکھا تھا کہ شیخ ضیاء اللہ کو بحث و تمحیص میں الجھا کر تصوف کے بارے میں کچھ باتیں دریافت کریں اور دیکھیں کہ شیخ علمی لحاظ سے کتنے پانی میں ہیں۔ چنانچہ میرزا علی آصف خان نے گفتگو کا آغاز کیا اور مولانا جامی کی لوائح کی یہ رباعی پیش کی:

گر در دل تو گل گزرد گل باشی ‌ ‌ ‌ ‌ در بلبل بیقرار بلبل باشی
تو جزئی و حق کل است اگر روزی چند ‌ ‌ ‌ ‌ اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

اور پوچھا:

"اللہ تعالیٰ کو "کُل" کس طرح کہا جا سکتا ہے، جبکہ وہ "جز" اور "کل" ہونے سے بالا و برتر ہے۔"

شیخ تباہ حالی اور پریشانی کے بعد دربار شاہی میں آئے تھے، ان کا غرور و پندار خاک میں مل چکا تھا اور بڑی مصیبتیں جھیل چکے تھے، نہایت عجز اور ندامت کی کیفیت طاری تھی، اس لیے دھیمے لہجے میں کچھ باتیں کیں جو کسی کی سمجھ میں نہ آئیں۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں:

صورتحال دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا اور جرأت کر کے کہا کہ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے

اس رباعی میں اگرچہ اللہ تعالیٰ پر "کل" ہونے ہی کا اطلاق کیا ہے لیکن ایک اور رباعی میں جزئیت بھی بیان کی ہے :

ایں عشق کہ ہست جزء لاینفک ما   حاشا کہ شود بہ عقل ما مدرک ما
خوش آنکہ دمد پرتوی از نور یقین   ما را برہاند از ظلام شک ما

لیکن اس "کل" اور "جزء" کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جزء ہو یا کل (ہمہ اوست) سب کچھ وہی ہے، اس کے علاوہ دوسرا کوئی وجود، حقیقت میں نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کی اصل حقیقت کو عبارت اور الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اس لیے اس کی تعبیر کبھی کُل سے کی جاتی ہے اور کبھی جزء سے کی جاتی ہے۔

اس سے آگے بدایونی لکھتے ہیں کہ پھر میں نے وحدت الوجود کو ثابت کرنے کے لیے مزید چند مسائل جن پر میں نے ان دنوں عبور حاصل کیا تھا، شیخ کی طرف سے تائیداً بیان کیے۔ میری اس تقریر سے بادشاہ بھی بہت خوش ہوا اور شیخ بھی بڑے محفوظ ہوئے۔

بہرحال شیخ ضیاء الدین اکبر آبادی ایک باوقار اور بارعب عالم تھے۔ اسلوبِ زندگی درویشانہ تھا، تفسیر، حدیث، تصوّف اور اقوالِ صوفیا اپنے خاص انداز میں بیان کرتے تھے، جس کا بعض دفعہ اصل الفاظ سے زیادہ تعلق نہ ہوتا۔ آگرہ اور اس کے گرد و نواح میں ان کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور عوام و خواص میں قبولیت حاصل تھی ـــ ۳ رمضان ۱۰۰۵ھ کو فوت ہوئے۔[۲۵]

ط

۱۱۷- علامہ طاہر سندھی برہان پوری

علامہ طاہر بن یوسف بن رکن الدین بن معروف بن شہاب الدین سندھی،

---

[۲۵] منتخب التواریخ کے علاوہ مآثر الامرا میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے۔

شیخ وقت اور عالم کبیر تھے۔ حدیث اور فقہ کے جید عالم تھے۔ دسویں صدی ہجری کی دوسری دہائی کے کسی سال میں سندھ کے ایک قریہ پاتری میں پیدا ہوئے، جو انہی کے جد بزرگوار کا آباد کردہ تھا۔ صغر سنی ہی میں اپنے والد — شیخ یوسف — اور بڑے بھائیوں — طیب اور قاسم — کے ہمراہ سفر کا اتفاق ہوا، اور شیخ شہاب الدین سندھی کی خدمت میں حاضری دی۔ شیخ سے منطق کی معروف کتاب شرح شمسیہ پڑھنا چاہی مگر شیخ نے اس کتاب کو اپنی طبیعت کے مطابق حال نہ سمجھ کر پڑھانے سے انکار کر دیا اور اس کے بجائے امام غزالی کی منہاج العابدین پڑھانے لگے۔ پھر ۹۵۰ھ میں عازم گجرات ہوئے اور شیخ عبدالاول بن علی حسینی جون پوری دہلوی سے علم حدیث کی تحصیل کی۔ کافی عرصہ ان کی صحبت میں گزارا اور ان سے سندِ حدیث حاصل کی۔ طریقت و تصوف میں شیخ محمد غوث گوالیاری سے استفاضہ کیا۔ بعد ازاں احمد آباد اور بلادِ دکن کا عزم فرمایا۔ وہاں شیخ ابراہیم بن محمد ملتانی سے اخذِ علم کیا۔ پھر ایلچ پور کی راہ لی اور ایک مدت تک وہاں اقامت اختیار کیے رکھی۔ وہاں سے عازم برہان پور ہوئے، اور اس تعلق کی بنا پر برہان پوری کہلائے۔

علامہ طاہر سندھی تصنیف و تالیف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے اور کئی کتابوں کے مصنف و مؤلف تھے جو حسب ذیل ہیں:

مجمع البحرین: قرآن مجید کی تفسیر ہے، جس میں صوفیا کے ذوق و مشرب کی جھلک نمایاں ہے۔

مختصر قوت القلوب للمکی: ابو طالب مکی کی قوت القلوب کا اختصار۔

منتخب مواھب اللدنیہ للقسطلانی: حافظ ابن حجر قسطلانی کی مواہب اللدنیہ کا انتخاب۔

مختصر تفسیر المدارک: قرآن مجید کی تفسیر المدارک کا اختصار، جو اپنے دو بیٹوں عبداللہ اور رحمت اللہ کے لیے کیا۔

تلخیص شرح اسماء رجال البخاری للکرمانی: شارح صحیح بخاری کرمانی کی

شرح اسماء رجال البخاری کی تلخیص۔

ملتقط جمع الجوامع للسیوطی۔

ریاض الصالحین: یہ ایک مفید کتاب ہے اور تین روضات پر مشتمل ہے۔ روضۂ اول احادیث صحیحہ کو محیط ہے۔ روضۂ ثانی مقالاتِ صوفیا کو محتوی ہے جن میں شیخ عبدالقادر جیلانی، امام غزالی، ابو طالب مکّی (صاحبِ قوت القلوب) شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ زین الدین خافی اور شیخ علی متقی ایسے اکابر صوفیا و علما شامل ہیں۔ روضۂ ثالث ملفوظاتِ اہلِ توحید کو متضمن ہے۔

ان کی تصنیفات میں مجمع البحرین قرآن مجید کی تفسیر ہے جو صوفیا کے اندازِ بیان کے مطابق ہے۔ یہ تفسیر عربی زبان میں ہے۔ ذیل میں اس کے ایک حصے کا اردو ترجمہ دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کے نہج و اسلوب کا پتا چل سکے۔

قرآن کی آیت فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ (ان منافقین کے دلوں میں بیماری ہے) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: مرض دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک حقیقی اور ایک مجازی۔ حقیقی مرض کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ جسم کو لاحق ہوجاتا ہے تو اس کو اعتدال و توازن کے دائرے سے باہر نکال دیتا ہے اور مریض کے افعال و حرکات میں خلل انداز ہوتا ہے۔ مرض مجازی اس کیفیت سے تعبیر ہے جو اعراضِ نفسانی کو پیش آتی اور ان کے کمال میں خلل ڈالتی ہے۔ مثلاً جہالت، سوئے عقیدہ، کج فہمی اور ترغیب معصیت وغیرہ۔ یہ تمام مجازی امراض ہیں، اس لیے کہ یہ چیزیں یا تو انسان کے حد فضائل تک پہنچنے میں مانع ہوتی ہیں۔ یا پھر اس کو حقیقی اور ابدی حیات کے زائل ہونے کی طرف کھینچ لے جاتی ہیں اور قرآن کی اس آیت میں یہی مجازی معنی مراد ہیں۔ کیونکہ منافقین کے ہاتھوں سے مدینہ منورہ کی جو سیادت نکل گئی تھی، وہ ہر وقت اس کے غم میں مبتلا رہتے تھے۔ اور یہ گویا ان کے دلوں میں ایک مرض تھا جو ہر لحظہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ پھر آئے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اثر و رسوخ کا جو دائرہ وسیع ہو رہا تھا اور آپ کی عزت و شان بڑھ رہی تھی، اس سے وہ حسد کرتے تھے اور ان کے

دل اس صورتِ حال سے سخت الم و تکلیف محسوس کرتے تھے۔ یوں سمجھیے کہ ان کے مرض یا الم کو اللہ تعالیٰ نے اور زیادہ کر دیا۔ جیسے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پھیلتے جاتے تھے اور آپ کی عزت و شان میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، اسی نسبت سے حضور سے اور آپ کے صحابہ کرام سے منافقین کی عداوت اور دشمنی بڑھتی جاتی تھی۔

اس سے آگے تفسیر رحمانی کے حوالے سے علامہ سندھی لکھتے ہیں کہ: فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ کا مطلب یہ ہے کہ منافقین کے دلوں میں قوتِ حکمیہ کی کمی اور قوتِ شہوانیہ کی کثرت ہے۔

بہر حال علامہ طاہر کی تفسیر مجمع البحرین خالص متصوفانہ اسلوب کی حامل ہے۔ اس میں امام غزالی کی احیاء علوم الدین اور دیگر کتبِ تصوف کے کثرت سے حوالے دیے گئے ہیں۔

علامہ ممدوح نے ۱۰۰۴ھ کو وفات پائی[1]

۱۱۸- شیخ طیب بلگرامی

شیخ طیب بن عبدالواحد حسینی واسطی بلگرامی اتوار کے روز ۹ ربیع الثانی ۹۸۶ھ کو پیدا ہوئے اور اپنے والد شیخ عبدالواحد سے علم حاصل کیا اور اونچے درجے کو پہنچے۔ بہت بڑے عالم، شیخِ وقت اور اللہ کے صالح بندے تھے۔ اکثر شیخ عبدالحق دہلوی کے پاس دہلی جاتے، مختلف مسائل میں ان سے مبادلۂ خیالات کرتے اور کتب درسیہ کے مشکل مقامات کے حل و توضیح میں ان سے مستفید ہوتے تھے۔ دیگر علوم کے ساتھ ساتھ تفسیر و فقہ میں بھی کامل مہارت رکھتے تھے، اس کا

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: اذکارِ ابرار ص ۴۲۶ تا ۴۳۳ — نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۸۵ تا ۱۸۹۔

اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تفسیر بیضاوی اور ہدایہ پر تعلیقات سپرد قلم کیں — نہایت نیک، عابد و زاہد اور متقی تھے۔ بدو شعور سے لے کر وفات تک کبھی ان سے نماز کا وقت فوت نہیں ہوا — ۵ ربیع الاول ۱۰۶۶ھ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے[۲]

۱۱۹۔ شیخ طیب بنارسی

شیخ طیب کا سلسلہ نسب یہ ہے: طیب بن معین بن حسن بن داؤد بن خلیل عمری بنارسی، یہ ارضِ ہند کے متقی اور پرہیز گار علما میں سے تھے۔ چھوٹی عمر ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور چچا نے اپنی گود تربیت میں لے لیا تھا۔ قرآن مجید اور رسالے کی ابتدائی کتابیں گھر میں پڑھیں، علم صرف اور علم نحو کی تکمیل شیخ نظام الدین بنارسی کے مدرسے میں کی۔ پھر جون پور کا قصد کیا، جس کو اس زمانے میں علم و فضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں شیخ نور اللہ بن طٰہٰ جون پوری کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے شرح وقایہ اور حسامی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ پھر اپنے وطن بنارس گئے اور شادی کی۔ تین سال وہاں رہے۔ بعد ازاں پھر جون پور کا عزم کیا اور فقہ و اصول کی بعض کتابیں پڑھیں۔ اس مرتبہ ایک سال جون پور میں قیام رہا۔ اب کے شیخ خواجہ کلاں بن نصیر الدین جھونسوی سے بھی ملاقات کی اور ان سے بیعت ہوئے۔ جون پور سے پھر بنارس گئے اور بعض امرائے حکومت کے حلقۂ ملازمت میں داخل ہو گئے۔ ایک عرصہ تک ملازمت کا سلسلہ جاری رہا، بعد ازاں اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور شیخ پورہ وغیرہ میں دس سال تک بعض علما و مشائخ سے استفادہ کرتے رہے۔ پھر بنارس گئے، کئی سال منڈواڈیہ میں بھی اقامت اختیار کیے رکھی۔ شیخ طیب بنارسی عابد و زاہد، متقی و متورع اور بلند اخلاق و خوش مزاج عالم

---

[۲] مآثر الکرام ص ۴۴ تا ۴۷ — نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۱۸۹، ۱۹۰۔

تقصار، ص ۲۰۰، ۲۰۱۔

دین تھے - امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بڑے تیز تھے - سلوک میں سلسلۂ قادریہ سے منسلک تھے اور اس ضمن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے شرف اجازہ حاصل تھا - ابتدا میں سماع بھی کرتے تھے لیکن بعد کو اسے ترک کر دیا تھا - رشیدیہ کے مصنف شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (متوفی ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ) شیخ یٰسین بن احمد بنارسی (ولادت ۱۰۲۲ھ) اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا -

اس عالم دین نے ۸ شوال ۱۰۴۲ھ کو وفات پائی اور منڈواڈیہ میں مدفون ہوئے[۳]

۱۲۰ - قاضی طیّب عباسی موی

قاضی طیّب کا سلسلۂ نسب یہ ہے - قاضی طیب بن قاضی قطب الدین محمد درویش بن محمد افضل بن عاشق محی الدین عباسی چریا کوٹی - قاضی طیب ، گیارھویں صدی ہجری کے برصغیر کے فقہائے حنفیہ میں سے تھے اور فتح پور کے منصب قضا پر متمکن تھے ، الٰہ آباد (یو - پی) سے دس میل دور ایک جگہ کو مسکن ٹھہرایا اور اسے تعمیر کیا - یہ وہی جگہ ہے جو مئو قاضی طیّب کے نام سے معروف ہے اور الٰہ آباد کے نواح میں ایک اچھا خاصا بارونق شہر ہے[۴]

ع

۱۲۱ - شیخ عباس برہان پوری

شیخ عباس بن نصیر الدین بن سراج محمد حنفی برہان پوری علم و معرفت میں مرتبۂ بلند پر فائز اور یگانۂ روزگار فقیہ تھے - مغل حکمران شاہ جہان ان سے بہت متاثر تھا اور انھیں دار السلطنت دہلی میں لے آیا تھا - وہ ان سے نہایت احترام و تکریم

---

۳ - نزہتہ الخواطر ، ج ۵ ص ۱۹۰ ، ۱۹۱ بحوالہ گنج ارشدی

۴ - نزہتہ الخواطر ، ج ۵ ص ۱۹۱

پیش آتا تھا اور اس کے نزدیک انھیں انتہائی قبولیت حاصل تھی۔ بعد ازاں بادشاہ نے انھیں اپنے شہر جانے کی اجازت دے دی تھی اور سب سے منقطع ہو کر گھر میں بیٹھ گئے تھے۔[1]

۱۲۲- شیخ عبدالاحد سرہندی

شیخ عبدالاحد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے والد تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب چھبیس واسطوں سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ ان کے آباو اجداد کے چند اسمائے گرامی یہ ہیں۔ شیخ عبدالاحد بن زین العابدین بن عبدالحی بن محمد بن حبیب اللہ بن رفیع الدین عمری سرہندی۔ حضرت شیخ اونچے مرتبے کے ہندی عالم و فقیہ تھے۔ مشرقی پنجاب کے ضلع پٹیالہ کے معروف شہر سرہند میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی۔ کچھ عرصہ وہیں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں گنگوہ گئے اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے استفادہ و استفاضہ کیا اور ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہونے کی درخواست کی انھوں نے انکار فرمایا اور علوم مروجہ و فنون متعارفہ کی تکمیل کا حکم دیا۔ واپس سرہند آئے اور حصولِ علم میں مشغول ہو گئے۔ یہاں تک کہ تمام علوم میں مہارت پیدا کی اور فتویٰ و تدریس کے قابل ہو گئے۔ لیکن ابھی علوم کی تکمیل نہ کر پائے تھے کہ شیخ عبدالقدوس انتقال فرما گئے۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف بلاد و امصار کا سفر کیا، مختلف مشائخ و علما سے ملے اور ان سے مستفیض ہوئے۔ بعد ازاں گنگوہ کا عزم فرمایا، اور شیخ عبدالقدوس کے لڑکے شیخ رکن الدین گنگوہی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ طویل عرصہ ان کی خدمت میں گزارا۔ ۹۷۰ھ کو شیخ نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا اور اپنے شہر سرہند واپس آ گئے۔ وہاں درس و افادہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۹۳ بحوالہ تحفۃ الکرام۔

شیخ عبدالاحد معقول و منقول میں ماہر اور فنون میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ بالخصوص فقہ، اصولِ فقہ اور تصوف میں یگانہ عصر تھے۔ چند کتابوں کے مصنف بھی تھے، جو اس دور کے مذاق کے مطابق تصوفانہ نوعیت کی حامل تھیں۔

شیخ عبدالاحد نے ۷ رجب ۱۰۰۷ھ کو اسی سال عمر پاکر سرہند میں وفات پائی۔[۲]

۱۲۳۔ علامہ عبدالباقی جون پوری

علامہ عبدالباقی بن غوث الاسلام صدیقی جون پوری، اپنے عصر کے شیخ اور جلیل القدر عالم تھے۔ منطق اور فلسفہ میں بالخصوص اس دور کے مشاہیر علما میں سے تھے۔ شمس البازغہ کے مصنفِ شہیر علامہ محمود جون پوری (متوفی ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ) کے شاگرد تھے۔

علامہ ممدوح کی وفات کے بعد جون پور کی مسندِ تدریس پر فائز ہوئے۔ اورنگ زیب عالمگیر ان کے علم و فضل سے اس درجہ متاثر تھا کہ اس نے بطور انعام ان کو ایک گاؤں عنایت کیا، جس کی جمع بندی کی آمدنی آٹھ یا نو سو روپے سالانہ تھی اور یہ اس دور کی بہت بڑی آمدنی تھی۔

علامہ عبدالباقی نے ماہ رمضان ۱۰۶۰ھ میں آداب الباقیہ کے نام سے فن مناظرہ کی مشہور کتاب شریفیہ کی شرح سپردِ قلم کی۔ اس کا آغاز: سبحانك يا مجيب دعاء المسلمين بلا مانع و معارض الخ... کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ شریفیہ کی ایک اور شرح بھی لکھی، جس کا نام ابحاث الباقیہ ہے۔ یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک علمی اور فنی کتاب ہے۔

ابحاث الباقیہ انھوں نے اپنے استاد علامہ محمود جون پوری کے حکم سے لکھی تھی، جیسا کہ اس کے

---

[۲] حالات کے لیے دیکھیے زبدۃ المقامات۔ اذکار ابرار۔ نزہۃ الخواطر ج ۵ ص وغیرہ

مقدمے میں وضاحت کی گئی ہے۔ اس میں شیخ محمد رشید جون پوری (متوفی ۹ رمضان، ۱۰۸۳ھ) کی فنِ مناظرہ کی معروف تصنیف رشیدیہ کے بارے میں بعض دقیق مباحث ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔

علامہ عبدالباقی جون پوری نے جلوسِ عالم گیری کے چودھویں سال وفات پائی، جو ۱۰۸۲ھ کے قریب ہے[۳]

۱۲۴۔ مولانا عبدالجلیل جون پوری

مولانا عبدالجلیل بن شمس الدین بن نورالدین صدیقی برونوی جون پوری متقی و متورع، عابد و زاہد، عالم و فقیہ اور شیخِ وقت تھے۔ ان کے والد مولانا شمس الدین نامور عالم تھے، جو اُن کے استاذ بھی تھے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالجلیل نے صاحبِ شمس البازغہ علامہ محمود جون پوری اور صاحبِ رشیدیہ شیخ محمد رشید جون پوری سے استفادہ کیا اور فحول علمائے عصر میں سے گردانے گئے۔ پھر درس و افادہ کی مسند آراستہ کی۔ تمام عمر خدمتِ تدریس میں صرف کر دی اور اس کے لیے کبھی روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا۔ ہمیشہ قناعت اور عفاف کی زندگی بسر کی۔ اس عالمِ دین نے ۸ شوال ۱۰۷۶ھ کو جون پور میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے[۴]

۱۲۵۔ مولانا عبدالجلیل لکھنوی

مولانا عبدالجلیل بن عمر صدیقی بیانوی ثم لکھنوی، شیخ صالح اور فقیہ زاہد تھے۔

---

[۳] تجلی نور، ج ۲ ص ۶۵، ۶۶ — تذکرہ علمائے ہند ص ۲۶۸ — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۱۹۵ — بزم تیموریہ ص ۲۵۱ — فرحت الناظرین (شخصیات) ص ۱۳۴ تا ۱۳۶۔

[۴] تجلی نور، ج ۲، ص ۷۶ — تاریخ شیراز ہند جون پور ص ۷۴۰، ۷۴۱ — نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۰۰۔

سلسلۂ تصوف و طریقت سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹ ربیع الثانی ۱۰۱۶ھ کو فوت ہوئے۔ ؎۵

۱۲۶- شیخ عبدالحق محدث دہلوی

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سرزمینِ برصغیر کے رفیع المرتبت محدث عظیم الشان فقیہ، جلیل القدر عالم دین اور رفیع المثال مصنف تھے۔ علوم و فنون کی تمام شاخوں پر کامل عبور رکھتے تھے۔ ارضِ ہند کے اس وحید العصر بزرگ کے حالات ہم قدرے تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ان کے آبا و اجداد اور خاندان کے کوائف بھی نظر و بصر کے زاویوں میں آسکیں۔

آغا محمد ترک

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اسلاف میں ایک بزرگ آغا محمد ترک تھے جو بخارا کے باشندے تھے اور اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں جب مغلوں نے وسط ایشیا میں بربریت کا مظاہرہ کیا اور آتش و خون کا کھیل کھیلا تو آغا محمد ترک نے وہاں کے حالات سے مایوس اور بد دل ہو کر اپنے ہم نوا ترکوں کی بڑی جماعت کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا اور اس ملک کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ اس طرح شیخ کے اجداد میں یہ پہلے شخص ہیں جو واردِ ہند ہوئے۔ اس زمانے میں تختِ ہند پر سلطان علاء الدین خلجی متمکن تھا۔ اس ضمن میں شیخ خود تحریر فرماتے ہیں:

جدِ بزرگ ما آغا محمد ترک بخاری از بخارا در زمانِ عظمت نشان سلطان محمد علاء الدین خلجی در دہلی تشریف آوردہ، وچوں درآں جا قبیلہ دار و سر قوم بودہ است، جماعۂ کثیر از اتراک کہ پیوند قرابت و رابطہ بیعت و خدمت بوی داشتند، نیز از وطن اصلی انتقال نمودہ در ملازمت او دریں دیار رسیدہ اند و بنظرِ عنایت و تربیت آں سلطان عالی مرتبت

؎۵ نزہۃ الخواطر، ج ۵ ص ۲۰۱ بحوالہ مراۃ الاسرار۔

درآمده، باقصی مراتب شوکت و عظمت رسیده[۶]

ہمارے اسلاف میں سے آغا محمد ترک بخاری اپنے وطن بخارا سے سلطان محمد علاء الدین خلجی کے عہد میں دہلی تشریف لائے، چوں کہ وہ بخارا میں ایک بڑے قبیلے کے فرد اور اپنی قوم کے سردار تھے۔ لہٰذا ترکوں کی ایک کثیر جماعت بھی جو ان سے تعلق قرابت اور رابطۂ بیعت رکھتی تھی، اپنے وطن سے منتقل ہوکر ان کی خدمت میں یہاں آگئی۔ یہاں وہ عالی مرتبت سلطان علاء الدین خلجی کی نظرِ عنایت اور التفاتِ خاص کے مستحق قرار پائے اور شوکت و عظمت کے اونچے مرتبے کو پہنچے۔

ہندوستان میں سلطان علاء الدین خلجی کے عہد کو انتہائی عروج کے عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہندی مسلمان اس کے دور میں علمی، سیاسی اور ثقافتی میدان میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ علمائے دین کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ آغا محمد ترک کو بھی اس نے اعلیٰ مراتب اور بلند مناصب سے نوازا۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے مل سکتا ہے کہ اس زمانے میں گجرات اور اس کی بعض بندرگاہوں پر حملے کی تیاریاں ہورہی تھیں، سلطان نے اس کی تسخیر کے لیے ایک فوج روانہ کی، جس میں سلطنت کے بڑے بڑے امرا شامل تھے۔ اس میں آغا محمد ترک کو بھی شامل کیا گیا۔ فتح کے بعد سلطان کے حکم سے آغا موصوف نے وہیں سکونت اختیار کرلی تھی۔ شیخ لکھتے ہیں:

ازبرائے تسخیر ممالکِ گجرات و فتح بنادرِ آں با جماعه از امرائے عالی شان متعین شده از استفاد و انصرام آں مہم بحکمِ سلطانی ہماں جا مخیم اقامت ساخت[۷]

وہ چیدہ چیدہ امرا کی ایک جماعت کے ساتھ ملک گجرات اور اس کی بندرگاہوں کی فتح پر متعین ہوئے اور اس مہم کے انتظام و انصرام کے لیے سلطان کے حکم سے وہیں اقامت گزیں ہوگئے۔

---

[۶] اخبار الاخیار، ص ۲۹۸، ۲۹۹۔

[۷] ایضاً ص ۲۹۹۔

آغا محمد ترک کو اللہ نے بہت سے مال ومنال سے نوازا تھا اور کثیر صلبی اولاد عطا کی تھی، جس کی تعداد ایک سو ایک بتائی جاتی ہے، ان کے ساتھ وہ گجرات میں شان و شوکت اور اطمینان وسکون کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن ناگہاں اللہ نے ان کو آزمائش میں ڈالا اور ان کی اولاد و احفاد میں سے سو افراد موت کی آغوش میں چلے گئے اور صرف ایک بڑا بیٹا زندہ رہا، جس کا نام ملک معز الدین تھا۔ شیخ فرماتے ہیں:

در اندک مدتے آں ہمہ بحکم قادر مختار رخت اقامت بدار القرار بردند، غیر یک پسر ملک معز الدین نام داشتہ است واکبر اولاد بود[۵]

بہت تھوڑی مدت میں ان کی تمام اولاد قادرِ مطلق کے حکم سے وفات پا گئی۔ بجز ایک بیٹے کے جس کا نام ملک معز الدین تھا، اور یہ ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔

یہ ان کے لیے ایک عظیم صدمہ تھا جس کے بعد ان کا گجرات میں رہنا ناممکن ہوگیا۔ چنانچہ اکلوتے بیٹے کو ساتھ لیا اور دہلی واپس آگئے، اور وہیں ۷ ربیع الثانی ۷۲۹ھ کو وفات پائی۔ باپ کی وفات کے بعد ملک معز الدین نے دہلی ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی[۶] ہندوستان میں یہ سلطان محمد تغلق (۷۲۵-۷۵۲ھ) کا عہد حکومت تھا۔

ملک موسیٰ

ملک موسیٰ، آغا محمد ترک کے پوتے اور ملک معز الدین کے بیٹے تھے۔ انھوں نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ہوش سنبھالا۔ فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۲ سے لے کر ۷۹۰ھ تک سینتالیس سال ہندوستان پر حکومت کی۔ اس کی وفات کے بعد سلطنت دہلی کی مرکزیت ختم ہوگئی اور اس کا جاہ و جلال تاریخ کے اوراق میں منتقل ہوگیا۔ کئی خود مختار سلطنتیں عالمِ وجود میں آگئیں اور سیاسی اعتبار سے

۵۔ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹

۶۔ ایضاً

انتشار و افتراق کا ایسا بے پناہ ریلا آیا کہ دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علمی مراکز کا بھی خاتمہ ہو گیا، جس کے نتیجے میں وہاں کے علما و مشائخ کی کثیر تعداد گجرات، بنگال، جون پور اور دیگر علاقوں میں منتقل ہونے پر مجبور ہو گئی۔ ملک موسیٰ بھی انقلاب کی زد میں آگئے۔ اور انھیں دہلی کو خیر باد کہہ کر ماوراء النہر کی راہ لینا پڑی۔ شیخ عبد الحق نے یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وی در فترات کہ بعد انقضائے عہدِ دولتِ فیروزی واقع شد باز بولایت ماوراء النہر رفتہ[۱۰]

فیروز شاہ تغلق کے عہد کے بعد جس سیاسی انتشار اور بدنظمی نے سر اٹھایا، اس سے کبیدہ خاطر ہو کر ملک موسیٰ ماوراء النہر چلے گئے۔

لیکن وہاں ملک موسیٰ زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکے۔ ۸۰۱ھ میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ اس کی فوج کے ساتھ پھر ہندوستان آگئے تھے۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تیمور نے ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے ماوراء النہر کے علما سے مشورہ کیا تھا اور ان کی خاصی تعداد اس کی معیت میں ہندوستان آئی تھی، جن میں صاحبِ ہدایہ شیخ برہان الدین مرغینانی کے پوتے بھی شامل تھے اور تیمور کے دربار میں شیخ احمد تھانیسری نے ان پر کچھ اعتراضات بھی کیے تھے۔ بہت ممکن ہے، ملک موسیٰ بھی علما کی جماعت کے ساتھ ہی تیمور سے وابستہ ہو گئے ہوں اور اسی سلسلے میں دہلی پہنچے ہوں۔ شیخ فرماتے ہیں:

در رکاب دولت مآب صاحب قرانِ اعظم امیر تیمور گورگان بدہلی قدم آوردہ، سلسلۂ آباو اجداد تازہ کردہ، قدم اقامت و استقامت محکم ساخت۔[۱۱]

صاحبِ قرانِ اعظم امیر تیمور گورگان کے ساتھ وہ دہلی آئے، اپنے بزرگوں کے سلسلے کا احیا

---

[۱۰] اخبار الاخیار، ص ۲۹۹

[۱۱] ایضاً

کیا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

شیخ فیروز

ملک موسیٰ کے کئی فرزند تھے، جن میں ایک شیخ فیروز تھے، جو اپنے خاندان میں خاص امتیاز کے حامل اور عمدہ شہرت کے مالک تھے۔ شیخ عبدالحق محدث نے اخبار الاخیار میں ان کی زندگی کے متعدد پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ اور بہترین الفاظ میں ان کا تعارف کرایا ہے۔ ان کے فارسی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

شیخ فیروز کی ذات میں بہت سے ظاہری، باطنی، وہبی اور کسبی فضائل جمع ہو گئے تھے سپاہ گری میں اپنے دور کی بے مثل شخصیت تھے اور فن حرب میں عدیم النظیر سلیقہ رکھتے تھے۔ علم، شعروشاعری، شجاعت وسخاوت، خوش طبعی وبذلہ سنجی، ظرافت، عشق الٰہی ومحبت خداوندی اور دیگر اوصاف حمیدہ میں کوئی ان کا عدیل نہ تھا۔ دولت وحشمت، جاہ ومرتبہ، عزت وعظمت میں مشہورِ روزگار تھے۔ غدوبتِ کلام وحلاوتِ لسان اور شعروظرافت کی ابتدا ہمارے خاندان میں ان ہی کی ذات سے ہوئی۔[۱۲]

شیخ فیروز جیسا کہ پہلے گزر چکا، بڑے بہادر اور جنگ جو تھے۔ وہ بہرائچ کی کسی جنگ میں شریک ہوئے اور مرتبۂ شہادت کو پہنچے۔ ان کا مدفن بھی وہی خطۂ ارض ہے۔ شیخ عبدالحق لکھتے ہیں کہ جن دنوں وہ جنگ کو جا رہے تھے ان کی بیوی حاملہ تھیں، اس نے شوہر کو روکنے کی کوشش کی تو جواب میں فرمایا:

از خدا خواستہ ام کہ آں فرزند نرینہ باشد واز وے اولاد بسیار شود، واو را وشمارا بخدا سپردیم۔ تا بعد ازیں مارا چہ پیش آید۔[۱۳]

میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ بیٹا ہو اور اس سے نسل چلے۔ اب میں اس کو اور تم کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں، نہ معلوم آئندہ مجھے کیا حالات پیش آئیں۔

---

۱۲ اخبار الاخیار، ص ۲۹۹، ۳۰۰

۱۳ ؍؍ ص ۳۰۰

شیخ فیروز کے محاربہ بہرائچ پر جانے سے کچھ عرصہ بعد ان کے بیٹے شیخ سعد اللہ پیدا ہوئے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے دادا تھے۔ شیخ فیروز ۸۶۰ھ کو شہید ہوئے۔

شیخ سعد اللہ

شیخ سعد اللہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، وہ ان تمام اوصاف سے متصف تھے جو ان کے شہید باپ — شیخ فیروز — میں پائے جاتے تھے۔ عمر کا ابتدائی زمانہ تحصیل علم میں گزرا، پھر سلوک و تصوف کی راہ میں چلے گئے اور عبادت و ریاضت کو مرکزِ توجہ ٹھہرالیا۔ ایک صاحبِ حال بزرگ شیخ محمد منگن کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ شیخ سعد اللہ کی عظمت و بزرگی کا یہ عالم تھا کہ سلطان سکندر لودھی ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھا۔

شیخ سعد اللہ کی نرینہ اولاد میں ان کے دو بیٹوں — شیخ رزق اللہ اور شیخ سیف الدین — نے علم و فضل کی دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی۔ باپ کی وفات کے وقت شیخ سیف الدین کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ شیخ عبدالحق محدث لکھتے ہیں کہ شیخ سعد اللہ وفات سے کچھ دن پہلے سحری کے وقت اپنے اس بیٹے (سیف الدین) کو مکان کے بالائی حصے میں لے گئے — اس سے آگے خود شیخ سیف الدین فرماتے ہیں:

وبعد ادائے تہجد مرا مقابلِ قبلہ ایستادہ کردند و گفتند، خداوندا تو می دانی کہ پسرانِ دیگر را تربیت کردہ واز ادائے حقوق ایشاں برآمدہ ام، ایں را یتیم می گزارم و بے کس۔ حق ایں ہنوز بر ذمۂ منست۔ ایں را بتو می سپارم، مربی و متولی امور او تو باش[۱۴]

نماز تہجد کے بعد مجھے (یعنی سیف الدین کو) قبلہ رو کھڑا کیا، اور کہا، اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں دوسرے لڑکوں کی تربیت سے فارغ ہو چکا اور ان کے حقوق سے عہدہ برآ ہو گیا۔ لیکن اس لڑکے کو یتیم و بے کس چھوڑ رہا ہوں۔ اس کے حقوق ابھی میرے ذمے باقی ہیں اس کو اب تیرے سپرد کرتا ہوں، تو ہی اس کی تربیت و حفاظت فرما۔

یہ الفاظ کہہ کر نیچے اتر آئے۔ (ایں بگفت و فرود آمد) چند روز بعد جمعے کے دن

---

۱۴ اخبار الاخیار، ص ۳۰۰، ۳۰۱

۲۲ ربیع الاول ۹۲۸ھ کو انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور ان کا یہ بیٹا آگے چل کر نہ صرف دہلی، بلکہ پورے ہندوستان کا ایک معزز و موقر انسان بنا۔ اس کے گھر میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شکل میں علم و فضل کا وہ آفتاب طلوع ہوا، جس کی روشنی سے دنیا کے تقریباً تمام حصوں میں علم و تحقیق کی روشنی پھیل گئی۔

شیخ رزق اللہ

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا ہے، شیخ سعداللہ کے بیٹوں میں سے دو بیٹے شیخ رزق اللہ اور شیخ سیف الدین علم و فضل کی دنیا میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ باپ کی طرح جذبۂ محبت الٰہی سے سرشار اور نہایت متقی تھے۔ دہلی کی عبادت و ریاضت کی رونقیں ان کے دم ہی سے وابستہ تھیں۔

مردم ایں شہر اتفاق دارند کہ دہلی عبارت ازیں برادران بود۔[۱۵]

اس شہر (دہلی) کے تمام لوگ اس پر متفق ہیں کہ دہلی ان ہی بھائیوں کے وجود سے تعبیر تھی۔

ان کی مجلسیں ذکر الٰہی کا مرکز تھیں۔ اللہ کی یاد کے سوا ان میں کسی چیز کا دخل نہ تھا۔ اس سلسلے میں شیخ عبدالحق کے الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں۔ فرماتے ہیں:

مجلسِ ایشاں از اول تا آخر شوق و گریہ و درد و محبت بود۔ نسبت شیخ رزق اللہ در سوز و گرمی چناں بود کہ آتشے در زیر خاکستر پنہاں می باشد، اندک کہ کاویدند ہمہ آتش برآید۔ و مثال والد ماجد چناں کہ آب از چیزے چکیدہ می ماند، ادنیٰ آزارے کہ باو رسید تراوید۔ بغایت رقیق القلب و سریع التاثیر بودہ اند۔[۱۶]

ان کی مجلس شروع سے آخر تک شوق و گریہ سے پُر اور درد و محبت سے مملو تھی۔ سوز و گرمی سے شیخ رزق اللہ کا تعلق یوں سمجھیے، جیسا کہ راکھ کے نیچے آگ دبی ہوئی ہو۔ جوں ہی

۱۵؎ اخبار الاخیار ص ۳۰۱۔

۱۶؎ ایضاً، ص ۳۰۵

اس کو ذرا کریدا، آتش بھڑک اٹھی لیکن ان کے برعکس والد ماجد (شیخ سیف الدین) کی کیفیت یہ تھی کہ جیسے کسی شے سے مسلسل پانی ٹپکتا رہے۔ ان کو اگر معمولی اذیت بھی پہنچتی تو فوراً آنسو بہنے لگتے۔ بدرجہ غایت رقیق القلب اور سریع التاثیر تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے عم محترم شیخ رزق اللہ کے حالات بطور خاص بیان کیے ہیں۔ وہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے فاضل تھے۔ تاریخ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور فارسی اور ہندی کے شاعر بھی تھے۔ فارسی میں مشتاقی اور ہندی میں راجن تخلص کرتے تھے۔ شیخ عبدالحق نے ان کے علم و مطالعہ کی وسعت کا واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

شیخ رزق اللہ مردے کامل و فاضل و عارف و از نوادر روزگار و از مردم سلف یادگار بود۔ جامع فضائل صوری و معنوی، و در مشرب عشق و محبت و سلامت عقل و وسعت حوصلہ و صبر بر مصائب و دوام حضور و استقامت احوال یگانۂ عصر بود[۱۷]

شیخ رزق اللہ مرد کامل، فاضل و عارف، نادر روزگار اور یادگار سلف تھے فضائل صوری و معنوی کے جامع تھے۔ مشرب عشق و محبت، سلامتی عقل و فہم، وسعت حوصلہ، مصائب آلام کو صبر سے برداشت کرنے والے اور استقامت و دوام حضور میں یگانۂ عصر تھے۔

اس ہمہ اوصاف موصوف عالم دین کی سن ولادت ۸۹۷ھ اور تاریخ وفات ۲۰ ربیع الاول ۹۸۹ھ ہے۔ بانوے (۹۲) سال عمر پاکر راہی ملک دوام ہوئے۔

شیخ سیف الدین

شیخ سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے والد تھے۔ ۹۴۰ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اس دور کے بہت سے علما و صوفیا سے فیض حاصل کیا۔ کوئی بڑے عالم دین تو نہ تھے البتہ نیکی و تدین، زہد و عبادت، شعر و شاعری اور ذکر و فکر میں بہت مشہور تھے۔ شیخ عبدالحق ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

۱۷۔ اخبار الاخیار، ص ۱۷۴۔

در شعر و فضیلت و قبولِ خاطر و ذوق و شوق و محبت و ظرافت و لطافت و بے تعلقی و وارستگی و طیبت قلب و حضورِ خاطر و ذکر لطائف و نکات و فہم دقائق و اشارت یگانۂ روزگار و افسانۂ دیار خود شد[۱۸]

شعر و شاعری، فضیلت و مقبولیتِ عامہ، ذوق و شوق، محبت و ظرافت، زہد و عبادت، پاکیزگیٔ دل، حضورِ قلب، لطائف و نکات، باریک بینی، دقتِ نظر اور نکتہ سنجی میں بے مثال تھے اور اس میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

نہایت مستغنی المزاج تھے اور دنیوی جاہ و جلال سے سخت نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ اکبری دور کے بعض علمائے عصر کو بادشاہ اور دنیا داروں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتے تو شدید ذہنی اذیت محسوس کرتے اور اللہ کے شکر گزار ہوتے کہ اتنا علم حاصل نہیں کیا، جتنا علمائے سُو نے کیا ہے، ورنہ ہو سکتا ہے ان کی بھی یہی حالت ہوتی جو ان علمائے دین کی ہے۔ شیخ عبدالحق ان کے اس تاثر کو خود ان کی زبانی بیان کرتے ہیں:

چوں مشاہدہ کردہ می شود کہ علما و فضلا در طلبِ جاہ و عزت و کثرت اسباب و جمعیت اموال و نزاع و خصومت کہ با خلق می رفتند، مرا شکرانہ آید بر آں کہ بسیار نخواندیم و اکابر نشدیم[۱۹]

جب میں دیکھتا ہوں کہ اس دور کے علما و فضلا عزت و جاہ کے حصول میں زیادہ سے زیادہ مال و دولت سمیٹنے میں اور خلقِ خدا سے نزاع و خصومت میں مصروف ہیں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے زیادہ علم حاصل نہیں کیا اور بڑے لوگوں میں میرا شمار نہیں ہوتا۔

شیخ سیف الدین شاعر بھی تھے اور سیفی تخلص کرتے تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی شیخ سیف الدین کی زندگی کے آخری دور کا تذکرہ کرتے

۱۸؎ اخبار الاخیار، ص ۳۰۱

۱۹؎ ایضاً ص ۳۰۲

ہوئے لکھتے ہیں کہ شیخ اپنی حیات مستعار کی آخری علالت کے دنوں میں کچھ ایسی کیفیت سے دوچار ہوئے کہ ان پر خوف و دہشت کا غلبہ طاری ہوگیا اور وہ پریشان سے رہنے لگے۔ جب قرآن کی کوئی ایسی آیت سنتے جو اللہ کی رحمت و رأفت کے مضمون پر مشتمل ہوتی تو چہرے پر مسرت کے آثار نمودار ہوجاتے۔ شیخ عبدالحق ان کے سامنے بلند آواز سے قرآن کی آیات تلاوت کرتے اور وہ سن کر نہایت خوش ہوتے۔ ایک مرتبہ رات کو سعادت مند بیٹے نے یہ آیت تلاوت کی :

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ [۲۰]

یہ آیت سن کر شیخ نے اظہار مسرت کیا اور بیٹے کو بہت دعائیں دیں۔ شیخ عبدالحق اس رات کی دعاؤں کے بارے میں لکھتے ہیں :

امیدوارم کہ مراد عائے آں شب سرمایۂ دنیا و آخرت شود۔ انشاء اللہ تعالیٰ [۲۱]

میں امید رکھتا ہوں کہ اس رات کی دعا میرے لیے دنیا اور آخرت کا سرمایہ ہوگی۔

وقت رحلت قریب آیا تو مندرجہ ذیل کلمات و اشعار تحریر کرکے کفن کے ساتھ رکھنے کی ہدایت کی، اس لیے کہ ان میں اللہ سے عفو و مغفرت کی التجا کی گئی ہے اور اپنی بے عملی اور بے بسی کا اظہار کیا گیا ہے :

دارم دلکے غمیں بیامرز کہ مپرس — صد واقعہ در کمیں بیامرز و مپرس
شرمندہ شوم اگر بپرسی عملم — اے اکرم الاکرمین بیامرز و مپرس

ان کے علاوہ دو شعر یہ ہیں :

۲۰؎ یہ آیت سورہ حٰمٓ السجدہ کی تیسویں آیت ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے :
جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے (یعنی توحید کا اقرار کیا) پھر اس پر جمے رہے، ان پر (رحمت کے) فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں) تم نہ تو ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور جس بہشت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اس کی خوشی مناؤ۔

۲۱؎ اخبار الاخیار ص ۳۰۸۔

قدمنت علی الکریم بغیر زاد　　من الحسنات والقلب السلیم

فحمل الزاد اقبح کل شئ　　اذا کان القدوم علی الکریم ۲۲

قبر میں منکر و نکیر کے جواب کے لیے یہ الفاظ لکھنے کا حکم دیا:

ربی اللہ — ودینی الا[illegible] — ونبی محمد — وشیخی الشیخ عبد القادر الجیلانی۔

وفات کے وقت خوف و خشیت کی کیفیت ذوق و شوق میں بدل گئی تھی۔ عصر کا وقت تھا اور شیخ عبد الحق مسجد میں تھے، انھیں مسجد سے بلایا گیا تو چہرے پر فرحت و طرب اور تازگی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فرمایا:

بابا! بدانکہ مارا اکنوں اصلاً رنجے و محنتے و کوفتے نیست۔ شوق در شوق در طرب در طرب است، ہر زحمتے و بیماری کہ در بدنِ ما بود بدر رفتہ است، ولیکن ترا باید کہ مشغول شوی و دعا کنی کہ مرا زود ازیں جا بردارند۔ مرا مطلوبے کہ در تمام عمر بود، دست دادہ است مبادا باز ایں حالت نماند۔ دائم دعا می کردم کہ آخر دم دریاد خودداری و لشوق و ذوق ازیں جا بری۔ اکنوں جمال ایں مراد باحسن وجوہ جلوہ گر شدہ است۔ اگر ہم دریں حالت پیش خود طلبد کمال لطف و عنایتِ او باشد ۲۳

بابا! جان لو کہ مجھے اس وقت بالکل کوئی رنج و فکر نہیں ہے، بلکہ شوق پر شوق اور خوشی پر خوشی طاری ہے۔ جو بھی تکلیف اور بیماری میرے بدن میں تھی، چلی گئی ہے۔ تم کو چاہیے کہ مشغول ہو کر یہ دعا کرو کہ اللہ مجھے جلد یہاں سے لے جائے۔ تمام عمر جو میرا

---

۲۲ ان دو عربی شعروں کا ترجمہ یہ ہے:

میں کریم کے دربار میں بغیر کسی خرچ اور توشے کے حاضر ہوا ہوں۔ نہ نیکیاں پاس ہیں اور نہ قلب سلیم۔ مگر توشہ اور خرچ ساتھ لے جانا اس صورت میں نامناسب بات ہے جب کہ ایک کریم اور بدرجہ غایت سخی کے پاس جانا مقصود ہو۔

۲۳ اخبار الاخیار، ص ۳۰۹

مطلوب تھا۔ اب حاصل ہو گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہاتھ سے جاتا رہے۔ میں عمر بھر اللہ سے دعا کرتا رہا کہ آخر وقت میں ذوق و شوق کے ساتھ اس دنیا سے لے جائیو۔ اب اس مراد کا جمال ہزاروں حسن کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ اگر وہ اس حالت میں اپنے سامنے بلا لے گا تو اس کا انتہائی لطف و کرم ہو گا۔

شیخ سیف الدین نے ۲۷ شعبان ۹۹۰ھ کو وفات پائی[۱۲۵]

یہ ہے شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے آباؤ اجداد کا مختصر تعارف اور ان کی علمی و عملی زندگی کا مجمل سا تذکرہ۔ اب خود شیخ عبدالحق کے حالات و سوانح ملاحظہ فرمائیے۔

شیخ عبدالحق دہلوی کی ولادت

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اسلام شاہ سوری کے عہد میں محرم ۹۵۸ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید محمد جون پوری کی مہدوی تحریک زوروں پر تھی اور علمائے دین ان کے مذہبی افکار و تصورات کے بارے میں مختلف الخیال تھے۔ بعض حضرات ان کی تکفیر و تضلیل کر رہے تھے، بعض ان کو برسرِ حق ٹھہراتے تھے اور کچھ لوگ ان کے بارے میں خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔

اس زمانے کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہدوی تحریک ایک اصلاحی دینی تحریک تھی۔ اس کے بانی سید محمد جون پوری کا مقصد احیائے شریعت، قیام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔ اس زمانے میں جو بدعات اور محدثات پھیلی ہوتی تھیں اور جن منکرات اور خلافِ شرع امور کا زور تھا، ان کی جڑ کاٹنا اس کا بنیادی مقصد تھا۔ لیکن بعد کو اس کے غالی متبعین کے غلو کی وجہ سے اس کے بنیادی مقاصد میں زبردست تبدیلی پیدا ہو گئی اور خود یہی لوگ منکرات و محدثات کا شکار ہو گئے۔ تفصیل کا یہ محل نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ شیخ عبدالحق کی ولادت اس زمانے

---

[۱۲۵] اخبار الاخیار، ص ۳۱۰

میں ہوئی، جب ہندوستان یا تو مختلف رجحانات کی آماجگاہ بن چکا تھا یا ان کی ذہنی و فکری طور پر پرورش کے اسباب پیدا ہو رہے تھے، جن میں ایک رجحان سید محمد جون پوری کی مہدوی تحریک کی شکل میں ارضِ ہند میں نمایاں طور سے ابھر ہوا نظر آتا ہے۔

ابتدائی تعلیم و تربیت

شیخ عبد الحق کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور ذہنی نشوونما اپنے والد ماجد شیخ سیف الدین کی آغوش میں ہوئی۔ شیخ خود فرماتے ہیں۔

شب و روز در کنارِ مرحمت و جوارِ عنایت ایشاں تربیت می یافتم [۳۵]

میں رات دن ان کی آغوشِ عاطفت میں تربیت حاصل کرتا تھا۔

سب سے پہلے شیخ سیف الدین نے اس زمانے کے رواج کے مطابق بیٹے کو قرآن مجید پڑھانا شروع کیا۔ باپ سبق لکھتے تھے اور بیٹا پڑھتا تھا۔ چند روز بعد ذہین بیٹا اس قابل ہوگیا کہ خود ہی قرآن مجید پڑھنے لگا۔ معمول یہ تھا کہ پہلے خود قرآن کا کچھ حصہ پڑھتے اور بعد میں استاذ کو سنا دیتے۔ اس طرح دو تین مہینے میں پورا قرآن مجید ختم کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ والد بیٹے کو بزرگانِ دین کے اقوال و افعال سے بھی آگاہ کرتے اور بچے کی ذہنی سطح کے مطابق اس کو تصوف و طریقت کے بعض پہلوؤں سے متعلق بھی واقفیت بہم پہنچاتے۔ بہت ہی کم مدت میں کتابت و انشا کا سلیقہ بھی پیدا ہوگیا تھا۔ انھوں نے اس ہونہار بیٹے کو ابتدائی تعلیم خود ہی دینا شروع کی تھی۔ فارسی نظم و اشعار کی ان کتابوں میں سے مروج تھیں خود شیخ عبد الحق کے بقول شاید بوستان، گلستان کے چند اجزا اور دیوان حافظ پڑھایا ہو — پھر بچپن ہی میں قرآن مجید ختم کرنے کے بعد میزان الصرف سے مصباح اور کافیہ تک کتابیں پڑھائیں۔ شیخ کی ذہانت و قابلیت کے جوہر عالمِ طفولیت میں ہی نمایاں ہونے لگے

---

[۳۵] اخبار الاخیار ص ۳۱۰

تھے، جس سے خوش ہو کر شیخ سیف الدین کہا کرتے تھے:

انشاء اللہ تو زود دانشمند شوی [۲۶]

انشاء اللہ تم جلد ہی عالم ہو جاؤ گے۔

شیخ سیف الدین نے تمام تر توجہ بیٹے کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دی تھی اور ہر وقت یہی شوق اور جذبہ ان کے دل میں موجزن رہتا تھا کہ میرا یہ بیٹا جلد از جلد عالم دین ہو جائے اور علم و فضل میں درجۂ کمال کو پہنچے۔ بیٹے سے کہا کرتے تھے۔

مرا حظے عجیب دست دہد بتصور آں کہ حق تعالیٰ ترا بکمالے کہ من خیال کردہ ام برساند [۲۷]

مجھے اس سے نہایت خوشی ہوتی ہے، جس میں یہ تصور کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس مرتبۂ کمال کو پہنچا دے جو میں اپنے نہاں خانۂ خیال میں چھپائے ہوئے ہوں۔

شیخ سیف الدین تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو بہت سی نصیحتوں سے بھی نوازتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ بے مقصد بحث مباحثے سے گریز کرو اور صرف حصولِ علم کو اپنا مطمح نظر ٹھہراؤ۔ اگر کوئی صحیح بات کہے تو اسے فوراً تسلیم کر لو۔ اگر کوئی تمھاری بات نہیں مانتا تو اس سے جھگڑا نہ کرو۔ بس دو ایک مرتبہ بات سمجھا کر خاموش ہو جاؤ۔ شیخ کی یہ نصیحت کس درجہ عمدہ ہے، اس کا اندازہ ان کے اصل الفاظ سے ہوتا ہے:

باید کہ با ہیچ کس در بحث علم نزاع نہ کنی، و بہ کلفت نرسانی۔ اگر دانی کہ حق بجانب دیگر است قبول کنی، و اگر نہ، دو سہ بار بگو، اگر قبول نکنند بگو کہ بندہ را چنیں معلوم است آں نوع نیز تواند بود کہ شما می گوئید، نزاع برائے چیست [۲۸]

تمہیں چاہیے کہ علمی بحث میں نہ کسی سے جھگڑا کرو اور نہ کسی کو تکلیف پہنچاؤ۔ اگر یہ سمجھو کہ دوسرا حق بجانب ہے تو اس کی بات مان لو اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کو دو تین بار سمجھاؤ۔ اگر وہ نہ مانے تو کہو مجھے تو یہی معلوم ہے، ممکن ہے جو تم کہتے ہو، وہی صحیح ہو

۲۶۔ اخبار الاخیار، ص ۳۱۱

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ ایضاً ص ۳۱۰

جھگڑا کس بات کا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایک تو خود نہایت ذہین اور طباع طالب علم تھے۔ دوسرے ان کے والد انھیں ہر وقت طلب علم کا شوق دلاتے اور کسی دوسری طرف ان کا ذہن ملتفت نہ ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنی تصنیف اخبار الاخیار میں اپنے طالب علمی کے دور کی کہانی تفصیل سے بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھ لی تھی۔ پندرہ سولہ سال کو پہنچے تو مختصر معانی اور مطول سے فارغ ہو چکے تھے، اٹھارہ سال کی عمر کے ہوئے تو علوم عقلی و نقلی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس کی سنبیر نہ کر چکے ہوں ـــــ وہ لکھتے ہیں کہ میرے والد (شیخ سیف الدین) فرمایا کرتے تھے کہ ہر مروجہ علم میں سے مختصر طور پر پڑھ لو گے تو کافی ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد تم پر برکت اور سعادت کے دروازے کھل جائیں گے اور بلا تکلف تمام علوم حاصل ہو جائیں گے۔ ان کے اس ارشاد کا اثر یہ ہوا کہ نہایت مختصر مدت میں تیزی کے ساتھ تحصیل علوم کی منزلیں طے ہو گئیں۔ یعنی مختصرات نحو مثلاً کافیہ، لب اور ارشاد وغیرہ کا کوئی حصہ یاد کرتے تو اس کے شروح و حواشی پڑھنے کے لیے طبیعت بے چین ہو جاتی۔ مطالعہ اس احتیاط اور محنت و شوق سے کرتے کہ تمام مطالب کتاب ذہن کی گرفت میں آجاتے اور مزید سمجھنے کے لیے استاد کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ فرماتے ہیں، اکثر ایسی کتابیں بھی پڑھ ڈالتا، جو نصاب میں داخل نہ تھیں۔ جو کتاب ہاتھ آجاتی اول سے آخر تک پورے غور اور توجہ سے پڑھتا۔ میرا مطلب محض معلومات کا حصول اور علم میں اضافہ کرنا تھا۔[۲۹]

شیخ کی تمام تر دلچسپیوں کا مرکز حصولِ علم تھا۔ کھیل کود اور دیگر غیر علمی امور سے ان کو زندگی کے کسی دور میں کبھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حتیٰ کہ حصولِ علم کے مقابلے میں آرام و راحت اور کھانے پینے کی بھی کوئی پرواہ نہ رہی تھی۔ اس ضمن میں ان کے

---

[۲۹] اخبار الاخیار، ص ۳۱۱، ۳۱۲

اپنے الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں :

ازابتدائے ایامِ طفولیت نمی دانم کہ بازی چیست، و خواب کدام و مصاحبت کیست، و آرام چہ و آسائش و سیر کجا۔

شبِ خواب چہ و سکوں کدامست   خود خواب بعاشقاں حرامست

ہرگز در شوقِ کسب و کار، طعام بوقت نخوردہ و خواب درمحل نبردہ [نمبر ۳]

شیخ کے ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے :

میں بچپن ہی سے یہ نہیں جانتا کہ کھیل کود کیا شی ہے؟ نیند کیا ہے اور کسی کے ساتھ چلنا پھرنا کیا ہوتا ہے؟ آرام کے کیا معنی ہیں؟ آسائش کا کیا مطلب ہے اور سیر کیسی ہوتی ہے؟ تحصیل علم کے غلبۂ شوق کی بنا پر کھانا کبھی وقت پر نہیں کھایا اور نیند بھر کر کبھی نہیں سویا۔

اس سے آگے شیخ نے حصولِ علم کے بارے میں اپنے بے پناہ شوق اور نظامِ اوقات کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ذیل میں ان کے الفاظ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :

میں جاڑے کی ٹھنڈی ہوا اور گرمی کے جھلسا دینے والے جھونکوں میں گھر سے روزانہ دو مرتبہ دہلی کے مدرسے میں جاتا تھا جو ہمارے مکان سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہوگا۔ دوپہر کو تھوڑی دیر گھر میں قیام کے دوران ضرورتاً چند لقمے کھا لیتا۔ . . . میرے والدین بہت کہتے تھے کہ تھوڑی دیر کے لیے محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل لو اور وقت پر سو جاؤ۔ میں کہتا تھا، آخر کھیلنے سے مقصد دل کو خوش کرنا ہی تو ہے۔ میری طبعیت اس سے خوش ہوتی ہے کہ کچھ پڑھوں یا لکھوں۔ عام طور پر ماں باپ بچوں کو پڑھنے اور مکتب جانے کی تاکید اور تنبیہ کیا کرتے ہیں، لیکن اس کے برعکس مجھے کھیل کود کی ترغیب دیتے تھے۔ کبھی مطالعے کے دوران میں ایسا بھی ہوتا کہ نصف رات گزر گئی ہے۔ میرے والد نے آواز دی، بابا! کیا کرتے ہو؟ میں سنتے ہی فوراً لیٹ جاتا کہ مبادا جھوٹ نہ بول بیٹھوں، اور کہتا، میں سوتا ہوں۔ آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔؟ جب وہ مطمئن ہو جاتے تو پھر اٹھ بیٹھتا اور مشغولِ مطالعہ

[نمبر ۳] اخبار الاخیار، ص ۳۱۲، ۳۱۳۔

ہوجاتا۔[۳۱]

شیخ نے چھوٹی عمر میں سال، سوا سال کی محنت سے قرآن مجید بھی حفظ کر لیا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں علوم نقلی و عقلی پر عبور حاصل کر لیا تھا اور کتابت و انشا پردازی میں بھی مہارت پیدا کر لی تھی۔ ان کی عادت تھی کہ جو کتابیں اور ان کے شروح و حواشی ان کی نظر سے گزرتے انھیں باقاعدہ ضبطِ کتابت میں لے آتے۔ ان کا معمول تھا کہ رات کا زیادہ اور دن کا تھوڑا حصہ مطالعہ میں گزارتے اور رات کا تھوڑا اور دن کا زیادہ حصہ لکھنے میں صرف کرتے۔

اس کے علاوہ عبادت و ریاضت اور تہجد و شب خیزی کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ یعنی ایک طرف اگر شہراہِ علم و مطالعہ پر گام زن ہیں تو دوسری طرف طریقت و تصوف کی دشوار گزار وادیوں کو بھی قطع کر رہے ہیں۔ ان دونوں سے قلبی لگاؤ کیوں تھا اور علم کے ساتھ ساتھ ریاضت و طریقت سے دلچسپی کس بنا پر تھی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ والدِ مکرم کی ہدایت تھی کہ محض علم کافی نہیں، اس کے ساتھ تصوف کی آمیزش بھی ضروری ہے۔ شیخ کے والد اس عالم کو جو راہِ تصوف سے آشنا نہ ہو، "ملائے خشک" سے تعبیر کرتے ہیں اور بیٹے کو محض اسی زمرے کا ایک فرد ہو کر رہ جانے سے منع فرماتے ہیں۔ شیخ لکھتے ہیں کہ اسی وجہ سے مجھے زندگی کے ابتدائی دور ہی میں حضور قلب اور طریقت سے طبعی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا:

> از بدوِ فطرت بحکمِ وصیتِ پدر کہ می گفت باں تا ملائے خشک و ناہموار نباشی، ہموارہ از عشق و محبت دمے می زنم و در طریقِ غربت و دردمندی قدمے می نہم[۳۲]

فارغ التحصیل ہونے کے بعد

شیخ عبدالحق محدث دہلوی چھوٹی عمر ہی میں تکمیل علم کے مرحلے طے کر گئے تھے۔

---

[۳۱] اخبار الاخیار، ص ۳۱۳۔
[۳۲] ایضاً ص ۳۱۴

اس کے بعد جب بیس سال کو پہنچے تو مسندِ تدریس پر فائز ہو گئے لیکن جیسا کہ "بادشاہ نامہ" میں عبدالحمید لاہوری نے اور "شاہ جہان نامہ" میں محمد صالح کنبوہ نے بیان کیا ہے۔ ہنگامۂ تدریس کا یہ دَور بہت مختصر ہے۔ وہ جلد ہی حجاز مقدس روانہ ہو گئے تھے۔[۳۳]

سفر حجاز کا ذکر انھوں نے اخبار الاخیار میں بھی کیا ہے[۳۴] اور زاد المتقین میں بھی۔ ۹۹۶ھ میں سفر بیت اللہ کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اور پھر اس ملک میں ٹھہرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا۔ وہ ہندوستان میں اپنے آپ کو "بے خانماں" سمجھنے لگے اور دل میں ایک "وحشت" سی پیدا ہو گئی۔ اور ذہن و قلب پر "دیوانگی" کی سی کیفیت رونما ہوئی کہ ارادۂ سفر کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ زاد المتقین میں اس کیفیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

درسن ست وتسعین وتسع مأۃ جاذبہ از غیب دررسید و وحشت در دل پدید آمد چارہ نماند جز دیوانگی کردن و زادِ ہمت بخیال سفر بربستن۔

یعنی ۹۹۶ھ میں عالمِ غیب سے ایک جذبہ پیدا ہو گیا اور دل پر وحشت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر اس دیوانگی کی حالت میں سفر کے ارادے کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا۔

جس زمانے میں شیخ نے دیارِ ہند سے کوچ کرنے اور سرزمین حجاز کو اپنا مسکن قرار دینے کا فیصلہ کیا، اس زمانے میں اس ملک پر مغل حکمران جلال الدین اکبر دادِ حکمرانی دیتا تھا اور یہاں کی دینی فضا پر تکدر کی وسیع چادر تنی ہوئی تھی۔ علمائے سو نے اکبر کے دل میں اسلامی امور اور دینی احکام کے خلاف نفرت اور عناد کی افسوسناک کیفیت پیدا کر دی تھی، جس کے نتیجے میں اس سرزمین میں کسی صحیح العقیدہ عالم دین کا قیام ممکن نہ رہا تھا۔ شیخ بھی ان حالات سے متاثر ہوئے اور ترکِ وطن پر مجبور

۳۳؎ بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۳۴۲،۲۴۱ — شاہ جہان نامہ ج ۳ ص ۳۸۴

۳۴؎ اخبار الاخیار، ص ۳۱۴

ہو گئے۔ مُلّا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

چوں وضعِ زمانہ و زمانیان کہ ہمہ مخل و برمکارہ طبیعی مشتمل است دیگرگوں شدہ برا وضاع آشنایاں اعتماد نماند، صحبت فلانی و فلانی راست نیامد و توفیق رفتن بکعبہ شریفہ رفیق او شد، از دہلی بطریق جذبہ ہیچ چیز مقید نہ شدہ بگجرات رفت [35]

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

جب وقت اور اہلِ زمانہ کی وضع میں، جو اوقات میں مخل اور مکروہاتِ طبعی پر مشتمل ہے فرق آیا اور ملنے والوں کے حالات قابلِ اعتماد نہ رہے اور فلاں وفلاں کی صحبت ورفاقت سازگار نہ رہی اور کعبہ شریف جانے کی توفیق رفیقِ حال ہوئی تو شیخ عبدالحق کے عالم جذبہ کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ ہوسکی اور وہ دہلی سے گجرات روانہ ہو گئے۔

ظاہر ہے یہاں "صحبت فلانی وفلانی" سے فیضی اور ابوالفضل مراد ہیں۔ مُلّا عبدالقادر نے ان کے نام کی صراحت کے بجائے ان ہی الفاظ کو کافی سمجھا ہے۔

مکہ معظمہ میں شیخ عبدالوہاب کی خدمت میں حاضر ہو کر شیخ عبدالحق نے جس نہج سے بات کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ عبدالحق محدث، اکبر بادشاہ اور اس کے امرا کے پاس بھی گئے تھے اور ان سے مل بھی چکے تھے، لیکن ان کی گرفت میں آنے سے اللہ نے ان کو محفوظ رکھا۔ اس لیے کہ ان کی تربیت علم وعبادت اور تصوف وریاضت کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس کا ذکر انھوں نے المکاتیب والرسائل میں کیا ہے۔ ان کے عربی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔ شیخ عبدالوہاب سے کہتے ہیں:

یا سیدی! میں وہ شخص ہوں، جس نے بچپن ہی سے تحصیلِ علم اور عبادت گزاری کی محنت وریاضت کے ماحول میں پرورش پائی ہے۔ میں نے کبھی لوگوں کی صحبت اور اختلاط کو اہمیت نہیں دی، اور جب اللہ کے فضل وکرم سے مجھے علم کا اچھا خاصہ حصہ میسر آگیا، اور میں نے اپنی ضرورت کی تمام چیزیں یہاں سے مکمل کرلیں تو بعض اہلِ حقوق نے مجھے دنیادار

---

[35] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۱۳۔

لوگوں کی طرف جانے کی دعوت دی۔ چنانچہ میں بادشاہِ وقت اور امرائے دولت سے ملا۔ انھوں نے میری طرف بہت عنان توجہ مبذول کی، میرا مقام و مرتبہ بلند کیا اور یہ چاہا کہ میرے ذریعے اپنی جماعت میں اضافہ کریں اور مجھ کمزور و ناتواں سے اپنی طاقت کو مضبوط و مستحکم بنائیں، لیکن اللہ نے مجھے ان سے محفوظ رکھا اور ان کے ساتھ نہ رہنے دیا۔ اس نے اپنے اس بندے کے دل میں ایک ایسا داعیہ اور جذبہ پیدا کیا کہ جس نے مجھے اس مقدس مقام پر پہنچا دیا۔[۳۶]

دینی اعتبار سے اکبری دور کے ہندوستان کے حالات شیخ عبدالحق اور دیگر اصحاب تقویٰ کے لیے نہایت ناسازگار تھے اور روحانی لحاظ سے سخت تکلیف دہ تھے اور ان کے لیے وہاں ٹھہرنے کا اب کوئی امکان باقی نہ رہا تھا۔ ہندوستان کے نامور مؤرخ جناب خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

ابوالفضل اور فیضی نے اس دینی انتشار و ابتری کی رہبری کی۔ شیخ عبدالحق کے فیضی سے ذاتی تعلقات تھے۔ دربار کے یہ حالات دیکھ کر ان کی طبیعت گھبرا اٹھی۔ اگر زمانہ سازی پر ان کی طبیعت ذرا بھی راضی ہو جاتی تو دولت و ثروت، عزت و حشمت ان کے قدم چومتی۔ لیکن ان کا مذہبی شعور بیدار تھا اور وہ کسی قیمت پر اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کے لیے تیار نہ تھے۔ اکبر کا سیاسی اقتدار اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں مخالف تحریکوں کا نشوونما پانا ناممکن تھا۔ ان حالات میں ترکِ وطن کے علاوہ کوئی چارۂ کار ہی سمجھ میں نہ آیا، اور انھوں نے غیرتِ دینی سے مجبور ہو کر حجاز کی راہ لی۔[۳۷]

دہلی سے روانگی

۹۹۵ھ کے شروع میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے سفر حجاز کا عزم کیا اور دہلی سے روانہ ہوئے۔ ان کی پہلی منزل مالوہ تھی، مالوہ سے عازم گجرات ہوئے۔ گجرات

---

[۳۶] المکاتیب والرسائل ص ۲۷۹

[۳۷] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۹۵

پہنچ کر معلوم ہوا کہ جہاز کا موسم گزر چکا ہے۔ چنانچہ سال بھر وہیں رہے اور ۹۹۶ھ میں حجاز روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں اکبر کی طرف سے مالوہ کا حاکم مرزا کوکہ تھا، جو اکبر کا رضاعی بھائی تھا۔ اخلاقِ حسنہ کا حامل اور بہت سے اوصاف و فضائل کا مالک تھا۔ شیخ نے اثنائے سفر میں اس کے پاس بھی قیام کیا۔ مرزا عزیز کوکہ کا لقب خانِ اعظم تھا۔ اکبر جب اس سے ناراض ہوتا تو کہا کرتا تھا کہ میرے اور عزیز کے درمیان دودھ کی نہر بہتی ہے، لہٰذا مجبور ہوں — جہاں گیر نے بھی تزکِ جہاں گیری میں عزیز کوکہ کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ سوانح و تاریخ اور تقریر و تحریر میں ید طولےٰ رکھتا تھا۔ لطیفہ بازی، بذلہ سنجی اور شعر گوئی میں بھی بہت مشہور تھا۔ شیخ کچھ عرصہ مالوہ میں عزیز کوکہ کے ہاں قیام پذیر رہے۔ مالوہ سے مانڈو تشریف لے گئے۔ وہاں گلزار ابرار کے مصنف محمد غوث شطاری مانڈوی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بقول خود "شیخ کے" بافروغ دیدار سے بہت کچھ فیروزی اور فرخندگی کے فوائد حاصل کیے"[۳۸]۔ مانڈو سے احمد آباد پہنچے۔ احمد آباد میں ان دنوں طبقاتِ اکبری کے مصنف مرزا نظام الدین احمد صوبے کے بخشی تھے۔ انھوں نے گرم جوشی سے شیخ کا استقبال کیا اور "بے حد التماس کر کے آئندہ موسم تک ٹھہرایا اور نہایت خواہش کر کے آپ کی خدمات انجام دیں"[۳۹]۔

احمد آباد میں شیخ نے وہاں کے ایک جید عالم دین، صاحب تصنیفات کثیرہ اور بہت بڑے مدرس و معلم شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی (متوفی ۹۹۸ھ) کی خدمت میں بھی حاضری دی اور ان سے فیض حاصل کیا[۴۰]۔

دہلی سے شیخ بلا کسی زادِ راہ کے احمد آباد پہنچے تھے۔ احمد آباد میں مرزا نظام الدین احمد بخشی نے، جو ان کے دیرینہ دوست تھے، ان کو اپنے یہاں ٹھہرایا۔ جب شیخ کے حجاز کو

۳۸ھ اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار، ص ۵۹۹

۳۹ھ ایضاً

۴۰ھ اخبار الاخیار، ص ۲۶۳

روانہ ہونے کا وقت آیا تو زادِ راہ اور جہاز کا انتظام کیا۔

شیخ محدث مکہ مکرمہ میں

شیخ محدث رمضان المبارک سے کافی پہلے مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے۔ رمضان ۹۹۶ھ میں انھوں نے محدثین مکہ معظمہ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درس لیا۔ پھر شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ اور استفاضہ کیا۔ ۹۹۹ھ تک شیخ کا قیام مکہ مکرمہ میں رہا۔ تقریباً یہ تمام عرصہ انھوں نے شیخ عبدالوہاب متقی کی خدمت ہی میں گزارا جو ہندوستان کے بہت بڑے علما میں سے تھے۔ ۹۶۳ھ سے مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے، جبکہ ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شیخ عبدالوہاب متقی کے مختصر حالات درج کر دیے جائیں۔

شیخ عبدالوہاب کے والد کا اسمِ گرامی شیخ ولی اللہ اور مقامِ ولادت مانڈو تھا، جو ہندوستان کے علاقہ مالوہ کی قدیم حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ شیخ ولی اللہ مانڈو کے اعیان و اکابر میں سے تھے۔ مانڈو میں ان کو کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انھیں ترکِ وطن کر کے برہان پور جانا پڑا۔ یہ شیخ عبدالوہاب کے بچپن کا زمانہ تھا اور اس پُر آلام سفر میں یہ والد کے ساتھ تھے۔ عبدالوہاب ابھی کم سن ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس حادثے سے دل اس درجہ متاثر و مغموم ہوا کہ وطن کو خیرباد کہہ دیا اور خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کر لی۔ گجرات، دکن، لنکا، سراندیپ وغیرہ میں عرصہ تک سرگرم سیاحت رہے۔ عام طور پر تین دن سے زیادہ کسی مقام پر نہ ٹھہرتے البتہ اگر کوئی مردِ خدا اور عالمِ دین مل جاتا تو مدتِ قیام میں کچھ توسیع ہو جاتی۔ اثنائے سفر میں نہ کسی سے کچھ طلب کرتے اور نہ اپنی ضرورت کے لیے کسی کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔ اس طرح بھوک پیاس کی بے پناہ شدتیں برداشت کرتے اور مختلف قسم کی جسمانی اور ذہنی تکلیفیں اٹھاتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ ان تکلیف دہ ایامِ سفر کا ذکر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے شیخ عبدالوہاب کی زبانی اخبارالاخیار میں کیا ہے۔ ایک

جگہ لکھتے ہیں :

فرمودند کہ چندگاہ قوتِ ما آں بود کہ یارے می رفت، و استخوان ہائے ناکار آمدنی کہ قصاباں می بر نافتند برداشتہ می آورد، و پارۂ از کاہ گندم کہ درمیانِ کشت زارہا افتادہ بود می آورد، و آن استخوانہا را می کوفتند، و آں کاہ را شستہ و پاکیزہ می کردند، و درمیان دیگ کردہ در آب می جوشانیدند، و ہر کدام کاسہ ازاں صاف کردہ می خوردند، بعد از چند روز مردمِ شہر آگاہ می شدند و طعامہا می آوردند، و دیگر ازاں جا انتقال می کردیم، و جائے دیگر می رفتیم و زیادت بر سہ روز اقامت نمی کردیم [۴۱]

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے :

شیخ عبدالوہاب فرماتے ہیں - بارہا ہمارا کھانا اس طرح ہوا کہ کوئی ساتھی جاتا اور وہ بے کار ہڈیاں جو قصاب اپنی دکان کے آگے پھینک دیتے ہیں، اٹھا لاتا، اور گیہوں کے بال جو کھیتوں میں گرے پڑے رہتے تھے، چن لیتا - ان ہڈیوں کو کوٹ کر اور اس گھاس کو پاک صاف کر کے پکا لیا جاتا اور پھر سب ایک ایک پیالہ پی لیتے - اس کے بعد جب شہر والوں کو ہمارے بارے میں معلوم ہو جاتا تو وہ کھانا لاتے تھے تو ہم وہاں سے منتقل ہو کر دوسری جگہ چلے جاتے۔ کسی جگہ ہم تین دن سے زیادہ قیام نہ کرتے تھے۔

اسی طرح شیخ عبدالوہاب متقی بھوک پیاس کی سختیاں برداشت کرتے اور سفر کے مصائب و آلام جھیلتے ہوئے جمادی الاولیٰ ۹۶۳ھ کو مکہ مکرمہ پہنچے - اس وقت ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی - مکہ مکرمہ میں مسندِ تدریس پر اس زمانے میں مشہور ہندی عالم شیخ علی متقی (متوفی ۲ جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ) متمکن تھے - ان کی شہرتِ علمی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور وہ شیخ عبدالوہاب کے والدِ گرامی شیخ ولی اللہ کے علم و فضل سے باخبر تھے - شیخ عبدالوہاب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر انہی کے ہو رہے اور ان کی زندگی کے آخری سانس یعنی ۲ جمادی الاولیٰ ۹۷۵ھ تک

---

[۴۱] اخبار الاخیار، ص ۲۷۷

ان سے وابستگی اختیار کیے رکھی۔ تمام علوم کی تحصیل انہی سے کی اور ظاہری و باطنی علوم میں مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ ان کی وفات کے بعد مکہ معظمہ ہی کو اپنا مسکن ٹھہرالیا۔
شیخ عبدالوہاب نہایت خوشخط بھی تھے اور انتہائی صفائی اور احتیاط سے کتابت کرتے تھے۔ علاوہ ازیں زود نویس بھی تھے۔ شیخ علی متقی کی ایک کتاب جو بارہ ہزار سطور پر مشتمل تھی، شیخ عبدالوہاب نے بارہ راتوں میں اس کی کتابت مکمل کر لی تھی۔ تقویٰ و تدین، بدرجہ غایت جذبۂ ذوق و شوق، تصوف و سلوک سے شدید لگاؤ، بے حد اشتیاق حصول علم، استاذ سے بے پناہ عقیدت و محبت اور کتابوں کی تصحیح و کتابت میں انتہائی دلچسپی ان کے وہ اوصاف تھے جن کی وجہ سے شیخ علی متقی کو ان سے خاص تعلقِ خاطر پیدا ہو گیا تھا اور وہ انھیں انتہائی تودد و محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

شیخ عبدالوہاب کو مکہ معظمہ کے حلقۂ علما و فضلا میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ دور دور سے لوگ ان سے علم حاصل کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ اس زمانے میں علوم شرعیہ پر عبور و استحضار میں بہت کم لوگ ان کا لگا کھاتے تھے۔ شیخ عبدالحق تحریر فرماتے ہیں:

می تواں گفت، کہ دریں زمان بدانش ایشاں در علوم شرعیہ کمتر کے خواہد بود۔ قاموس لغت مبالغہ می تواں گفت کہ گویا ہمہ یاد داشت و فقہ و حدیث نیز ہمیں حکم دارد، و مبادی علوم عربیت نیز زیادہ از قدرِ کفایت است۔ سالہا در حرم شریف درس ایں علوم گفتہ بودند[۵۴۲]

اس دور میں علوم شرعیہ پر عبور و مہارت میں بہت ہی کم لوگ ان کے مقابلے کے ہوں گے، وہ ایک زندہ قاموس تھے، اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ سب کچھ انھیں یاد تھا۔ فقہ اور حدیث میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ مبادی علوم عربیہ (یعنی صرف و نحو اور ادب وغیرہ) سے بھی کفایت سے زیادہ نظر رکھتے تھے۔ برسوں تک حرم شریف میں ان کی تدریس

---

۵۴۲ اخبار الاخیار ص ۲۷۲

کا سلسلہ جاری رہا تھا۔

شیخ عبدالوہاب متقی مختلف مسائل اور فقہی معاملات میں معتدل المزاج رکھتے تھے۔ بحث و مباحثہ سے انھیں سخت نفرت تھی۔ اس زمانے کے صوفیا میں مسئلہ وحدت الوجود کا بڑا زور رہتا اور توحید وغیرہ کے سلسلے میں عام طور پر یہ لوگ ابن عربی سے متاثر تھے۔ زیادہ تر فصوص الحکم اور اس موضوع کی دیگر کتابیں ان صوفیا کے زیر مطالعہ رہتی تھیں اور اپنے شاگردوں کو درسًا درسًا یہ کتابیں پڑھاتے بھی تھے۔ لیکن اس ضمن میں شیخ عبدالوہاب کا مسلک توقف و سکوت کا تھا۔ نہ وہ ان کتابوں کا درس دیتے، نہ ان سے اشتغال رکھتے، نہ ان کا انکار کرتے اور نہ ان کو بُرا کہتے تھے۔ ان کی عادت ان فقہا کی سی نہیں تھی جو ان کتابوں پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک ظاہرًا و باطنًا سنت پر عامل ہونا ضروری اور عقیدہ کی مضبوطی لازمی ہے۔ صوفیا کی بعض مروج و معروف کتابوں کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ ان کا مطالعہ تو کرنا چاہیے مگر یہ احتیاط رکھنی چاہیے کہ اپنے خاص انداز میں وہ جن اسرار و معارف کا ذکر کرتے ہیں، اگر وہ حیطۂ فہم میں نہ آئیں تو انھیں ترک کر دیا جائے۔ طبیعت میں خلجان اور تذبذب نہ پیدا کیا جائے۔ یہ مستحسن نہیں ہے کہ انہی کتابوں کے مطالعہ سے عقیدہ درست کرنے کی ابتدا کی جائے اور جو کچھ کسی سے سن لیا، اس کی پیروی شروع کر دی جائے۔ عقیدہ کی مضبوطی اصل شی ہے، اس میں کسی قسم کا خلل نہیں آنا چاہیے۔

شیخ عبدالوہاب کسی کی تکفیر و تفسیق کرنے اور اس کو ملحد قرار دینے سے دامن کشاں رہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ جس نقطۂ نظر کے حامل تھے، شیخ عبدالحق محدث نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

فرمودند کہ ہر کہ رابینند کہ بکلمۂ اسلام اقرار می کند و نماز و روزہ می کند ازوے اگر امثال ایں کلمات چیزے صادر شود، معذور دارند، و تکفیر و تشنیع نکنند و نسبت بالحاد نکنند۔ [۲۴۳]

---

[۲۴۳] اخبار الاخیار ص ۲۷۱

جس کو دیکھو کلمہ پڑھتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے، اس سے اگر ایسے کلمات صادر ہو جائیں تو اسے معذور سمجھو، اس کی تکفیر و تشنیع نہ کرو اور اس کو ملحد نہ جانو۔

شیخ ممدوح حصولِ علم کو انسان کے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کی افادیت ہر شخص کے لیے عام ہے:

علم بمنزلۂ غذا است کہ ہمیشہ احتیاج باقی است و نفعِ آں عام [۴۴]

علم غذا کی مانند ہے، جس کی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے اور اس کی افادیت کا سلسلہ عام ہے۔

ان کے نزدیک علم دین کی تحصیل، درس و تدریس، نماز، تلاوتِ قرآن مجید، اور ہر عمل خیر ذکر الٰہی ہے [۴۵]

حلقہ باندھ کر اور دیگر انداز سے ذکر الٰہی میں مشغول ہونے کو شیخ سنت قرار نہیں دیتے، بلکہ اسے مشائخ کا ایک طریق قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اصل ذکرِ الٰہی لا الٰہ الا اللہ ہے:

می فرمودند کہ ایں کیفیت حلقۂ ذکر و بعضے اوضاع و انواعِ ذکر درویشاں می کنند، اگرچہ آں را سندے صحیح در سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نیست اما از مستحسنات مشائخ است ..... واصل ذکر ہمیں لا الٰہ الا اللہ است [۴۶]

ماہِ رمضان ۹۹۶ھ کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مکہ مکرمہ میں شیخ عبدالوہاب منتقی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشکوٰۃ شریف کا درس لینا شروع کیا۔ رمضان کے عشرۂ آخر میں ان کے ساتھ معتکف رہے۔ مناسکِ حج بھی انہی کے ساتھ ادا کیے اور پھر درس میں مشغول ہو گئے۔ ۲۳ ربیع الثانی ۹۹۷ھ کو شیخ کی اجازت سے مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے اور آخر رجب ۹۹۸ھ تک وہاں مقیم رہے۔ شیخ کو رسول

---

۴۴ اخبار الاخیار ص ۲۷۲ ۴۵ ایضاً

۴۶ ایضاً ص ۲۷۳۔

پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے اس درجہ محبت تھی کہ جب دیارِ حبیب میں داخل ہوتے تو برہنہ پا ہو جاتے ـــ در مدینہ برہنہ پا گردیدے ـــ مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس آکر مشکوٰۃ کا درس مکمل کیا، جو شیخ عبدالوہاب سے لینا شروع کیا تھا۔ اس سے فارغ ہوئے تو شیخ نے فرمایا:

الحمد للہ! اب اس علم پر بدرجۂ اتم عبور حاصل ہوگیا ہے۔ بلکہ اس قدر ہوگیا ہے کہ اس علم کی خدمت کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔ اب چند روز دوسرے امور میں مصروف ہونا چاہیے اور خلوت اور ذکرِ الٰہی کی لذت سے بہرہ اندوز ہونا چاہیے۔

اس کے بعد ان کو آداب و اوضاعِ ذکر اور تقلیل طعام وغیرہ کی تعلیم دی۔ نیز تصوّف کی کچھ کتابیں پڑھائیں۔ "نہج السالک الی اشرف المسالک" نام کی ایک کتاب بھی ان کو دی جو عربی میں تھی، شیخ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ایک اور کتاب جس کی خاص طور پر تعلیم دی، "قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ و الحقیقۃ" تھی۔ پھر عبادت و ریاضت کے کچھ طرق کی تلقین فرمائی، جن کا تعلق خلوت سے تھا۔ استاذ سے صحیح مسلم کی قرآت کی اجازت چاہی۔ اس سے فارغ ہوگئے تو شیخ کی طرف سے واپس ہندوستان جانے کا حکم ہوا۔!

یہاں یہ بات لائقِ تذکرہ ہے کہ قیامِ حجاز کے دوران میں فقہ حنفی کے متعلق شیخ عبدالحق دہلوی کے خیالات بدل گئے تھے اور وہ شافعی مذہب اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ شیخ عبدالوہاب کو اس کا علم ہوا تو فضائل امام ابوحنیفہ پر ایک پُر تاثیر تقریر کی، جس کی وجہ سے شیخ کے خیالات میں پھر تبدیلی آگئی اور فقہِ حنفی کی عظمت ان کے دل میں قائم ہوگئی۔[۴۷]

دیارِ ہند میں واپسی

جب شیخ عبدالحق دہلوی مکہ معظمہ میں شیخ عبدالوہاب متقی کے فیض صحبت سے ظاہری و

---

[۴۷] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۱۱

باطنی علوم کی منزلیں طے کر چکے تو شیخ نے واپس ہندوستان جانے کا حکم دیا اور فرمایا :

بخانہ خود بروید کہ والدہ و فرزندانِ شما بسیار پریشان حال و بجانب شما نگران خواہند بود۔

اب اپنے گھر جائیے کہ والدہ اور بچے آپ کی طرف سے پریشان حال اور آپ کے منتظر ہوں گے۔

لیکن شیخ عبدالحق ہندوستان کے دینی اور مذہبی حالات سے سخت مایوس اور دل برداشتہ ہو چکے تھے اور یہاں آنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ استاذ کا فرمان سن کر عرض گزار ہوئے۔

فقیر را نیتِ اقامتِ ایں مقاماتِ شریفہ بسیار است۔

فقیر کے دل میں ان مقدس مقامات میں مقیم رہنے کی بہت ہی تمنا ہے۔

اس موضوع پر مشفق استاذ اور سعادت مند شاگرد کے درمیان کافی گفتگو ہوئی۔ استاذ مصر تھے کہ اپنے وطن ہندوستان واپس جائیں اور شاگرد ابھی جانے کو تیار نہ تھے۔ بالآخر استاذ نے تسلّی دیتے ہوئے فرمایا :

ان شاء اللہ تعالیٰ خیریت است۔ استخارہ بکنید۔ اکنوں در ظاہرِ خود خیریت منحصر است درآں کہ بخانہ خود روید۔

ان شاء اللہ تعالیٰ بہتر ہی ہوگا۔ استخارہ کریں۔ اب بظاہر خیریت اسی میں نظر آتی ہے کہ اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔

بہر حال شیخ عبدالوہاب کے پیہم اصرار سے شیخ محدث نے ہندوستان واپس جانے کا ارادہ کر لیا اور آخر شعبان ۹۹۹ھ کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی قبر پر دعا کے لیے طائف گئے۔ پھر رمضان کے آخر تک مکہ معظمہ میں شیخ عبدالوہاب کی خدمت میں حاضر رہے۔ بعد ازاں شوال میں عازمِ ہند ہوئے اور ۱۰۰۰ھ کو واپس گھر پہنچے۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب بادشاہِ ہند جلال الدین اکبر کے مذہبی تصورات نے الحاد

کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہندوستان کی دینی فضا بادشاہ کے غیر دینی افکار سے آلودہ ہو چکی تھی۔ احکامِ شریعت اور سنتِ نبوی سے روگردانی کا دور دورہ تھا۔ دربارِ شاہی میں اسلامی شعار کی تضحیک ہوتی تھی اور دینی اقدار کو ماننے سے برملا انکار کیا جاتا تھا۔ علمائے سوء نے مسائل و احکامِ شرعی میں حیلہ سازی کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ بلکہ ملا عبدالقادر بدایونی تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں:

حیل بنی اسرائیل پیش آں شرمندہ [۴۸]

بنی اسرائیل کی حیلہ سازیاں بھی ان کی حیلہ سازیوں کے آگے شرمندہ تھیں۔

ان روح فرسا حالات میں شیخ عبدالحق محدث مکہ معظمہ سے ہندوستان آئے۔ بلاشبہ یہ وہی حالات تھے، جن سے مایوس و بد دل ہو کر انھوں نے اس ملک کو خیرباد کہا تھا اور حجاز روانہ ہوئے تھے۔ لیکن اب خود ان کی زندگی کی کیفیات بدل چکی تھیں، وہ علومِ دینی کے سرمایہ سے پوری طرح بہرہ ور ہو گئے تھے اور ملک میں اسلام کی محافظت اور رواج پذیر گمراہیوں کے سدِ باب کے لیے جس ساز و سامان کی ضرورت تھی، وہ ان کے پاس موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے دہلی میں مسندِ درس و ارشاد بچھائی اور ملک میں ہنگامہ تدریس کا آغاز کیا۔ ہندوستان میں یہ پہلا مدرسہ تھا، جس میں قرآن و حدیث دونوں کی تعلیم کا سلسلہ عمدہ ترین نہج سے شروع کیا گیا اور شریعتِ اسلامیہ کی باقاعدہ تبلیغ و ترویج کی طرح ڈالی گئی۔ بلاشبہ اس دور کے ہندوستان میں دین کی نشر و اشاعت کا سب سے بنیادی اور سب سے مؤثر ذریعہ یہی ہو سکتا تھا کہ تدریس و تعلیم کے میدان میں کتاب و سنت کو علومِ دینی کا مرکزی نقطہ قرار دیا جائے۔ اور شیخ عبدالحق دہلوی نے اسی کو اختیار کیا۔ ساتھ ہی تصنیف و تالیف میں بھی سرگرمِ عمل ہوئے۔ اس کا ذکر انھوں نے خود بھی اخبار الاخیار میں کیا ہے اور بادشاہ نامہ میں عبدالحمید لاہوری نے بھی کیا ہے [۴۹]۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شیخ

---

[۴۸] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۰۳

[۴۹] تفصیل کے لیے دیکھیے اخبار الاخیار ص ۳۱۳، ۳۱۴ — بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۳۴۱ (۲۴۱)، ۳۴۲۔

کا یہ مدرسہ اس پُر فتن دور میں شریعتِ اسلامی اور سنت نبوی کی سب سے بڑی حصار تھا۔
یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ شیخ نے ہندوستان آکر خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں بھی حاضری دی تھی اور ان سے بعیت کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔

شیخ عبدالحق اور شاہانِ ہند

شیخ عبدالحق محدث دہلوی سلیم شاہ سوری کے عہد میں پیدا ہوئے اور مغل حکمران شاہ جہان کے عہد میں اس کے سولھویں سالِ جلوس میں وفات پائی۔ اس اثنا میں یکے بعد دیگرے آٹھ فرماں روا تختِ ہند پر متمکن ہوئے، جن کے نام یہ ہیں :

۱۔ سلیم شاہ سوری : اس کو اسلام شاہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شیر شاہ سوری کا بیٹا تھا اور ہندوستان کا ایک منصف مزاج حکمران تھا۔ اس نے نو۹ سال حکومت کی اور ۹۶۱ھ کو وفات پائی۔

۲۔ مبارز خاں : یہ سلیم شاہ سوری کا عم زاد اور رسالا تھا۔ سلیم کے بارہ سالہ بیٹے فیروز خاں کو قتل کر کے اور محمد شاہ عادل کا لقب اختیار کر کے حکمران بنا تھا۔ نہایت ظالم اور رذیل آدمی تھا۔ لوگ اس کو عدلی کہتے تھے اور یہ قتل ہو گیا تھا۔

۳۔ ابراہیم شاہ : یہ مبارز خاں کا زبردست حریف تھا۔ اس کے ساتھ جنگ کے بعد دہلی اور آگرہ وغیرہ کے علاقوں پر قابض ہو گیا تھا۔ اس کا انجام بھی قتل ہوا۔

۴۔ سکندر شاہ : یہ بھی سور خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کو نصیر الدین ہمایوں نے شکست دی اور ہمایوں دوبارہ ہندوستان کا بادشاہ بنا۔

۵۔ ہمایوں
۶۔ اکبر
۷۔ جہاں گیر
۸۔ شاہ جہان

} یہ چاروں ہندوستان کے مشہور مغل حکمران تھے اور تاریخ ہند میں خاص مرتبے کے حامل تھے۔

ان میں اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہان وہ بادشاہ ہیں، جن کا عہدِ حکومت شیخ نے اچھی طرح دیکھا تھا اور ان کے زمانے کے حالات کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا، لیکن اس مردِ خدا

کی ذہنی بلندی اور کمال خودداری ملاحظہ ہو کہ ملوک و سلاطین اور ارباب حکومت سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا اور عمر بھر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کیے رکھی، ہمیشہ درس و افادہ اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز سے کبھی لگاؤ نہیں ہوا۔ وہ اپنے بارے میں کہا کرتے تھے:

حقی از گوشۂ دہلی نہ نہم پا بیروں　　　خود گر فتیم کہ ملک گجراتم دادند

اس تنہا پسندی اور عزلت نشینی کے کچھ معقول وجوہ تھے۔

ایک یہ کہ دربار اکبری میں دنیادار علما نے جس طرح احکام شریعت اور دین صحیح کی مخالفت اور اس پر طنز و تشنیع کے اسباب فراہم کیے، اس سے صحیح العقیدہ اور حق پرست علما شدید روحانی پریشانی میں مبتلا تھے اور یہ بات ان کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ دربار سے منقطع رہنے ہی سے علم اور دین کے سرمائے کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ دربار شاہی سے تعلق قائم کرنے سے علمی معاملات اور دینی امور میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ علمی سرگرمیاں اور درباری وابستگیاں دو الگ الگ چیزیں ہیں، ان کا ایک جگہ جمع ہونا محال ہے۔

تیسرے یہ کہ شیخ طبعاً مدح سرائی اور مبالغہ آمیزی سے متنفر تھے اور دربار میں آمد و رفت رکھنے والوں میں اس صفت کا پایا جانا ضروری ہے۔

شیخ محدث اور جہاں گیر بادشاہ

عہد اکبری میں دین و مذہب کا جو حال ہوا، اس سے دیگر اصحاب دل کی طرح شیخ کا دل سخت مغموم تھا اور ان کا ضمیر بے حد اذیت محسوس کرتا تھا لیکن ملک کی زمام اقتدار جہاں گیر کے ہاتھ میں آئی تو حالات بہت ہی رو باصلاح ہو گئے تھے اور ارباب حکومت میں ایک خوشگوار ذہنی اور فکری تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔ خود جہاں گیر نے بڑی حد تک اپنے باپ کے افکار و تصورات سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس لیے بادشاہ کے لیے شیخ محدث کے دل میں بھی خیر خواہانہ جذبات ابھر آئے اور اس پر شرعاً جو فرائض عائد ہوتے ہیں، ان سے اسے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ "نوریہ سلطانیہ"

کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا، جس میں "قواعد وارکان سلطنت" پر مفصل بحث کی۔
بعدازاں شیخ نے جہاں گیر کے بیٹے شاہ جہان کے لیے ایسی چالیس احادیث جمع کیں، جن
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین کو پند و نصائح سے نوازا ہے۔ اس رسالے
کو انھوں نے "ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین" کے نام
سے موسوم کیا۔

بہرحال اکبر کی وفات کے بعد ہندوستان کے مذہبی حالات بدل گئے تھے اور
شیخ کے نزدیک اب فرماں روایانِ ہند کو صحیح دینی تعلیم سے روشناس کرانے کا وقت
آگیا تھا، لہٰذا انھوں نے جہاں گیر سے میل جول رکھنے اور اس سے تعلقات استوار
کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس کے علاوہ جناب خلیق احمد نظامی یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

ممکن ہے، شیخ محدث کے رویہ میں اس تبدیلی کا سبب حضرت خواجہ باقی باللہ کی
تعلیم ہو۔ خواجہ صاحب کا اصول یہ تھا کہ جھونپڑوں سے لے کر محلوں تک ارشاد و تلقین کا
ہنگامہ برپا کرنا چاہیے اور سلاطین سے علیحدہ رہنے کی بجائے، ان کو متاثر کرنے کی کوشش
کرنی چاہیے۔[۵۰]

جہاں گیر سے ملاقات

جہاں گیر بادشاہ شیخ کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور ان کے علم و فضل
اور زہد و ورع سے بہت متاثر تھا۔ شیخ بھی اس کے اس جذبے اور اخلاص کی
بے حد قدر کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ دربار میں اس سے ملاقات کے
لیے بھی گئے۔ جہاں گیر اپنے تزک میں مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کا ذکر کرتا ہے:

شیخ عبدالحق دہلوی کہ از اہلِ فضل و اربابِ سعادت است، دریں آمدن دولت
ملازمت دریافت، کتابے تصنیف نمودہ بود، مشتمل بر احوال مشائخ ہند، بنظر درآمدہ،

۵۰؎ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۴۶

خیلکے زحمت کشیدہ، مدتہاست کہ در گوشۂ دہلی بوضع توکل وتجرید بسر می بود، مرد گرامی است صحبتش بے ذوق نیست۔ بانواعِ مراحم دل نوازی کردہ رخصت فرمودم۔[۵۱]

ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

شیخ عبدالحق دہلوی جو اہل فضل اور اصحابِ سعادت میں سے ہیں، میری یہاں آمد پر تشریف لائے۔ انھوں نے مشائخ ہندوستان کے حالات میں ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ میں نے اس کتاب کو دیکھا، اس تصنیف میں انھوں نے بڑی محنت کی ہے۔[۵۲] وہ مدت سے دہلی کے ایک گوشے میں توکل وتجرید کی زندگی بسر کر رہے ہیں، قابلِ احترام شخص ہیں۔ ان کی صحبت بے ذوق نہیں ہے۔ میں نے ان کو بہت سی عنایات ونوازشات سے رخصت کیا۔

جہاں گیر اس دور میں شیخ کے علم وفضل، تصوّف وطریقت اور توکل وتجرید سے بہت متاثر تھا۔ اس نے ان کو ایک گاؤں بھی جاگیر کے طور پر پیش کیا جس کا نام بکروالا تھا اور دہلی کے جنوب مغرب میں نو کوس کے فاصلے پر واقع تھا۔ شیخ نے پہلے تو یہ گاؤں قبول کرنے سے انکار کیا مگر جب بادشاہ کا اصرار زیادہ بڑھا تو قبول فرما لیا۔

زندگی کے آخری دنوں میں جہاں گیر کے دل میں شیخ کے بارے میں کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی طرح شیخ احمد سرہندی کے ایک مرید خاص مرزا حسام الدین کے متعلق بھی بادشاہ کے دل میں کبیدگی کے آثار ابھر آتے تھے۔ سکینۃ الاولیا میں دارا شکوہ اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

در وقتے کہ جہاں گیر بادشاہ در کشمیر بودند، بعضے مردمان سخنانِ غیر واقع از طرف شیخ عبدالحق دہلوی کہ امام محدثان وقت اند و مرزا حسام الدین کہ از مریدانِ باکمال شیخ احمد

---

[۵۱] تزکِ جہانگیری ص ۲۸۵۔

[۵۲] اس کتاب سے شیخ کی مشہور تصنیف "اخبار الاخیار" مراد ہے۔

سہرندی بودہ اند، بعرض بادشاہ رسانیدند[۵۳]

یعنی جس زمانے میں جہاں گیر بادشاہ کشمیر میں مقیم تھے۔ کچھ لوگوں نے محدثینِ عصر کے امام شیخ عبدالحق دہلوی اور شیخ احمد سرہندی کے مرید با کمال مرزا حسام الدین کے متعلق بے سرو پا اور غلط باتیں بادشاہ کے گوش گزار کیں۔

اس سے متاثر ہو کر جہاں گیر نے شیخ عبدالحق محدث اور مرزا حسام الدین، دونوں کو کشمیر بلا بھیجا۔ شیخ کے بیٹے شیخ نور الحق کو حکم ہوا کہ دہلی سے کابل چلے جائیں۔ شیخ عبدالحق یہ حکم سن کر لاہور پہنچے تو سخت پریشان تھے۔ حضرت میاں میر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھے تو اس کی وجہ دریافت کی فرمایا، اس بڑھاپے میں وطن اور بچوں سے جدا ہونے کے خیال سے پریشان ہوں — لیکن قدرتِ خداوندی ملاحظہ ہو کہ شیخ عبدالحق ابھی کشمیر نہ پہنچے تھے کہ جہاں گیر کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنے بیٹے نور الحق کے ساتھ واپس دہلی تشریف لے گئے۔

دارا شکوہ کا کہنا ہے کہ یہ بے سرو پا باتیں (سخنانِ غیر واقع) جو شیخ کے بارے میں جہاں گیر سے کہی گئی تھیں، بالکل غلط اور محض بہتان تھیں — مگر اس نے ان بے سرو پا باتوں کی، جنھیں وہ "سخنانِ غیر واقع" سے تعبیر کرتا ہے، وضاحت نہیں کی — اس ضمن میں جناب خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ دارا شکوہ نے "سخنان غیر واقع" کی وضاحت نہ کر کے شیخ محدث کی زندگی کے اس اہم حادثے کی نوعیت کو سمجھنے میں ایک محقق کے لیے دشواری پیدا کر دی ہے۔ ساتھ ہی مراۃ الحقائق کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے کہ (جہاں گیر کی بیوی) نور جہاں اور شیخ محدث کے درمیان بعض معاملات میں کشیدگی تھی۔ ممکن ہے اسی نے غلط باتوں اور "سخنان غیر واقع" سے جہاں گیر کے کان بھرے ہوں۔ مشہور ہے کہ ایک بار نور جہاں نے شیخ محدث کو محل میں آنے کی دعوت دی تھی، جس کے جواب میں شیخ نے کہا تھا کہ فقیر کا بادشاہوں

۵۳؎ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ بحوالہ سکینۃ الاولیا (قلمی نسخہ) ص ۶۴، ۶۵

یا بیگمات کے پاس کچھ کام نہیں ہے۔ فقیر کے لائق جو امر ہو، کہلا بھیجیے، اس کے انجام دینے میں حتی الامکان دریغ نہ ہوگا[۵۴]

لیکن اس ضمن میں رودِ کوثر میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم نے جس نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے، وہ بھی لائق تذکرہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

جہاں گیر نے تزک میں جس احترام سے شیخ عبدالحق کا ذکر کیا ہے، اس کے پیش نظر داراشکوہ کا بیان مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ شاید شیخ سے باز پُرس میں جہاں گیر کی شیعہ بیگم نورجہاں کی شکایتوں کو دخل ہو لیکن شیعہ سنی مسئلے پر شیخ عبدالحق محدث کی رائے معتدلانہ تھی۔ شیعہ مؤرخ خافی خان ان کی نسبت لکھتا ہے: "صد کتاب از علوم عقلی ونقلی تالیف فرمودہ۔ خصوص شرح مشکوٰۃ وتاریخ مدینہ کہ دراں ذکر حضرت آئمہ طاہرین وظلم وتعدی مخالفین باظہار کمال حسنِ عقیدت نمودہ... گویند بعد مراجعت از کعبۃ اللہ اکثر بر زبان صداقت بیان ایں سخن جاری بود کہ تا بہ بیت اللہ رفتہ مدتے مقیم گشتہ صرفِ اوقات برائے تحقیقات احادیث ننمودہ، ندانستم کہ بیشتر احادیث مشہور وضعی است"۔ شیعہ سنی اختلافات کے بارے میں شیخ کا مسلک شاہ ولی اللہ کا تھا، حضرت مجدد الف ثانی کا نہ تھا۔ اس کی بنا پر حکومت سے چپقلش قرینِ قیاس نہیں۔ اگر داراشکوہ کا بیان صحیح ہے تو ممکن ہے کہ جہاں گیر کے خلاف شاہ جہان نے جو بغاوت کی تھی، اس میں دوسرے راسخ العقیدہ مسلمانوں کی طرح شیخ محدث اور شیخ حسام الدین کی ہمدردیاں شاہ جہان کے ساتھ ہوں۔ بہرکیف شاہ جہان کی تخت نشینی نے یہ الجھن ختم کردی اور عہدِ شاہ جہانی میں آپ کی قدر ومنزلت میں اور اضافہ ہوگیا[۵۵]

یاد رہے، داراشکوہ نے سکینۃ الاولیا میں شیخ عبدالحق اور مرزا حسام الدین کے خلاف بادشاہ کے کانوں میں جن "سخنانِ غیر واقع" ڈالنے کا ذکر کیا ہے، وہ کسی اور تذکرے

---

[۵۴] مجلۃ المرآۃ الحقائق ص ۷۰، حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۴۹۔

[۵۵] رودِ کوثر ص ۳۸۲

میں مذکور نہیں۔ اگر اس میں کوئی صداقت ہے تو اس کے نتیجے میں بادشاہ کی طرف سے انھیں کابل چلے جانے کا حکم دینے کی دو وجہیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ بادشاہ کی بیوی نور جہاں شیعہ تھی اور وہ دربارِ شاہی میں شیخ کے اثر و رسوخ کو برداشت نہ کرتی تھی۔ دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ شاہ جہان نے جب اپنے باپ جہانگیر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو اس میں شیخ اپنی ہمدردی کا مستحق شاہ جہان کو سمجھتے تھے، اس لیے قدرتی طور پر جہاں گیر کے دل میں اس سے کبیدگی پیدا ہوئی۔

مگر اندازہ یہ ہے کہ "سخنانِ غیر واضح" کا قصہ غالباً صحیح نہیں ہے، کیونکہ شیخ اعتدال پسند عالمِ دین تھے، نہ تو انھیں شیعہ مسلک سے کوئی ایسی عداوت تھی جو معاملے کو یہاں تک پہنچا دے کہ بادشاہ انھیں علاقہ بدر ہونے کا حکم دینے پر مجبور ہو جائے اور نہ سیاسیات اور ملکی معاملات سے انھیں کوئی اتنی دلچسپی ہو سکتی تھی، وہ تو ایک گوشے میں بیٹھ کر تصنیف و تالیف اور تدریس و تعلیم کی خدمات انجام دینے والے بزرگ تھے، پھر ان کی عمر بھی اس قسم کے ہنگاموں میں دخیل ہونے کے قابل نہ تھی۔ اس وقت وہ چھہتر سال سے زیادہ عمر کو پہنچ چکے تھے۔

شیخ کا مکان، مدرسہ اور کتب خانہ

شیخ کے حالات بیان کرتے ہوئے جناب خلیق احمد نظامی نے ان کے مکان مدرسہ اور کتب خانے کے بارے میں بعض ضروری معلومات بہم پہنچائی ہیں اور درج ذیل سطور اسی سے مستفاد ہیں۔

[شہر دہلی میں جو شیخ کا مولد و مدفن ہے] دہلی دروازے سے آگے باغ مہدیاں کے قریب شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا مکان، خانقاہ اور مسجد واقع تھی۔ اس خانقاہ کو خانقاہِ قادریہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا تذکرہ خود شیخ نے مشکوٰۃ کی شرح میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ثم فی الخانقاہ القادری وھذا الفقیر یخدمہ ویکنسہ ویوقد سراجہ۔ کانما تم فی مجلس واحد۔

یہ کتاب خانقاہ قادریہ میں ختم ہوئی جس کی خدمت یہ فقیر کرتا ہے اور اس میں جھاڑو دیتا ہے اور اس کا چراغ روشن کرتا ہے۔ یہ کتاب ایک جلسہ میں ختم ہوئی۔

شیخ کی خانقاہ کا کچھ حصہ انیسویں صدی کے آخر تک موجود تھا۔ منشی برکت علی حفی مصنف مرآۃ الحقائق نے اس کی زیارت کی تھی۔ مسجد کی اس زمانے میں مرمت کرائی گئی تھی۔ شیخ کے مکانات کی زمین کی پیمائش ان کے خاندان کے لوگوں نے کرائی تھی۔ کل رقبہ چھ بیگہ اور چند بسوہ تھا۔ شیخ کے خاندان کے افراد ہی اس پر قابض تھے۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ جس مدرسہ میں شیخ نے تعلیم حاصل کی وہ کہاں تھا۔ اخبار الاخیار میں شیخ فرماتے ہیں، وہ ہمارے گھر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :

ہر روز باوجود غلبۂ برودتِ ہوائے زمستان و شدتِ حرارتِ تابستان، دو بار بمدرسۂ دہلی کہ شاید از منزلِ ما بُعدِ دو میل داشتہ باشد، میل می کردم۔ درمیانہ روز ادنیٰ وقفہ در غربت خانہ بسبب تناولِ چند لقمہ کہ بسبب عادی قوام حرکت ارادیست واقع می شد، و مدتے پیشتر از وقتِ صبح بمدرسہ می رسیدیم و در سایۂ چراغ جزو می کشیدیم[۵۵۶]

موسم سرما کی سخت ٹھنڈی ہواؤں اور موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ میں گھر سے روزانہ دو مرتبہ صبح اور دوپہر کو مدرسے جاتا۔ مدرسہ ہمارے مکان سے تقریباً دو میل دور تھا۔ دوپہر کو مدرسے سے لوٹ کر، دوسروں کی طرح قوتِ ارادی اور حرکتِ جسمانی کو قائم رکھنے کی غرض سے صرف چند نوالے کھالیتا۔ وقتِ صبح سے کچھ پہلے اٹھ کر چراغ کی روشنی میں دو جزو پڑھتا اور پھر اوّل وقت مدرسے پہنچ جاتا۔

یہ مدرسہ پرانے قلعے کے قریب واقع تھا۔ مرآۃ الحقائق کے مصنف منشی برکت علی حفی اس کے متعلق درج ذیل تفصیلات بیان کرتے ہیں :

---

۵۵۶ مرآۃ الحقائق ص ۱۰۳

یہ مدرسہ بعمارتِ پختہ دو منزلہ مع مسجد، مقابل قلعہ کہنہ، لب سڑک دہلی و آگرہ واقع ہے۔ یعنی دروازہ قلعہ کا بجانبِ غرب ہے اور اس مدرسہ کا بسمتِ شرق ہے۔ یہ مکان مدرسہ اب تک بدستور قائم ہے۔ سامنے دروازہ سے مسجد اس کی نظر آتی ہے، اور گرد صحن کے ہر چہار طرف مکانات بنے ہوئے ہیں، اور اس سے زیادہ زینت یہ ہے کہ سمت دکھن جو دیوار مکاناتِ بالا کی ہے، اس میں چند دروازے باہر کی طرف ہیں کہ منجملہ ان کے کوئی دروازہ پتھر اور چونے سے مسدود شدہ ہے اور کوئی بدستور کشادہ ہے کہ یہ ہیئت پلوں سے جانے والوں کو دور سے دکھائی دیتی ہے اور جانب شمال متصل اس مدرسہ کے ایک ایسا ہی مکان عظیم الشان اسی زمانہ کا بنا ہوا ہے اور اس کے دروازہ صدر پر سنگِ سرخ لگا ہوا ہے۔[۵۷]

شیخ کا کتب خانہ دیارِ ہند کا ایک عظیم کتب خانہ تھا اور بیش قیمت علمی ذخائر پر مشتمل تھا۔ ان کے بیٹے شیخ نور الحق اور خاندانِ حقی کے بعض دیگر حضرات وقت کے اکابر علما میں سے تھے، انھوں نے شیخ کے کتب خانے کی بھی حفاظت کی اور اپنے علمی ذوق کی بنا پر اس میں مزید اضافہ بھی کیا لیکن اٹھارویں صدی عیسوی میں جب دہلی کی سیاسی فضا میں انقلاب و تغیر کی مہیب لہریں اٹھیں اور مرہٹوں سکھوں اور جاٹوں نے ہنگامہ آرائی کا ایک وسیع سلسلہ شروع کر دیا تو معنوی اور علمی دولت کے بے انمول خزانے بھی دست بُردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ شیخ نور الحق کے پوتے شیخ الاسلام شرح بخاری کی دوسری جلد کے خاتمے پر شیخ عبدالحق محدث کے کتب خانے کی بربادی کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

درہنگام تشتت بال و پریشانی حال از نہب و غارت خانہ در حملہ شہر کہنہ دہلی کہ باستیلائے کفار عتاۃ باتفاق طغاۃ و بغاۃ واقع شد، ذہاب کتب خانہ قدیمہ و جدیدہ کہ بسیارے ازاں دریں دیار کمیاب بود و بعضے ازاں بہ تصحیح و تحشیہ و تدریس شیخ المحدثین شیخ اجل محقق دہلوی بود، رحمۃ اللہ علیہ ... نماند در خانہ مگر چند کتب در گوشہ ہائے شکستہ افتادہ۔

---

[۵۷] مرآۃ الحقائق ص ۱۰۳

یعنی دہلی کے قدیم شہر میں سرکش و باغی کفار کے غلبہ و استیلاء کے زمانے میں جب عوام میں اضطراب و پریشانی پیدا ہوئی، قتل و غارت کے سلسلے دراز ہوئے اور سلب و نہب کا معاملہ انتہا کو پہنچ گیا تو شیخ المحدثین حضرت علامہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا کتب خانہ بھی اس کی نذر ہو گیا جو اس نواح میں سب سے بڑا کتب خانہ تھا۔ بعض کتابیں خود شیخ محدث کی تصحیح شدہ تھیں، بعض وہ تھیں جو تدریس کے وقت ان کے سامنے رہتی تھیں اور بعض ان کے حواشی اور تعلیقات سے مزین تھیں ... ان میں سے چند کتابیں باقی بچیں اور وہ بھی پھٹی ہوئی اور شکستہ حال ہیں۔

تصنیفات و تالیفات

شیخ عبدالحق محدث رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے مصنف اور شارح تھے۔ اس ضمن میں اللہ کی مدد سے انھوں نے جو خدمات انجام دیں، وہ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ تصنیف و تالیف کے سلسلے کا آغاز انھوں نے طالب علمی ہی کے زمانے میں کر دیا تھا جو زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا۔ ان کی کل تصنیفات کی تعداد ساٹھ ہے۔ بعض مؤرخین ـــ مثلاً عبدالحمید لاہوری[۵۸]، محمد صالح کنبوہ[۵۹] اور خافی خان[۶۰] ـــ نے یہ تعداد سو سے زیادہ بتائی ہے، جو صحیح نہیں۔ شیخ نے اپنے ایک رسالے میں، جسے انھوں نے "تالیف قلب الالیف بذکر فہرس التوالیف" کے نام سے موسوم فرمایا ہے، اپنی تالیفات کی فہرست درج کی ہے۔ اس میں انچاس[۴۹] کتابوں کے نام مندرج ہیں، لیکن اس رسالے کی تالیف کے وقت سلسلۂ تصنیف جاری تھا۔ چنانچہ اس کے آخر میں رقم طراز ہیں:

۵۸ء بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۲۴۱، ۲۴۲

۵۹ء شاہ جہان نامہ (عمل صالح) ج ۲ ص ۳۸۴

۶۰ء منتخب اللباب ج ۱ ص ۲۴۰

ہنوز سلسلۂ سخن دراز است و در فیض الٰہی باز ــــ تا بکجا رسد و بکجا رساند۔

ابھی سلسلۂ تصنیف جاری اور طویل ہے اور باب فیض خداوندی کھلا ہے ــــ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے اور وہ اسے کہاں تک پہنچاتا ہے۔

اس کے بعد مزید گیارہ کتابیں تصنیف کیں، یعنی کل ساٹھ ہو گئیں ــ جو حضرات سو سے زیادہ کتابیں بتاتے ہیں، وہ شیخ کی ایک کتاب "المکاتیب والرسائل" کو اس تعداد میں شامل کرتے ہیں، جو چھوٹے بڑے اڑسٹھ رسائل پر مشتمل ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب مختلف رسائل و مسائل کو محیط ہے مگر درحقیقت یہ ایک ہی کتاب ہے جیسا کہ خود شیخ ممدوح نے اس کی وضاحت کی ہے:

این ہمہ را یک صحیفہ سازند و در یک جلد شیرازہ بہ بندد۔

اسے ایک ہی کتاب سمجھا جائے اور تمام رسائل کی ایک ہی جلد بنائی جائے۔

شیخ محدث کی تصنیفات سے پتا چلتا ہے کہ وہ تمام اصنافِ علم پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے اور اپنے نقطۂ فکر کی وضاحت میں مرتبۂ کمال پر فائز تھے۔ تفسیر، تجوید، حدیث، فقہ، عقائد، اخلاق، تصوف، سیرت، تاریخ، سیاست، منطق، فلسفہ، نحو وغیرہ تمام علوم میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ذیل میں موضوع وار ان کی تصنیفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

تفسیر

تفسیر قرآن سے متعلق شیخ نے مندرجہ ذیل تین کتابیں تحریر کیں:

تعلیق الحاوی علی تفسیر البیضاوی: یہ تفسیر بیضاوی یعنی علامہ عبداللہ بن عمر بیضاوی کی مشہور تصنیف "انوار التنزیل و الاسرار التاویل" کے چند مقامات پر حواشی ہیں۔ شیخ نے ان حواشی کے ذریعے تفسیر بیضاوی کے بعض ضروری مقامات کی توضیح کی ہے اور ان کے خیال کے مطابق بیضاوی میں جو زائد اور مشکل مباحث تھے، ان کو نکال دیا ہے تاکہ حواشی کی افادیت میں مزید اضافہ ہو سکے۔ شیخ کو ان حواشی کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ انھیں بیضاوی کے بعض مقامات

سے شدید اختلاف ہے جس کا اظہار وہ "نکات الحق" میں بایں الفاظ کرتے ہیں:

بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ در تفسیر قرآن و شرحِ احادیث ازیں باب قباحتہا بسیار کردہ، تجاوز اللہ عنہ — واگر آں مواضع را بشمارم سخن دراز گردد۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر قرآن اور تشریح احادیث میں بہت سی لغزشیں کی ہیں، اللہ انھیں معاف فرمائے۔ میں اگر ان مقامات کا شمار کرنے لگوں تو سلسلۂ گفتگو دراز ہو جائے۔!

افسوس ہے ان حواشی کا اب کوئی نسخہ دست یاب نہیں ہے۔

شرح صدور، تفسیر آیت النور: یہ سورۂ نور کی (پینتیسویں) آیت اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ کی تفسیر ہے، جو ایک ہزار سے زائد سطور پر مشتمل تھی بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی اس کا قلمی نسخہ ۱۹۰۲ء تک شیخ محدث کی اولاد امجاد میں کے ایک بزرگ خان بہادر مولوی انوار الحق حقی دہلوی مرحوم کے کتب خانے میں دہلی میں موجود تھا۔[۱۶۶] معلوم نہیں، مرحوم کا کتب خانہ اب کہاں ہے اور کس حال میں ہے یا یہ تفسیر اس میں موجود ہے یا نہیں ہے۔

تحصیل الغنائم والبرکات بتفسیر سورۃ والعادیات: یہ سورۃ والعادیات کے برکات و غنائم پر ڈھائی صفحے کا مختصر نوٹ ہے جو المکاتیب والرسائل میں شامل ہے۔

تجوید و قرأت

شیخ عبدالحق محدث دہلوی قرأت و تجوید میں بھی مہارت رکھتے تھے اور یہ علم انھوں نے شیخ عبدالوہاب متقی سے حاصل کیا تھا۔ اس موضوع میں ان کے درکِ کمال کا یہ عالم تھا کہ اس میں دو کتابیں تصنیف فرمائیں، جو درج ذیل ہیں:

درۃ الفرید فی قواعد التجوید: یہ کتاب اب نایاب ہے اور غالباً برصغیر پاک و ہند کے کسی کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔ اس نام کی ایک تصنیف حافظ طاہر اصفہانی کی بھی ہے۔

---

[۱۶۶] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۶۲

شرح القصیدۃ الجزریۃ: شیخ کی یہ کتاب بھی اسی موضوع سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا ایک نسخہ جو بہترین خط میں لکھا ہوا ہے اور ۱۱۴۸ھ کا مکتوبہ ہے، اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانے میں موجود ہے[۶۲]

حدیث

شیخ کی بہت بڑی خدمت علم وہ ہے، جو انھوں نے علم حدیث کی ترویج و اشاعت کے لیے انجام دی۔ اس باب میں اس پورے خطہ برصغیر میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ تمام تذکرہ نگاروں نے اس میدان میں ان کی تگ و تاز کا نمایاں الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ خافی خاں کہتا ہے:

در کمالات صوری و معنوی و تحصیل علوم عقلی و نقلی، خصوص تفسیر و حدیث در ہندوستان ثانی نداشت[۶۳]

(شیخ عبدالحق) صوری و معنوی کمالات اور علوم نقلی و عقلی کی تحصیل کے سلسلے میں بالخصوص تفسیر و حدیث میں ہندوستان بھر میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

فقیہ و محدث، بقیۃ السلف و حجۃ الخلف، جامع علوم ظاہر و باطن بود، علم حدیث بہ محروسہ ہندوستان از وشیوع یافتہ[۶۴]

وہ فقیہ و محدث، بقیۃ السلف، حجۃ الخلف، جامع علوم ظاہری و باطنی تھے۔ خطہ ہند میں علم حدیث انہی کی مساعی سے اشاعت پذیر ہوا۔

مآثر الکرام میں میر غلام علی آزاد بلگرامی علم حدیث سے متعلق ان کی خدمات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

۶۲؎ لباب المعارف العلمیہ۔ کتاب نمبر ۱۰۹۲

۶۳؎ منتخب اللباب ص ۱۵۵

۶۴؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۱۰۹

بہ نشرِ علوم سیما علم شریف حدیث پرداختہ بہ نہجے کہ در دیارِ عجم احدے را از علمائے متقدمین ومتأخرین دست نداده است۔ ممتاز و مستثنیٰ گردید و در فنونِ علمیہ خاصۃً فنِ حدیث، کتبِ معتبرہ تصنیف کرد۔ چنانکہ علمائے زماں اعتنا بآں ونہ یدہ دستور العمل خود دارند[65]

اشاعتِ علوم، خصوصاً علم حدیث شریف کے نشر و زبوع میں پورے دیارِ عجم میں علمائے متقدمین ومتاخرین میں سے کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ سب سے ممتاز و مستثنیٰ تھے۔ تمام فنونِ علمیہ بالخصوص فنِ حدیث سے متعلق مستند اور لائقِ اعتماد کتابیں تصنیف کیں جن کو علمائے عصر قابلِ اعتنا گردانتے اور اپنے لیے راہنمائے عمل قرار دیتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی مشہور تصنیف تذکرہ میں رقم طراز ہیں:

مولانا جمال الدین کے آخری عہد میں شیخ عبدالحق حجاز سے واپس آئے۔ اللہ نے ان کی عمر میں بڑی برکت دی اور ان کے درس و تصنیف نے ایک پورا سلسلۂ تعلیم ملک میں عام کیا۔

مولانا مزید لکھتے ہیں:

حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دورِ علم و تعلم کے بانی ہوئے، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی، تصنیف و تراجم کی بنیاد ڈالی گئی۔ خود شاہ صاحب نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ پھر ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحق نے صحیح بخاری کا۔!

نواب صدیق حسن خاں ان کے متعلق ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

شیخ عبدالحق دہلوی، فقیہ حنفی و علامۂ دین حنیفی است، واما بمحدث مشہور است وترجمہ او بر مشکوٰۃ وجز آں از مؤلفات نافعہ ممتعہ معروف ... دست گاہش در فقہ بیشتر از مہارت در علوم سنتِ سنیہ است، ولہٰذا جانب داری اہل رائے جانب او

---

[65] مآثر الکلام دفتر ۱ ص ۱۸۸

گرفتہ۔ معٰہذا جا ہا حمایت سنتِ صحیحہ نیز نمودہ۔ طالب علم را باید کہ در تصانیف وے خذ ما صفا و دع ما کدر پیش نظر دارد[٦٦]

شیخ عبدالحق دہلوی فقیہ حنفی اور علامہ دین اسلام ہیں۔ وہ محدث کی حیثیت سے مشہور ہیں اور ترجمہ مشکوٰۃ اور دیگر مؤلفاتِ نافعہ و مفیدہ میں معروف ... لیکن علوم سنت نبویہ میں مہارت کی نسبت فقہ میں زیادہ دسترس رکھتے ہیں۔ اس لیے اہل الرائے کے لیے جانب داری سے کام لیتے ہیں۔ تاہم بہت سے مقامات میں سنتِ صحیحہ کی حمایت بھی فرماتے ہیں۔ طالب کو چاہیے کہ ان کی تصانیف سے استفادہ کرتے وقت خذ ما صفا و دع ما کدر کے اصول کو پیش نظر رکھے۔

نواب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:

حق ایں است کہ شیخ عبدالحق رحمہ اللہ تعالیٰ در ترجمۂ عربی بفارسی یکے از افراد ایں امت است۔ مثلِ او دریں کار و بار خصوصًا دریں روزگار احدے معلوم نیست[٦٧]

حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے میں اس امت کے یگانہ روزگار فرد ہیں۔ اس معاملے میں بالخصوص اُس عہد میں بجز ان کے کسی اور کا پتا نہیں چل سکا جو ان کا ہمسر ہو۔

علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی فرماتے ہیں:

اوّل من نشر علم الحدیث بارض الھند تصنیفاً و تدریسًا[٦٨]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی پہلے عالم دین ہیں، جنھوں نے تصنیف و تدریس کے ذریعے سرزمینِ ہند میں علمِ حدیث کی نشر و اشاعت کی۔

مولوی فقیر محمد جہلمی لکھتے ہیں:

٦٦ے تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار۔ ص ۱۱۲

٦٧ے ایضاً، ص ۱۱۳

٦٨ے نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۰۱

آپ ہی ہیں جنھوں نے پہلے پہل حدیث کا علم، عرب سے لاکر اس سے ہندوستان کو منور کیا اور اپنی تصنیفات سے علمِ حدیث کو ہند کے ہر ایک خطہ وقطعہ میں پھیلایا [۶۹]

بہرحال علمِ حدیث کی ترویج و اشاعت میں انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور اس موضوع سے متعلق تیرہ [۱۳] کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں، جن میں بعض کتابیں بڑی ضخیم ہیں اور بعض مختصر! ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

اشعۃ اللمعات فی شرح المشکوٰۃ: یہ فارسی زبان میں مشکوٰۃ شریف کی بڑی جامع اور مفصل شرح ہے۔ اس عظیم خدمتِ حدیث کا آغاز شیخ موصوف نے ۱۰۱۹ھ کو دہلی میں کیا تھا جس کا سلسلہ ۱۰۲۵ھ تک جاری رہا۔ دیگر علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ چھ سال کی مسلسل محنت اور پیہم تگ و تاز کے بعد یہ اہم کام تکمیل کو پہنچا۔

اشعۃ اللمعات: چار جلدوں کو محیط ہے، پہلی جلد میں ایک مقدمہ بھی ہے جو انتالیس [۳۹] صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مقدمہ، علم حدیث، محدثین اور اقسامِ حدیث پر مشتمل ہے اور نہایت عالمانہ اور محققانہ مواد اپنے دامنِ صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ مقدمے میں اختصار کے ساتھ امام بخاری، امام مسلم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، ابن ماجہ، دارمی، دارقطنی، بیہقی، رزین، نووی، ابن جوزی کے حالات بیان کیے ہیں۔ معلومات کے اعتبار سے یہ مقدمہ چوں کہ خاص اہمیت وافادیت کا حامل ہے، اس لیے ۱۳۰۵ھ کو مطبع اعظم جون پور سے اس کو علیحدہ بھی شائع کیا گیا۔

اس مقدمے کے علاوہ اشعۃ اللمعات کی پہلی جلد مشکوٰۃ کی مندرجہ ذیل پانچ کتابوں کے ترجمے پر مشتمل ہے:

۱۔ کتاب الایمان۔ (۲) کتاب العلم (۳) کتاب الطہارت (۴) کتاب الصلوٰۃ

---

[۶۹] حدائق الحنفیہ ص ۴۰۹

(۵) کتاب الجنائز۔

دوسری جلد میں مندرجہ تحت چھ کتابیں شامل ہیں۔

(۱) کتاب الزکوٰۃ (۲) کتاب الصوم (۳) کتاب فضائل القرآن۔ (۴) کتاب الدعوات (۵) کتاب اسماء اللہ تعالیٰ (۶) کتاب المناسک۔

تیسری جلد درج ذیل نو کتابوں کو محتوی ہے۔

(۱) کتاب البیوع (۲) کتاب العتق (۳) کتاب الحدود (۴) کتاب الامارت و القضاء (۵) کتاب الجہاد (۶) کتاب الصید والذبائح۔ (۷) کتاب الاطعمۃ (۸) کتاب اللباس (۹) کتاب الطب والرقی۔

چوتھی جلد میں دو کتابیں ہیں جو یہ ہیں:

(۱) کتاب الآداب (۲) کتاب الفتن

لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح: یہ عربی زبان میں مشکوٰۃ کی شرح ہے جو دو جلدوں کو مشتمل ہے۔ اس کی تسوید و تحریر کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب شیخ ممدوح اشعۃ اللمعات کی تصنیف میں مصروف تھے۔ اس اثنا میں بعض ایسے مباحث سامنے آئے جن کو فارسی میں منتقل کرنا مناسب نہ سمجھا، کیوں کہ فارسی اس دور کے عوام کی زبان تھی اور یہ وہ مباحث تھے، جن کی وضاحت عوام کے لیے بوجوہ خلاف مصلحت تھی، لہٰذا انھیں فارسی کے بجائے عربی کے قالب میں ڈھالا گیا۔ اس ضمن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ فرماتے ہیں کہ مختلف مباحث کی نزاکت کے پیش نظر فارسی اور عربی دونوں شرحوں کی تسوید شروع کی گئی اور عربی کی شرح فارسی سے پہلے مکمل ہو گئی۔[۵۷]

لمعات التنقیح سے شیخ محدث ۲۴ رجب ۱۰۲۵ھ کو فارغ ہوئے ـــ اس شرح کی خوبی یہ ہے کہ اس میں بعض لغوی و نحوی مشکلات کی نہایت عمدگی سے عقدہ کشائی کی گئی ہے اور فقہی مسائل کی بہت سی پیچیدگیوں کو بہترین اسلوب سے حل کیا گیا

---

[۵۷] اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۲

ہے۔ اس کے آغاز میں ایک مقدمہ ہے جو بڑی جامعیت اور افادیت کا حامل ہے۔ یہ مقدمہ مولانا احمد علی سہارن پوری نے مشکوٰۃ کے متن کے ساتھ شائع کیا ہے۔

جمع الاحادیث الاربعین فی ابواب علوم الدین وترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین — یہ کتاب یعنی جمع الاحادیث الاربعین فی ابواب علوم الدین۔ ان چالیس احادیث کا مجموعہ ہے، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں اور حکمرانوں کو ہدایات ونصائح سے نوازا ہے۔ اور ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین، ان احادیث کے فارسی ترجمے کا نام ہے۔ یہ ترجمہ شیخ نے شاہ جہان کے لیے کیا تھا۔

جامع البرکات منتخب شرح المشکوٰۃ: اس کتاب کو شرح مشکوٰۃ کے خلاصے کی حیثیت حاصل ہے اور دو جلدوں کو محیط ہے۔ یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جو بقولِ شیخ "شاملِ فوائدِ کثیرہ وعوائدِ عزیزہ" ہے۔ اس کا انداز کیا ہے؟ شیخ فرماتے ہیں — "در ہر باب یک دو تین حدیث ذکر دہ وباقی احادیث بر مضامینِ آں اقتصار کردہ واختصار نمودہ شدہ است"[۷۱]

یہ کتاب ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے مولوی انوار الحق دہلوی مرحوم کے کتب خانے موجود تھے[۷۲]

رسالہ اقسامِ حدیث: یہ عربی زبان میں علمِ حدیث سے متعلق ایک مفید رسالہ تھا۔ فہرس التوالیف میں شیخ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ مولوی انوار الحق دہلوی مرحوم کے کتب خانے میں اس کا قلمی نسخہ موجود تھا۔[۷۳]

۷۱؎ فہرس التوالیف

۷۲؎ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۷۰

۷۳؎ ایضاً

رسالہ شبِ برأت : شیخ محدث کا یہ رسالہ فارسی زبان میں تھا۔ فہرس التوالیف میں اس کا نام مذکور نہیں۔ گزشتہ صدی تک اس کا قلمی نسخہ شیخ کے خاندان میں موجود تھا[۱۰۵]

ما ثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ : یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ماہِ محرم سے لے کر ماہِ ذی الحجہ تک یعنی سال بھر کے قمری مہینوں میں کن دینی امور کی انجام دہی احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔ عاشورۂ محرم کے باب میں جو صحیح احادیث مروی ہیں، وہ اس میں درج کر دی گئی ہیں اور ان توہمات کی تردید کی گئی ہے، جو محرم کے سلسلے میں مشہورِ عوام ہیں۔ مثلاً یہ جو کہا جاتا ہے کہ جو شخص یومِ عاشورہ کو سرمہ لگائے گا اسے کبھی آشوبِ چشم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ یا یہ کہ اس دن غسل کرنے والا کبھی کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوتا، شیخ نے اس کتاب میں ان باتوں کو لغو اور باطل قرار دیا ہے۔ پھر جو احادیث حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تعلق رکھتی ہیں، ان پر محدثانہ نقطہ نگاہ سے ناقدانہ بحث کی ہے۔ آخر میں حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے تعلقات کا ذکر فرمایا ہے۔ ماہِ صفر کے بارے میں اس خیال کی تردید فرمائی ہے کہ یہ نامبارک اور منحوس مہینہ ہے۔ شعبان، رمضان، شوال، ذی الحجہ کے ذکر میں روزہ، تراویح، عید الفطر صیامِ شوال، حج اور عید الاضحیٰ وغیرہ کے متعلق مروی احادیث کو جمع کر دیا ہے۔ ماہِ ربیع الاول کے مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے مختصر حالات درج کیے ہیں۔ ربیع الثانی کے ضمن میں اختصار کے ساتھ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے سوانح بیان فرمائے ہیں۔

یہ کتاب ۱۲۵۳ھ کو کلکتہ سے اور ۱۳۰۷ھ کو لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ ۱۳۰۹ھ میں سبحان بخش شکارپوری نے "اعمالِ ماثورہ" کے نام سے اس کو مع ترجمہ دہلی سے

---

[۱۰۵] حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۷۰

شائع کیا تھا۔اس کے قلمی نسخے بھی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

الاکمال فی اسماء الرجال : شیخ عبدالحق نے فہرس التوالیف میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ ڈاکٹر زبید احمد نے اپنی تصنیف " دی کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو دی عربک لٹریچر" میں، حدیث سے متعلق عربی تصانیف کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ کتاب کتب خانہ دہلی اور کتب خانہ بانکی پور میں دستیاب ہے اور علی الترتیب اس کا نمبر ۱۰۵ اور ۷۳۲ ہے۔

اسماء الرجال والرواۃ المذکورین فی کتاب المشکوٰۃ : اس کتاب میں جیساکہ نام سے ظاہر ہے، ان تمام رواۃِ حدیث کا تذکرہ ہے، جن کا ذکر مشکوٰۃ میں آیا ہے۔ سب سے پہلے خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کے حالات حروف تہجی کی ترتیب سے معرض کتابت میں لائے گئے ہیں۔ شیخ کی یہ عمدہ ترین تصنیف اب تک اشاعت کے مراحل سے نہیں گزری۔ اس کا ایک قلمی نسخہ بانکی پور کی لائبریری میں موجود ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی غالباً برصغیر کے دوسرے عالم ہیں جنھوں نے اسماء الرجال کے موضوع پر اس انداز کی کتاب تصنیف کی۔ اس سے پہلے صاحبِ مشارق الانوار امام حسن صغانی لاہوری (متوفی ۶۵۰ھ) نے درالسحابہ فی بیان مواضع وفیات الصحابہ تصنیف فرمائی تھی۔ اس کتاب میں امام ممدوح نے ان مقامات کا ذکر کیا ہے، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آٹھ سو کے قریب صحابہ کرام نے وفات پائی۔ اس میں صحابہ کے اسمائے گرامی بترتیب حروفِ ہجا لکھے گئے ہیں۔

شرح سفر السعادۃ : سفر السعادۃ علامہ مجدالدین فیروزآبادی کی تصنیف ہے جو لغت کی مشہور کتاب قاموس کے مصنف تھے۔ علامہ موصوف باقاعدہ ہندوستان سے تعلق تو نہ رکھتے تھے، البتہ دو مرتبہ واردِ ہند ہوئے تھے۔ پہلی بار فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دوسری مرتبہ محمود شاہ تغلق کے زمانے میں۔ ہندوستان کے شاہی درباروں میں اس عالمِ دین کی بے حد قدر افزائی ہوئی اور انھیں شاہانہ سرپرستی کا مستحق سمجھا گیا۔ حدیث کے موضوع پر سفر السعادۃ ان کی ایک شاندار تصنیف ہے،

جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث جو عبادات اور زندگی کے ضروری مسائل سے متعلق ہیں، جمع کی گئی ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کتاب کی گوناگوں افادیتوں کے پیشِ نظر اس کی شرح لکھنا شروع کی تھی۔ لیکن چوں کہ علامہ فیروز آبادی خالص محدثانہ نقطۂ فکر کے حامل ہیں اور صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور فرامینِ اقدس کو مشعلِ راہ اور مرکزِ دلیل ٹھہرانے کے حامی ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ آئمہ مجتہدین سے متعدد مسائل میں اختلاف بھی کرتے ہیں اس لیے حضرتِ شیخ ان سے مختلف رجحان رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ (علامہ فیروز آبادی) "در مبالغہ و افراط از حدِ اعتدال و جادۂ انصاف بیروں رفتہ است۔"

شیخ محدّث سفر السعادۃ کے بارے میں یہ تو مانتے ہیں کہ اس کے مصنف کا مقصد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمالِ مبارکہ کو حدیث کی روشنی میں ثابت کرنا ہے۔ "مقصد وے دریں کتاب آنست کہ اعمالِ شریفہ حضرت نبویہ را از عبادات و عادات باحدیث اثبات کردہ، و تصحیح نمودہ و ہر دو انکار بر آنچہ مخالف آں از مذاہب اربعہ واقع شدہ تصریح کردہ است۔" لیکن ساتھ ہی رقم طراز ہیں "پس در شرح تائید مذاہب اربعہ خصوصاً مذہب حنفی و معارضہ کلامِ مصنف ادعائے صحت احادیث موافق مدعائے خود نمودہ، رقم رد و بطلان بر خلاف آں کشیدہ است، کردہ شد۔"

بہر حال شیخ عبدالحق کی شرح سفر السعادۃ تین حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول میں ان احادیث اور ان کے اسناد و رجال پر بحث کی گئی ہے جو علامہ فیروز آبادی نے کتاب میں درج فرمائی ہیں۔ حصہ دوم میں مجتہدین کے فقہی رجحانات کو زیر بحث لایا گیا ہے، بالخصوص مذہب حنفی کے اصولوں کی حمایت کی گئی ہے، اور درحقیقت جیسا کہ خود شیخ فرماتے ہیں، سفر السعادۃ کی شرح لکھنے کا اصلی اور بنیادی باعث یہی ہے۔ حصہ سوم میں احکام شرعی کو تفصیل بیان کیا گیا ہے۔

سفر السعادۃ کی یہ شرح شیخ نے پچھتر سال کی عمر میں لکھنا شروع کی تھی، انہیں خیال تھا کہ شاید وہ یہ اہم کام مکمل نہ کر پائیں اور اس کی تکمیل سے قبل ہی دنیا سے رخصت ہو جائیں، اس لیے اپنے بیٹے مولانا نور الحق کو اس کے مکمل کرنے کی وصیت فرمائی اور ساتھ ہی کام کی اہمیت کے پیش نظر ان کتابوں کی فہرست بھی درج کر دی، جو شرح کرتے وقت ان کے پیش نگاہ تھیں۔ فہرست درج کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مولانا نور الحق کو کام کی تکمیل کے سلسلے میں کتابوں کی تلاش میں دقت نہ پیدا ہو:

"وصیت می کنم فرزند عزیز نور دیدۂ دانش و بینش نور الحق را کہ وجود ثانی و مقصود اولیٰ من است . . . این مہم را صورت دہد"۔[۷۵]

شرح سفر السعادۃ ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء) میں کلکتہ سے اور ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۵ء اور ۱۹۰۳ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے قلمی نسخے دنیا کی مختلف لائبریریوں مثلاً لندن کی انڈیا آفس لائبریری، حیدر آباد دکن، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، کلکتہ مدرسہ، پشاور اور بانکی پور کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ بانکی پور کا نسخہ خود حضرت شیخ محدث کے ہاتھ کا مکتوبہ ہے اور اس کے آخر میں یہ الفاظ درج ہیں:

ثم انہ کان تسوید ھذا الکتاب بین الصلوٰۃ من یوم الاثنین الرابع والعشرین من شھر جمادی الاولیٰ سنۃ ست عشر والف والحمد للہ۔ ثم تم انتساخ ھذہ النسخۃ ومقابلتھا علیٰ ید مولفہ الفقیر الی اللہ عبد الحق بن سیف الدین بن سعد اللہ سحرہ یوم الثلاثا السابع والعشرون من جمادی الاخریٰ سنۃ الف وثلاث وثلاثین من ھجرۃ سید الاولین والاخرین۔[۷۶]

انڈیا آفس لائبریری لندن کا نسخہ خود مصنف کا تصحیح شدہ ہے۔ حیدر آباد (دکن) کا نسخہ ۱۰۸۶ھ (۷۶-۱۶۷۵ء) کا، ایشیاٹک سوسائٹی کا ۱۰۸۷ھ کا اور کلکتہ مدرسہ کا ۱۰۹۳ھ کا مکتوبہ ہے۔

---

۷۵ ملاحظہ ہو شرح سفر السعادۃ۔ ص ۲، ۴۔

۷۶ حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۷۵، بحوالہ فہرست بانکی پور لائبریری، ج ۱۳، ص ۴۷۔

شرح سفر السعادۃ کا ایک نسخہ مرزا مظہر جان جاناںؒ کے پاس تھا اور یہ وہ نسخہ تھا جو شیخ کے زیرِ درس رہ چکا تھا۔ مرزا صاحب اس نسخے کو نہایت احتیاط اور قدر سے رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے ایک دوست فریدالدین نے یہ نسخہ عاریتاً مانگا تو مرزا صاحب نے ایک شخص محمد عظیم کے ہاتھ بھیج تو دیا مگر ساتھ ہی یہ خط بھی لکھا کہ یہ نسخہ میرے نزدیک قابلِ احترام ہے۔ کیوں کہ یہ مصنف کے درس میں رہ چکا ہے اور اس پر خود شیخ عبدالحق کے ہاتھ کے حواشی لکھے ہوئے ہیں۔ میں اس کی بے حد قدر کرتا ہوں، آپ بھی اس کی اسی طرح قدر کریں، جس کا یہ مستحق ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے الفاظ یہ ہیں:

نسخہ شرح سفر السعادۃ موجود است، اما میان ما و شما وعدہ آں نبود، ہر گاہ شما طلبید بد مستحق تر از شما کیست۔ آں را ہم حوالہ محمد عظیم کردیم۔ ایں نسخہ از درس مصنف گزشتہ و حواشی بدست مصنف دارد و خط شیخ عبدالحق را می شناسم۔ قدرِ آں را بدانید، و بآب و تاب نگاہ دارید چنانچہ ہست[۷۷]

تحقیق الاشارۃ فی تعمیم البشارۃ بالجنۃ: یہ شیخ کا مرتب کردہ ایک مجموعہ احادیث ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تمام احادیث جمع کر دی گئی ہیں، جن میں رسول اکرم کی طرف سے کسی صحابیِ رسول کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ اس مجموعے کے آخر میں شیخ محدث نے وہ احادیث بھی درج کر دی ہیں جو اہلِ بیتِ رسول کے فضائل و مناقب سے متعلق ہیں۔ یہ احادیث انھوں نے ابن اثیر کی جامع الاصول اور علی متقی کی تصنیف کنز العمال سے جمع کی ہیں۔ ڈاکٹر زبید احمد "دی کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو عربک لٹریچر" میں لکھتے ہیں کہ اس کا ایک نسخہ دہلی کے ایک کتب خانے میں موجود ہے۔

ترجمہ مکتوب النبی فی تعزیۃ ولد معاذ بن جبل: یہ رسول اللہ صلی

---

[۷۷] حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۷۵ بحوالہ کلماتِ طیبات ص ۶۶۔

اللہ علیہ وسلم کے اس تعزیتی مکتوب کا فارسی ترجمہ ہے، جو حضور نے اپنے مشہور صحابی معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ان کے بیٹے کی وفات کے موقع پر لکھا تھا۔ شیخ کی تصنیف المکاتیب والرسائل میں اس مکتوب کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے جو دو صفحوں پر مشتمل ہے۔[۵۵]

فقہ

علم فقہ سے متعلق شیخ محدث نے تین کتابیں تصنیف فرمائیں، جن کا مختصر تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے۔

فتح المنان فی تائید النعمان: یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور فقہِ حنفی کی تائید میں ہے۔ اس میں شیخ نے مختلف عنوانات قائم کر کے احادیث جمع کی ہیں اور ان میں ائمہ اربعہ کے منضبط شدہ مسائل بیان کیے ہیں۔ آخر میں محاکمہ ہے اور مسائل فقہ کے سلسلے میں ماخذِ ائمہ پر بحث ہے جس میں امام ابو حنیفہؒ کے ماخذِ فقہی کو دیگر ائمہ کے ماخذ پر ترجیح دی ہے۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں دستیاب ہے۔

الفوائد: یہ بھی فقہ اور عقائد کے بارے میں شیخ کا ایک رسالہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بانکی پور لائبریری میں موجود ہے۔

ھدایۃ الناسک الی طریق المناسک: یہ رسالہ مناسکِ حج اور آدابِ زیارتِ حرمین کے متعلق ہے۔

عقائد

عقائدِ اسلام سے متعلق شیخ کی کتاب تکمیل الایمان وتقویۃ الایمان ہے جو فارسی زبان میں ہے۔ اپنے موضوع میں یہ ایک جامع کتاب ہے، جس میں ایمان، اس کی نوعیت، عذابِ قبر، جبر و اختیار، بعثت، معراج، شفاعت، جنت و دوزخ

---

[۵۵] ملاحظہ ہو المکاتیب والرسائل ص ۲۸۶ تا ۲۸۸

توبہ، استمداد از قبور، معجزات، اہلِ بیت وغیرہ عنوانات پر اہلِ سنت کے نقطۂ نظر کو نہایت وضاحت اور عمدہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے اور کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔ ۱۸۷۳ء میں میر علی نے اس کا اردو ترجمہ "سیل الجنان" کے نام سے کان پور سے شائع کیا تھا۔ ۱۸۸۱ء میں یہ دوسری مرتبہ طبع ہوئی۔

تکمیل الایمان کے قلمی نسخے برٹش میوزیم، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد، انڈیا آفس لائبریری لندن، بانکی پور لائبریری اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور وغیرہ میں موجود ہیں۔ بانکی پور میں اس کا ایک ایسا نسخہ بھی ہے جو خود مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا تصحیح شدہ ہے[۷۹]

تصوف

تصوف کے مختلف گوشوں کے متعلق شیخ عبدالحق دہلوی نے دس کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

تنبیہ العارف بما وقع فی العوارف: یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ اس کی تصنیف کا پس منظر شیخ عبدالقادر جیلانی کا یہ قول ہے:

قدمی ھذا علی رقبۃ کل ولی اللہ۔

کہ میرا یہ قدم ہر ولی اللہ کی گردن پر ہے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی نے عوارف المعارف میں اس قول پر اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر نے یہ بات بحالتِ سکر کہی تھی۔ شیخ عبدالحق نے تنبیہ العارف بما وقع فی العوارف میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور لکھا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی نے یہ بات بحالتِ صحو کہی تھی اور اللہ کے حکم کے مطابق کہی تھی۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ رام پور لائبریری میں موجود ہے۔ رام پور کی فہرست

---

۷۹ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۷۸

کتب میں اس کا نام الرسالۃ فی بیان قول قدمی ھذا علی رقبۃ کل ولی اللہ درج ہے۔

تحصیل التعرف فی معرفۃ الفقہ والتصوف: یہ بھی عربی میں ہے۔ اس میں فقہ اور تصوف یا شریعت اور طریقت میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔ مرأۃ الحقائق میں لکھا ہے کہ اس کا قلمی نسخہ مولوی انوار الحق حقی کے کتب خانے میں موجود تھا۔

شرح فتوح الغیب: فتوح الغیب شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اٹھتر مواعظ کا دلچسپ مجموعہ ہے جس میں دینی مسائل کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں بطریق تصوف بیان کیا گیا ہے۔ شیخ عبد الحق دہلوی نے "شرح فتوح الغیب" کے نام سے فارسی میں اس کی شرح قلم بند کی۔ یہ کتاب ۱۰۲۳ھ کو مکمل ہوئی۔ "شرح فتوح الغیب" ۱۲۸۳ھ میں "فتوح الغیب" کے متن کے ساتھ لاہور سے چھپی تھی۔ ۱۲۹۸ھ میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے بھی شائع ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے بھی یورپ اور برصغیر کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔

ترجمہ غنیۃ الطالبین: غنیۃ الطالبین شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ اس میں شیخ نے بہت سے دینی مسائل بیان کیے ہیں، جن میں ایک بحث تہتر فرقوں کے متعلق ہے، جو بڑی علمی بحث ہے۔ شیخ عبد الحق نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔ معلوم نہیں کہ یہ ترجمہ کہیں موجود ہے یا نہیں۔

انتخاب المثنوی المولوی المعنوی: یہ کتاب دو ہزار تین سو سطور پر مشتمل تھی۔ اب نایاب ہے۔

توصیل المرید الی المراد بہ بیان الاحزاب والاوراد: یہ فارسی زبان میں ایک رسالہ ہے جس میں ادعیہ و اوراد کے بارے میں محدثین اور مشائخ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ ۱۲۹۹ھ کو یہ رسالہ مطبع مفید عام آگرہ سے چھپا تھا۔

مرج البحرین فی الجمع بین الطریقین: اس میں قرآن و حدیث اور کتب تصوف کے حوالوں سے شریعت و طریقت، تصوف و فقہ اور علم و عقل کے بارے

میں بحث کی گئی ہے۔ کتاب فارسی میں ہے اور تیرہ[۱۳] وصال پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۲۶۵ھ کو مطبع عبدالرحمٰن سے اور ۱۲۷۴ھ کو مطبع محمدی کلکتہ سے شائع ہوئی تھی "وصال السعدین" کے نام سے مولوی غوث محمد فرخ آبادی نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جو ۱۳۱۴ھ کو مطبع نامی لکھنؤ میں چھپا تھا۔ مولوی شیخ عبدالقادر نے "شرح البحرین" کے نام سے فارسی زبان میں اس کی شرح بھی سپرد قلم کی تھی۔ بانکی پور لائبریری میں مرج البحرین فی الجمع بین الطریقین کا ایک ایسا قلمی نسخہ بھی موجود ہے، جو خود شیخ عبدالحق محدث کا تصحیح شدہ ہے۔

نکات الحق و الحقیقہ من باب معارف الطریقہ: یہ فارسی زبان میں ہے اور تصوف کے مختلف مسائل پر مشتمل ہے۔ ۱۸۹۱ء میں مولوی محمد یوسف مرادآبادی نے یہ کتاب مطبع احتشامیہ مرادآباد سے شائع کی تھی۔ لطائف الحق کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

جواب بعض کلمات شیخ احمد سرہندی: حضرت مجدد الف ثانی کے نام شیخ کا یہ ایک طویل مکتوب ہے۔

رسالہ وجودیہ: یہ شیخ محدث کا ایک رسالہ ہے جو مولوی انوارالحق حقی دہلوی کے کتب خانے میں موجود تھا۔[۵۸]

اخلاق

آداب و اخلاق کے موضوع پر شیخ محدث نے چار کتابیں تصنیف فرمائیں، جن کا تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے:

آداب الصالحین: یہ کتاب درحقیقت امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء علوم الدین کے چند ابواب کا فارسی زبان میں ایک خلاصہ ہے، جو چھپ چکا ہے۔ ۱۲۶۳ھ میں نواب الدین خاں دہلوی "ہادی الناظرین" کے نام سے اس کا اردو ترجمہ

---

۵۸ مرأۃ الحقائق ص ۵۵

شائع کیا تھا۔ ۱۲۹۰ھ میں یہ اُردو ترجمہ دوسری دفعہ شائع ہوا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے مولانا عبدالعزیز ہی کی وساطت سے آداب الصالحین کا ایک ایسا قلمی نسخہ دیکھا تھا، جس کی تصحیح خود کتاب کے مصنف شیخ محدث دہلوی نے اپنے ہاتھ سے کی تھی[۸۱]

آداب اللباس : اس رسالے میں شیخ نے لباس کے بارے میں اتباعِ سنت کی تلقین فرمائی ہے اور اس لباس کی تفصیل بیان کی ہے جو شرعاً ممانعت اور کراہت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس کے قلمی نسخے برٹش میوزیم، برلن، دہلی اور بانکی پور وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ایک مرتبہ یہ رسالہ اردو ترجمہ کے ساتھ چھپ بھی چکا ہے۔

آداب المطالعۃ والمناظرۃ : یہ ایک مثنوی ہے جو شیخ نے طالب علمی کے زمانے میں آدابِ مناظرہ اور آدابِ گفتگو کے متعلق لکھی تھی۔ یہ مثنوی اب دستیاب نہیں۔

تسلیۃ المصاب لنیل الاجر والثواب : اس رسالے میں مصیبت کے وقت صبر کرنے اور اللہ سے اجر و ثواب حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

وظائف و اوراد

وظائف و اوراد اور اعمال کے موضوع سے متعلق شیخ نے پانچ کتابیں تصنیف کیں۔ جو یہ ہیں :

اجوبۃ الاثناعشر فی توجیہ الصلوٰۃ علی سید البشر : اس کا ایک قلمی نسخہ مولوی انوار الحق حقی دہلوی کے کتب خانے میں ۱۹۰۲ء تک موجود تھا[۸۲]

ترغیب اہل السعادات علی تکثیر الصلوٰۃ علی سید الکائنات : یہ فارسی زبان میں ایک مختصر رسالہ ہے اور درود شریف کی فضیلت سے متعلق ہے۔

---

[۸۱] حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۸۸۔

[۸۲] ، ، بحوالہ مرأۃ الحقائق ص ۴۸۔

رسالہ عقد انامل : یہ فارسی زبان میں انگلیوں پر اوراد کا شمار کرنے کے بارے میں ایک رسالہ ہے۔

مطلب الاعلیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ : اس رسالے میں اسمائے الٰہی کے خواص بیان کیے گئے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ مع متن کے مولوی قطب الدین نے محرم ۱۲۶۹ھ کو مطبع مصطفائی لکھنؤ سے شائع کیا تھا۔

منطق اور فلسفہ

شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے منطق اور فلسفہ کے موضوع سے متعلق عربی زبان میں تین کتابیں قلم بند کیں ہیں۔

بناء المرفوع فی ترصیص مباحث الموضوع۔

درۃ البہیہ فی اختصار الرسالۃ الشمسیہ۔

شرح شمسیہ۔

تاریخ

تاریخ ایک نہایت اہم موضوع ہے، اس پر شیخ محدث تین کتابیں ضبطِ تحریر میں لائے، جو یہ ہیں۔

جذب القلوب الی دیار المحبوب : یہ فارسی زبان میں مدینہ طیبہ کی تاریخ ہے اور مندرجہ ذیل سترہ ابواب کو محتوی ہے۔

اسمائے ایں بلدۂ عظیم۔

در ذکر فضائل و محامد وے کہ بہ احادیث و آثار بہ ثبوت رسیدہ۔

در اخبار سکان ایں بقعۂ کرامت نشان در قدیم الزمان۔

در انبعاث باعثۂ قدوم سید الکائنات بدیں بلدہ۔

در ہجرت نمودن سید المرسلین۔

در کیفیت عمارت مسجد نبوی۔

در میان تغیرات و زیارتہا کہ در مسجد شریف بعد از حضرت راہ یافتہ۔

در فضائل مسجد شریف و روضۂ آنحضرت ۔
در ذکر عمارت مسجدِ قبا و بیان سائر مساجد نبوی
در ذکر بعض آثار متبرکہ کہ بشرفِ حضور فائض النور مشہور اند
در ذکر بعض اماکن شریفہ کہ در ما بین مکہ و مدینہ مشہور و معروف اند۔
فضائل مقبرۂ شریفہ ۔
فضائل جبل احد و شہدا
فضائل زیارتِ حضرت سید الانام
در حکم زیادتِ قبر شریف
در آداب زیارتِ حضرت سید الانام و اقامت در آں عالی مقام ۔
فضائل و آداب صلوٰۃ بر سید کائنات

اس کتاب کی تالیف میں حضرت شیخ نے زیادہ تر سید نور الدین علی کی تصنیف "وفاء الوفا باخبار المصطفیٰ" سے استفادہ کیا ہے۔ اس کی تسوید کا آغاز ۹۹۸ھ کو مدینہ منورہ میں کیا تھا اور اختتام ۱۰۰۱ھ کو دہلی میں ہوا۔ اس بات کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :

وابتدائے تسوید ایں حروف در سنہ ثمان وتسعین وتسع مائۃ در مدینہ منورہ بودہ وتوفیق تبییض آں در سنہ احدی و الف در بلدۂ دہلی یافتہ [۵۸۳]

جذب القلوب الی دیار المحبوب نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ کلکتہ، لکھنو اور دہلی سے کئی بار چھپی۔ سب سے پہلے متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد، ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۶ء) کو مطبع انڈیمان سن کلکتہ سے ٹائپ میں شائع ہوئی - اس کا اردو ترجمہ بھی "تاریخ مدینہ" کے نام سے چھپ چکا ہے۔
ہندوستان کی بانکی پور لائبریری کی زینت اس کتاب کا ایک ایسا قلمی نسخہ

---

۵۸۳ جذب القلوب - ص ۶

ہے، جو شیخ محدث کی وفات سے صرف چار سال بیشتر — ۹ صفر ۱۰۴۸ھ کو — نقل کیا گیا تھا — کیمبرج یونیورسٹی میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جو اچھی حالت میں ہے ۔[۸۴]

ذکرِ ملوک: یہ تاریخ سلاطینِ ہند ہے جو ذکرِ ملوک یا تاریخِ حقی کے نام سے موسوم ہے ۔ کتاب سلطان شہاب الدین محمد غوری سے جلال الدین اکبر کے چالیسویں سنِ جلوس تک کے حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ اس کا آغاز قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتا ہے :

اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۔[۸۵]

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مرحوم کے خیال کے مطابق یہ کتاب "غالباً (شیخ محدث کے) قیام فتح پور سیکری کے زمانے میں شروع ہوئی" جو اکبری حکومت کے پورے جاہ و جلال کا دور تھا اور اس کے چالیسویں سنِ جلوس یعنی شیخ محدث کے حجاز سے واپسی کے تین چار سال بعد (۱۰۰۴ھ میں) پایۂ تکمیل کو پہنچی، مگر اس میں فاضل مصنف نے اکبر کے خلاف کوئی بات نہیں لکھی ۔ شیخ محدث فرماتے ہیں :

و از اولِ جلوس تا الآن کہ از مدتِ سلطنتِ عظمیٰ و دولتِ کبریٰ ایں شہنشاہ عالی نژاد عالم مدار اقالیم شان زیادہ بر چہل سال رفتہ است ۔

شیخ ممدوح کتاب کے آخری باب میں بادشاہ کی فتوحات اور حکومت کے قواعد

---

۸۴ حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی ص ۱۹۴ بحوالہ فہرست مرتبہ براؤن ص ۲۵۵ ۔

۸۵ یہ سورہ آل عمران کی چھبیسویں (۲۶) آیت ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے :

اے اللہ! مالک تمام ملک کے، تو جس کو چاہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہے ملک چھین لیتا ہے ۔ تیرے اختیار میں ہے سب بھلائی، بلاشبہ تو ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے ۔

ضوابط وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ باتیں قلم بند کرنا چاہتے تھے، مگر اس کی فرصت نہ ملی، تاہم اس کے بعد کچھ اضافے ہوتے رہے ہیں۔

ذکرِ ملوک ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ البتہ اس کے قلمی نسخے حیدرآباد دکن، مدراس، علی گڑھ وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ علی گڑھ کا نسخہ بڑا قدیم ہے اور ۱۰۳۰ھ کا کتابت شدہ ہے یعنی مصنف کی زندگی میں اس کی کتابت ہو چکی تھی۔

سیاست

رسالہ نورانیہ سلطانیہ: یہ رسالہ تاریخی نوعیت کا نہیں بلکہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ اس کو ضبطِ تحریر میں لانے کا محرک شیخ کا یہ جذبہ صادقہ تھا کہ اس زمانے کا بادشاہ نورالدین جہاں گیر قواعدِ سلطنت، اس کے بنیادی احکام، اطوار و آداب اور ارکان و اسباب سے باخبر ہو سکے۔ چنانچہ فہرس التوالیف میں شیخ اس کی وجہ تالیف کے بارے میں فرماتے ہیں:

در بیان قواعد سلطنت و احکام ارکان و اسباب و آلات تحصیل آں و اوضاع و آداب ایں امر عظیم الشان مزین باسم سامی سلطان الوقت و ملک الزمان نملہ اللہ ملکہٗ۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ ۱۹۴۷ء سے قبل دہلی میں سید ظہیر الحسن صاحب کے کتب خانے واقع قرول باغ میں دیکھا تھا۔ اور کسی کتب خانے میں اس کا کوئی قلمی نسخہ نہیں ہے۔

تذکرہ و سیرت

سیرت و تذکرہ کے موضوع کے تحت شیخ کی مندرجہ ذیل سات تصانیف ہیں:

مدارج النبوۃ: **اس میں** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے مفصل حالات بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب بارہ سو (۱۲۰۰) سے زائد صفحات کو شامل ہے۔ اور ذیل کی ترتیب سے رسولِ اکرم کے سوانح اقدس کو پانچ حصوں میں منقسم کیا گیا ہے:

قسم اول : در ذکرِ فضائل و کمالات ، اخلاق و صفات۔
قسم دوم : در ذکرِ نسب و ولادت۔
قسم سوم : در ذکرِ وقائع سنوات از ابتدائے ہجرت تا وفات۔
قسم چہارم : در ذکر حدوث مرض و غسل و تکفین وغیرہ۔
قسم پنجم : در ذکر اولاد طاہرہ و ازواج مطہرہ۔

مدارج النبوۃ اکبری عہد میں لکھی گئی اور ان حالات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ، جن میں لوگوں کا روحانی تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات سے منقطع ہو رہا تھا اور احکام شریعت اور امورِ سنت سے رغبت باقی نہ رہی تھی۔ اس دور میں شیخ محدث نے ضروری خیال فرمایا کہ ملک کے عوام و خواص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے پاکیزہ واقعات سے روشناس کرایا جائے۔ یہ بات شیخ نے خود ہی بیان فرمائی ہے[۵۸۶]

مدارج النبوۃ ۱۲۶۹ھ میں فخر المطابع دہلی اور ۱۲۷۱ھ اور ۱۲۷۴ھ میں مظہر العجائب پریس سے طبع ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں ۱۸۶۷ء اور ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ سے دومرتبہ شائع ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے بھی انڈیا آفس لائبریری لندن ، جرمنی ، برٹش میوزیم لندن اور بانکی پور وغیرہ موجود ہیں۔ "منہاج النبوۃ" کے نام سے خواجہ عبدالمجید نے اس کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا جو چھپ چکا ہے۔

اخبار الاخیار : فارسی زبان میں علماء و مشائخِ ہند کا یہ مستند اور قابلِ اعتماد تذکرہ ہے اور اس موضوع میں اس کو بنیادی مآخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ برصغیر کے علمائے عظام اور مشائخ کرام کے واقعات و حالات لکھنے اور معلوم کرنے والا کوئی شخص اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ، اس کے مطالعہ سے شیخ کے وسعتِ معلومات کا پتا چلتا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ بزرگانِ

---

۵۸۶ ملاحظہ ہو مدارج النبوۃ ج ۱ ص ۳۔

دین سے انتہائی عقیدت کے باوجود تحقیق و تفحص کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ اخبار الاخیار میں شیخ نے اپنے بعض اسلاف اور خود اپنے کچھ ذاتی واقعات بھی اختصار کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ ان کی زندگی ہی میں اس کتاب کو اہل علم میں شہرت و قبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ جب یہ کتاب بادشاہِ ہند جہاں گیر کے سامنے آئی تو اس نے بہت تعریف کی اور شیخ کی محنت و کاوش کو خراجِ تحسین پیش کیا [۸۷]۔

یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ ۱۲۸۳ھ میں مطبع محمدی دہلی سے، ۱۳۰۹ھ اور ۱۳۳۲ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی — اس کے قلمی نسخے بھی بوڈلین، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، برٹش میوزیم لندن، کیمبرج یونیورسٹی اور بانکی پور وغیرہ کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔

احوال ائمہ اثنا عشر خلاصہ اولادِ سید البشر: یہ بارہ اماموں کے حالات پر ایک رسالہ ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

انوار الجلیہ فی احوال مشائخ الشاذلیہ: یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں ہے اور مشائخ سلسلۂ شاذلیہ کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے۔

زبدۃ الآثار: یہ عربی زبان میں ہے اور شیخ نور الدین ابوالحسن بن یوسف (۶۴۴ھ — ۷۱۳ھ) کی تصنیف "بہجۃ الاسرار" کی تلخیص ہے۔ بہجۃ الاسرار شیخ عبدالحق جیلانیؒ کے حالات میں ایک قدیم اور مستند کتاب ہے۔ زبدۃ الآثار ۱۳۰۴ھ میں بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا فارسی ترجمہ خود شیخ عبدالحق محدث نے دارا شکوہ کی فرمائش پر کیا تھا۔

مطالع الانوار البہیہ فی الحلیۃ النبویۃ: اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیۂ مبارک بیان کیا گیا ہے۔

۸۷؎ دیکھیے تزکِ جہاں گیری ص ۲۸۵۔

علمِ نحو

علمِ نحو سے متعلق شیخ کی دو کتابیں ہیں، جو یہ ہیں:

حاشیۃ الفوائد الضیائیہ: نحو کی مشہور کتاب شرح جامی پر حاشیہ ہے۔

افکار الصافیہ فی ترجمۃ کتاب الکافیہ: یہ کتاب انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں، جب کہ وہ صرف پندرہ یا سولہ سال کی عمر کے تھے، کافیہ کے بعض مباحث کے بارے میں لکھی تھی۔

ذاتی حالات سے متعلق

شیخ نے بعض ایسی کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں، جن میں اپنے ذاتی حالات درج کیے ہیں اور ساتھ ہی بعض ان بزرگانِ دین کے کوائف بیان کیے ہیں، جن سے ان کے ذاتی مراسم تھے یا ان سے عقیدت اور محبت کے تعلقات استوار تھے۔ اس قسم کی کتابیں چار ہیں، جن کے نام یہ ہیں:

اجازت الحدیث فی القدیم والحدیث: اس میں شیخ نے اپنی اسنادِ حدیث تحریر فرمائی ہیں۔

تالیف قلب الالیف بذکر فہرس التوالیف: یہ ان کی تصنیفات کی ایک فہرست ہے، جو انھوں نے خود مرتب کی تھی۔ آغازِ کتاب میں دہلی کے چند شعرا اور مصنفین کے حالات بھی مندرج ہیں۔ یہ کتاب سب سے پہلے مطبع عزیزی رام پور میں چھپی۔ پھر ۱۳۰۹ھ کو مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں حیدر آباد دکن سے سید شمس اللہ قادری نے "تذکرۂ مصنفین دہلیؒ" کے نام سے اس کا ابتدائی حصّہ شائع کیا تھا۔

زاد المتقین الی طریق الیقین: اس میں شیخ علی متقی، شیخ عبدالوہاب متقی، اور ان شیوخ و اساتذہ کے حالات درج ہیں، جن سے شیخ محدث نے مکہ مکرمہ میں استفاضہ و استفادہ کیا۔ علاوہ ازیں اپنے ذاتی واقعات بھی شاملِ کتاب ہیں۔ کتاب کے دیباچے میں شیخ نے وضاحت کی ہے کہ اس میں وہ واقعات بیان کیے

گئے ہیں جو دو سال قیام مکہ کے دوران میں ان کے مشاہدہ یا سماعت میں آئے۔ الفاظ یہ ہیں:

تا مدتِ دو سال و کسرے بحالتِ قیام مکہ معظمہ آنچہ دیدم یا شنیدم ضبط کردم۔

یہ کتاب شیخ نے مکہ معظمہ میں لکھنا شروع کی تھی مگر ۱۰۰۳ھ کو ہندوستان میں آ کر مکمل کی۔

وصیت نامہ: اس میں شیخ ممدوح نے اپنی وصیتیں درج فرمائی ہیں۔

خطبات

فصول الخطب لنیل اعالی الرتب: اس میں شیخ نے اپنے خطبات جمع کیے تھے۔ غالباً خطبات کا یہ قیمتی مجموعہ اب نایاب ہے۔

مکاتیب

کتاب المکاتیب: یہ شیخ کے ان اڑسٹھ ۶۸ مکتوبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے بعض اہم اور ضروری مسائل کے بارے میں خواجہ باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ابوالمعالی، شیخ عبداللہ نیازی، نواب مرتضیٰ خاں، عبدالرحیم خان خاناں اور شیخ فرید کے نام تحریر کیے۔ ان کے علاوہ اس میں شیخ ابوالخیر اور فیضی وغیرہ کے نام بھی بعض مکتوبات درج ہیں۔ مکتوبات میں نہایت تفصل اور شرح و بسط کے ساتھ بعض اہم امور کو مدارِ بحث ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ مجموعہ مکاتیب ۱۲۹۷ھ کو مطبع مجتبائی دہلی میں چھپا تھا۔ پھر ۱۳۳۲ھ کو اسی مطبع سے اخبار الاخیار کے حاشیہ پر شائع ہوا۔

صحیفۃ المودۃ: یہ شیخ کے دوستوں کے نام بصورتِ مثنوی مکتوبات کا ایک مجموعہ ہے۔ غالباً اس مثنوی کا اب کوئی نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔

شعر و شاعری

شیخ عبدالحق محدث دہلوی بہت اچھے شاعر بھی تھے اور حقی تخلص کرتے تھے۔ کہنا چاہیے کہ شعر و سخن کا یہ ذوق انھیں وراثت میں ملا تھا۔ ان کے والد شیخ سیف الدین سیفی، چچا شیخ رزق اللہ مشتاقی اور دادا شیخ فیروز سبھی شاعرانہ ذوق رکھتے تھے اور

شیخ موصوف کے خاندان میں یہ ذوق شیخ فیروز کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ شیخ عبدالحق اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

معنی حلویت و شعر و ظرافت در خانۂ ما از وے پیدا شد۔

ہمارے خاندان میں لطافتِ کلام، شعر و شاعری اور حلاوت و ظرافت انہی (یعنی شیخ فیروز) کے عہد سے پیدا ہوئی۔

شیخ محدث کی رغبت شعر کے متعلق معارج الولایت کے مصنف رقم طراز ہیں:

در شعر نیز رغبتے تمام داشت ..... وحقی تخلص خود را نہادے، چنانچہ در کتب و رسائل ایشاں اشعار ایشاں مکتوب ست۔

یعنی (شیخ عبدالحق محدث) شعر گوئی میں کامل رغبت رکھتے تھے اور حقی تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی کتب و رسائل میں ان کے اشعار درج ہیں۔

نظام الدین بخشی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

زبان شعر دارد
شیخ عبدالحق شاعرانہ اسلوبِ کلام کے مالک تھے۔

شیخ کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

حقی تو زِ تاریخ و حکایات گوئی — در راہِ تتبع روایات پیوئی
در زاویۂ فقر نشستی، کارے — جز ذکرِ خدا، نفی و اثبات مجوئی

حقی نہ پئے قصہ و افسانہ شدی — چوں مردم روزگار فرزانہ شدی
درویش، ترا ز ذکرِ شاہاں چہ غرض — مفتونِ سخن گشتی و دیوانہ شدی

مقصودِ اہلِ ذوق ز ذکرِ گذشتگان — تنبیہ عبرت است چہ مسکیں چہ بادشاہ

حقا بیانِ شوق بپایاں نمی رسد — کوتاہ ساز، قصۂ دور و دراز را

دوش از کثرتِ اغیار نجاتم دادند — رہ بسوئے حرم وحدتِ ذاتم دادند
حقی از گوشۂ دہلی نہ نہم پا بیروں — خود گرفتیم کہ ملکِ گجراتم دادند

ہر رخش زلفِ پُر شکن ببیند — سنبل افتادہ بر سمن ببیند
در گرفت از رخش بگل آتش — آتش افتادہ در چمن ببیند
تنِ او در درونِ پیراہن — ہمچو جاں در درونِ تن ببیند

چوں من میرم چہ حاصل گر لبت آرامِ جاں باشد
من از حسرت بمیرم، او بکامِ دیگراں باشد
بہر جورے کہ آں مہ می کند، از جا مرو حقی
کہ بد خوئے مرا شاید کہ مقصودِ امتحاں باشد

عجب ز اطوارِ خود پسند انست — طورِ ما طورِ دردمند انست
ہیچ چیزے چو دردمندی نیست — کہ در و بوئے خود پسندی نیست

صد شکر کہ از تشنگی غم رستم — چو قطرہ بدریائے کرم پیوستم
بر کشتی توفیق ازل بنشستم — وز زمزمِ قدس چہرۂ دل شستم

ایں نامہ کہ پایۂ ترقی آمد — شائستہ اقبال و ترقی آمد
جنبیدن خامہ در وقتِ تسویدِ حروف — در دست، دل شکستہ حقی آمد

شبِ فراق کہ از ہجرِ یار می گریم — بہانہ درد کنم، زار زار می گریم
بہر جا کہ بود ماتمے روم آنجا — بدیں بہانہ ز ہجرِ نگار می گریم

قاتلش در جلوہ آمد طاقتم برباد رفت — نرگسش در خواب رفت و فتنہ را بیدار کرد
حالِ حقی بر تو کے ظاہر شود زیرا کہ دے — حالتے دارد کہ نتواند بخود اظہار کرد

اے آنکہ ترا طالع مسعود بود — دانی کہ مرا از تو چہ مقصود بود
یک فاتحہ از بہرِ منِ خستہ بخواں — تا عاقبتِ کارِ تو محمود بود

در خواب ہمیشہ با خیالِ تو خوشم — در بیدارم بخط و خالِ تو خوشم
القصہ چہ در خواب چہ در بیداری — اے مردم دیدہ با جمالِ تو خوشم

وفات

شیخ عبدالحق نے چورانوے (۹۴) سال عمر پائی اور آخر دم تک تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ زندگی کے آخری دور میں بھی جسمانی اور روحانی طور پر اسی طرح صحت مند و توانا تھے، جس طرح کہ ابتدائی دور میں تھے۔ نہ کبھی درس و مطالعہ میں فرق آیا، نہ تدریس کے سلسلے کم ہوئے، نہ تحقیق و کاوش میں کمی واقع ہوئی، نہ قلم و قرطاس کی صحبتیں ماند پڑیں اور نہ وظائف و اوراد اور روزانہ کے معمولات میں خلل پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی گوناگوں علمی ضوفشانیوں سے سرزمین برصغیر میں روشنی کی ایک وسیع فضا پیدا کر کے ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو وفات پائی اور دہلی میں مدفون ہوئے۔ وصیت کے مطابق نمازِ جنازہ ان کے جلیل القدر صاحبزادے شیخ نورالحق نے پڑھائی۔

اولاد

شیخ عبدالحق محدث کے تین بیٹے تھے۔ شیخ نورالحق، شیخ علی محمد اور شیخ محمد ہاشم۔ یہ تینوں اصحاب علم و فضل تھے، مگر شیخ نورالحق ان میں سب سے فائق اور بلند مرتبے کے مالک تھے۔ ان کے تفصیلی حالات۔ ان شاء اللہ کتاب۔ کے اصل مقام پر درج ہوں گے۔ یہاں اختصار کے ساتھ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ شیخ محدث اپنے

اس فرزند کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے لیے ایک واقعہ لائقِ تذکرہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ میر سید طیّب بلگرامی (جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے) ایک عالم و فاضل اور زاہد و متورع بزرگ تھے۔ "سبع سنابل" کے مصنف میر سید عبدالواحد بلگرامی کے فرزند اور جانشین تھے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کے اوصاف و کمالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

وے ذاتِ مقدسی کہ اگر ثقلین باو ناز کنند می زیبد و اگر زمین و زمان برخود بالند می شاید [۵۸۸]

یعنی وہ ایسی پاک باز شخصیت کے مالک ہیں کہ اگر دونوں جہان ان پر ناز کریں تو صحیح ہوگا اور اگر زمین اور اس پر بسنے والے ان پر خوش ہوں تو بجا ہوگا۔

وہ ایک فرشتہ صفت بزرگ تھے۔ آزاد بلگرامی ان کی تعریف میں سید کرم اللہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

اگر کسے خواہد ملک را بر روئے زمین بہ بیند میر سید طیّب را مشاہدہ کند [۵۸۹]

اگر کوئی شخص زمین پر فرشتہ دیکھنا چاہتا ہے تو میر سید طیّب کو دیکھ لے۔

میر سید طیّب تدریس و تصنیف میں ماہر تھے۔ تفسیر بیضاوی اور ہدایہ پر انھوں نے عالمانہ حواشی تحریر کیے ہیں۔ میر موصوف اور شیخ عبدالحق دہلوی کے درمیان بڑے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے، جس کا تذکرہ میر غلام علی آزاد بلگرامی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

درمیان شیخ عبدالحق دہلوی قدس سرہٗ و حضرت میر، محبّتے و مودّتے عظیم بود۔ شیخ عبدالحق بہ رعایت بزرگی اورا شیخ طیّب می گفت [۵۹۰]

شیخ عبدالحق اور حضرت میر کے درمیان انتہائی محبت و مودت کے مراسم قائم تھے۔

---

۵۸۸ مآثر الکرام، ص ۴۵ ۵۸۹ ایضاً

۵۹۰ ایضاً، ص ۴۶

شیخ عبدالحق ان کی بزرگی کی وجہ سے انھیں شیخ طیّب کہا کرتے تھے۔

میر طیّب کی فضیلتِ علم اور شیخ محدث پر ان کے اثر کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ ایک مرتبہ اپنے زمانۂ کبر سنی میں شیخ محدث کسی کتاب کا درس دے رہے تھے کہ ایک مقام پر رُک گئے اور فرمانے لگے، اگر میر سیّد طیّب اس وقت موجود ہوتے تو اس مشکل مسئلہ کو آسانی سے حل کر دیتے۔ حسنِ اتفاق سے میر سید اسی وقت تشریف لے آئے۔ شیخ بہت خوش ہوئے اور خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد وہ مشکل ان کے سامنے بیان کی۔ میر ممدوح نے کتاب ہاتھ میں پکڑی اور تھوڑے سے تامل کے بعد متعلقہ مقام کی عبارت کچھ اس انداز سے پڑھی کہ مسئلہ خود بخود حل ہو گیا اور مشکل رفع ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ نورالحق آگرہ میں مقیم تھے اور منصبِ قضا پر فائز تھے۔ شیخ عبدالحق نے میر صاحب سے دریافت فرمایا "کس راستے سے آئے ہیں؟" انھوں نے بتایا "براستہ آگرہ آیا ہوں"۔ فرمایا "راستے میں نورالحق سے ملاقات ہوئی ہو گی"۔ میر صاحب نے جواب دیا "سفر میں کچھ ایسے مواقع پیش آئے کہ ان سے مل نہ سکا"۔ شیخ نے فرمایا:

ظاہراً ازیں کہ او مرتکبِ قضا شد، اعراض بہ عمل آمد[۹۱]

یعنی بظاہر نہ ملنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ محکمہ قضا پر متعین ہے۔

پھر شیخ نورالحق کی ان الفاظ میں تعریف کی:

اگرچہ پسرِ من است اما بجائے پدر، اگرچہ شاگردِ من است اما بجائے استاد، اگرچہ مریدِ من است اما بجائے پیر می دانم[۹۲]

اگرچہ وہ میرا بیٹا ہے لیکن باپ کے بجائے ہے۔ اگرچہ میرا شاگرد ہے لیکن استاد کے بجائے ہے۔ اگرچہ میرا مرید ہے لیکن میں اسے پیر کے بجائے سمجھتا ہوں۔

میر سیّد طیّب نے شیخ کی یہ بات پوری توجہ سے سنی اور پھر اس طرح اُٹھے اور

۹۱ھ مآثر الکرام، ص ۴۶   ۹۲ھ ایضاً

باہر نکلے جیسے کسی ضرورت سے جاتے ہیں۔ مگر وہ اسی وقت آگرہ کے لیے روانہ ہوگئے اور شیخ نور الحق سے ملاقات کر کے واپس دہلی آئے۔ شیخ کو معلوم ہوا تو ان کی اس اخلاقی رفعت سے بہت متاثر ہوئے اور میر صاحب سے انتہائی معذرت کی۔

معذرتہا بر زبان آورد ۹۳ھ

بڑے ہی معذرت خواہانہ الفاظ استعمال کیے۔

شیخ عبد الحق دہلوی کے دوسرے فرزند شیخ علی محمد بخاری دہلوی تھے، جو اپنے عصر کے فضلا میں سے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور اپنے والد ماجد سے کتب درسیہ کی تحصیل کی، شیخ علی محمد تصنیف و تالیف کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور تین کتابوں کے مصنف تھے، جن کے نام یہ ہیں:

خزائن الدُّرر: یہ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کی لغت ہے۔

رسالہ احوال پنج پیران چشت: یہ خواجہ معین الدین چشتی، قطب صاحب بابا فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیا اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے حالات پر مشتمل ہے۔

نجات المریدین: اس میں شیخ عبد القادر جیلانی کے احوال و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

تیسرے فرزند شیخ محمد ہاشم دہلوی تھے، جو عالم باعمل اور عبدِ صالح تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشو و نما پائی اور اپنے عالی مرتبت والد شیخ عبد الحق دہلوی سے علم حاصل کیا، طویل عرصہ تک ان سے منسلک رہے اور اس قدر استفادہ کیا کہ حدیث اور فقہ کے ماہر علما میں ان کا شمار ہونے لگا۔

شیخ عبد الحق محدث کے یہ تینوں فرزند گیارھویں صدی ہجری کے معروف ہندی علمائے دین میں سے تھے۔

۹۳ھ مآثر الکرام، ص ۲۰۶

مراجع و مصادر

فقہائے ہند جلد چہارم (حصہ اوّل) کی تصنیف میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

۱۔ آئین اکبری: ابوالفضل ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ ۔ ۱۸۹۳ء

۲۔ ابجد العلوم: نواب صدیق حسن خاں ۔ مطبع صدیقیہ، بھوپال ۔ ۱۲۹۵ھ

۳۔ اتحاف النبلا: نواب صدیق صدیق خاں ۔ مطبع نظامی، کان پور ۔ ۱۲۸۸ھ

۴۔ اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ مطبع مجتبائی، دہلی ۔ ۱۳۳۲ھ

۵۔ اذکار ابرار، ترجمہ گلزار ابرار: تصنیف محمد غوثی شطاری مانڈوی ۔ ترجمہ فضل احمد جیوری ۔ مطبع مفید عام، آگرہ ۔ ۱۳۲۶ھ

۶۔ اشعۃ اللمعات، شرح مشکوٰۃ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ ۔

۷۔ الاعلام: خیرالدین زرکلی، طبع ثانی

۸۔ انشائے ابوالفضل: مطبوعہ لکھنؤ ۔ ۱۲۶۸ھ

۹۔ انوار العارفین: حافظ محمد حسین مرادآبادی ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ ۔ ۱۸۷۶ء

۱۰۔ ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون: اسماعیل پاشا ۔ مطبع بہیہ، استنبول ۔ ۱۹۴۵ء/۱۳۶۴ھ

۱۱۔ بادشاہ نامہ: عبدالحمید لاہوری ۔ تصحیح عبدالرحمٰن ۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ ۔ ۱۸۶۷ء ۔ ۱۸۷۲ء

۱۲۔ برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ: محمد اسحاق بھٹی ۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۔ ۱۹۷۳ء

۱۳۔ بزم تیموریہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۔ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ۔

۱۴۔ تاریخ برہان مآثر: سید علی طباطبا ۔ ناشر مجلس مخطوطات فارسیہ ۔ حیدرآباد، دکن مطبع جامعہ، دہلی ۔ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء

۱۵۔ تاریخ تحفۃ الکرام ۔ جلد اوّل، دوم، سوم ۔ مطبع حسینی اثنا عشری، محلہ فراش خانہ وزیر گنج، لاہور ۔ ۱۳۰۴ھ و مطبع ناصری

۱۶۔ تاریخ شیراز ہند جون پور: سید اقبال حسین ۔ ادارہ شیراز ہند پبلیشنگ ہاؤس

جون پور (ہندوستان)، ۱۹۶۳ء

۱۷۔ تاریخ طاہری: سید طاہر محمد نسیانی ٹھٹھوی۔ سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد۔ سندھ ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء

۱۸۔ تاریخ فرشتہ: محمد قاسم فرشتہ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۳۳ء

۱۹۔ تاریخ کشمیر اعظمی: خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔ ناشر غلام محمد، نور محمد تاجران کتب سری نگر۔ ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء

۲۰۔ تاریخ معصومی: میر محمد معصوم بھکری۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۲۱۔ تحفۃ الکرام: میر علی شیر قانع۔ سندھی ادبی بورڈ۔ کراچی۔ ۱۹۵۹ء

۲۲۔ تذکرہ: مولانا ابوالکلام آزاد۔ مکتبۂ احباب، لاہور

۲۳۔ تذکرۃ الابرار والاشرار: حضرت اخون درویزہ۔ ادارہ اشاعت سرحد قصہ خوانی بازار، پشاور

۲۴۔ تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی: سید احمد قادری۔ ناشر، شاہ بک ڈپو۔ پٹنہ (ہندوستان)

۲۵۔ تذکرہ علمائے ہند: مولوی رحمان علی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۲۶۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ): محمد ایوب قادری، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۱ء

۲۷۔ تزکِ جہاں گیری: مطبع نامی منشی نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۹۱۴ء

۲۸۔ تعلیمات مجددیہ: ملک حسن علی جامعی۔ انجمن اشاعت التوحید والسنۃ۔ شرق پور۔ ۱۹۶۵ء

۲۹۔ تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار: نواب صدیق حسن خاں۔ مطبع شاہ جہانی، بھوپال ۱۲۹۸ھ

۳۰۔ حدائق الحنفیہ: مولوی فقیر محمد جہلمی۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء

۳۱۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی: پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ ندوۃ المصنفین، دہلی۔ ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۳ء

۳۲۔ خزینۃ الاصفیا: مفتی غلام سرور لاہوری۔ مطبع نامی گرامی سراج پنڈت بیجنا تھ۔ الموسوم بہ ثمر ہند، لکھنؤ۔ ۱۲۹۰

۳۳۔ خلاصۃ التواریخ: لالہ سبحان رائے بٹالوی، بہ تصحیح ظفر حسن۔ مطبع جی اینڈ سنز،

دہلی - ۱۹۱۸ء

۳۴- رودِ کوثر : ڈاکٹر شیخ محمد اکرام - ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور - ۱۹۷۵ء

۳۵- ذخیرۃ الخوانین : شیخ فرید بھکری - مقدمہ و تصحیح، ڈاکٹر سید معین الحق - پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی

۳۶- زبدۃ المقامات : خواجہ محمد ہاشم کشمی، مطبع نول کشور، کان پور - طبع اوّل ۱۸۹۰ء

۳۷- سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان : غلام علی آزاد بلگرامی - طبع بمبئی ۱۳۰۳ھ

۳۸- سفینۃ الاولیا : دارا شکوہ - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۸۸۴ء

۳۹- سنن ابی داؤد : امام سلیمان بن اشعث ابی داؤد سجستانی - اصح المطابع و کارخانہ تجارت، کراچی

۴۰- سیر المتاخرین : غلام حسین خاں طباطبائی - نول کشور، لکھنؤ -

۴۱- شرح سفر السعادہ : شیخ عبد الحق محدث دہلوی - نول کشور، لکھنؤ - ۱۹۰۳ء

۴۲- طبقات اکبری : نظام الدین ہروی - طابع نول کشور، مطبع گرامی قدر اودھ اخبار، لکھنؤ - ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء

۴۳- طرب الاماثل بتراجم الافاضل : مولانا ابو الحسنات عبد الحی حنفی لکھنوی - مطبع یوسفی لکھنؤ - ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء

۴۴- عالمگیر نامہ : منشی محمد کاظم بن محمد امین - کالج پریس، کلکتہ - ۱۸۶۸ء

۴۵- عمل صالح الموسوم بہ شاہجہان نامہ : محمد صالح کنبوہ لاہوری - ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ -

۴۶- عون المعبود شرح سنن ابی داؤد : علامہ شمس الحق ڈھیانوی - مطبع انصاری، دہلی -

۴۷- عہدِ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے فرامین و اسناد : مطبوعہ ہندوستان - ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء

۴۸- فرحت الناظرین (شخصیات) : محمد اسلم پسروری - ترجمہ و ترتیب - محمد ایوب قادری اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی - ۱۹۷۲ء

۴۹- الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ مع التعلیقات البہیہ : مولانا ابو الحسنات عبد الحی حنفی لکھنوی - طبع اوّل، مصر ۱۳۲۴ھ

۵۰- قصار الارب من ذکر علماء النحو والادب : ذو الفقار احمد - مطبع فیض منبع مفید عام، آگرہ - ۱۳۱۶ھ

۵۱- کشف الظنون - جلد اول ثانی : حاجی خلیفہ - مطبع بہیہ استنبول - ۱۹۴۱ء/۱۳۶۰ھ
۵۲- مآثر الامرا - جلد اول، دوم، سوم : نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں - ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ - ۱۸۸۸ء — ۱۸۹۰ء
۵۳- مآثر رحیمی - جلد اول، دوم، سوم : ملا عبدالقادر نہاوندی - ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ - ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء، ۱۹۳۱ء
۵۴- مآثر عالم گیری : محمد ساقی الملقب بہ مستعد خاں - ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ -
۵۵- مآثر الکرام، جلد اول : غلام علی آزاد بلگرامی - مکتبہ احیاء العلوم الشرقیہ - لاہور - ۱۹۷۱ء
۵۶- مرآت احمدی : مرزا محمد حسن الملقب بہ علی محمد خاں بہادر - مطبوعہ کلکتہ - ۱۹۲۷ء
۵۷- مرآت العالم : بختاور خاں (قلمی نسخہ) - پنجاب یونیورسٹی، لائبریری - لاہور
۵۸- معجم المؤلفین : عمر رضا کحالہ - المکتبۃ العربیہ، دمشق - مطبعۃ الترقی، دمشق - ۱۹۵۷ء
۵۹- مفتاح التواریخ : منشی دانشور - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۲۸۴ھ
۶۰- منتخب التواریخ : عبدالقادر بدایونی - مطبع نول کشور، لکھنؤ - ۱۲۸۴ھ — و ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ - ۱۸۶۸ء
۶۱- منتخب اللباب - جلد اول، دوم : محمد ہاشم المخاطب بہ خافی خاں - ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال کلکتہ - ۱۸۶۹ء
۶۲- نجات الرشید : عبدالقادر بدایونی - مقدمہ و حواشی، ڈاکٹر سید معین الحق - ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور - ۱۹۷۲ء
۶۳- نزہۃ الخواطر، جلد پنجم : علامہ عبدالحی حسنی لکھنوی - دائرۃ المعارف العثمانیہ - حیدرآباد، دکن ۱۳۷۵ھ / ۱۹۵۵ء
۶۴- النور السافر فی اخبار القرن العاشر : عبدالقادر بن عبداللہ عیدروس - المکتبۃ العربیہ بغداد - مطبعۃ الفرات، بغداد - ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء
۶۵- ہدیۃ العارفین فی اسماء المؤلفین و آثار المصنفین : اسماعیل پاشا بغدادی مطبع بہیہ استنبول ۱۹۵۱ء / ۱۹۵۵ء
۶۶- ہفت اقلیم، جلد اول - دوم - سوم : امین احمد رازی - تصحیح و تعلیق، جواد فاضل مطبوعہ تہران -
۶۷- الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی : محمد بن یحیی المدعو بہ محسن تمیمی ثم بکری - طبع ہند -